اے ری میں تو پریم دیوانی

سعدیہ عزیز آفریدی

پیش لفظ

محبت کرنے سے محبت لکھنا مشکل ہے اور آپ سب قارئین کی محبت ہے جو مجھے اس مشکل راہ گزر پر چلائے جا رہی ہے۔ ایک لگن ہے جو مجھ سے کہتی ہے کہیں نہیں رکنا کہیں پڑاؤ نہیں ڈالنا میں قدم سے قدم بڑھاتے سفر طے کرتے ہوئے اس محبت کے صندلی احساس کو زندہ رکھنا ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم خزاں میں گلستان میں بہار کی آبیاری کریں محبت ایسا جذبہ ہے جو دلوں میں ہے زندگی میں ہے مگر ہم اسے جیتے ہوئے ڈرتے ہیں کیوں کے ہمیں لگتا ہے اس محبت کے لیے ہمارے جسموں میں طاقت نہیں جو ہم اسے سمیٹ سکیں اسے پا سکیں اسے جیتے ہوئے اپنی ذات کی نفی کر کے کسی اور کی ذات کا اقرار بن سکیں مگر یہ محبت ہے خود بخود دل میں الہام بن کر اترتی ہے کپکپاہٹ بن کر دل میں خون میں گردش کرتی ہے اور بہت تیزی سے آپ کو بدلتی جاتی ہے اگر محبت آپ کا دل نہیں بدل سکتی تو وہ محبت نہیں محض محبت کا واہمہ ہے، محبت ہمیں رشتے بنانا، ان رشتوں کو مضبوطی سے باندھے رکھ کر زندگی کو بہتر طریقے سے جینے کا ہنر دیتی ہے یہ محبت ہی ہے جو دعا مانگنا سکھاتی ہے بندہ کو خدا تک کے راستے سجھاتی ہے اور مجھے یہی محبت زندہ رکھتی ہے جو آج کے مشینی دور پہ میں کہیں سمٹ کر معدوم ذرہ بن گئی ہے یہ محبت جو ہماری ضرورتوں ہماری مصلحتوں ہمارے دلوں کی سختی میں کسی میلے میں کھوئے ہوئے بچے کی طرح بلک رہی ہے مگر ہم اسے آسائشات میں لگژری میں پانے کی کوشش کرتے ہیں اور میرا ماننا ہے جب تک دنیا میں ایک انسان بھی محبت کا طالب ہے میں محبت کو لکھتی رہوں گی اور جب نہیں لکھ پاؤں گی زندگی کے خاتمے پر تو یہ میری لکھی ہوئی محبتیں مجھے لوگوں کے دلوں میں ایک خوش گوار یاد کی طرح زندہ رکھے گی یہ محبت یہ میرا زندگی میں واحد کار ہنر ہے واحد جزا ہے جو میں آپ سب کی محبتوں کے ضمرے میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی ہمیشہ دعاؤں میں محبت زندہ رکھیے کبھی ناکام نہیں پلٹ کر آئیں گی۔

آخر میں، میں علم و عرفان پبلشرز خاص طور پر جناب گل فراز احمد صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنھوں نے میری گذشتہ کتب کی طرح اس کتاب کی بھی انتہائی خوبصورت اور معیاری انداز میں اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔

بہت محبت کے ساتھ

سعدیہ عزیز آفریدی

اے ری میں تو پریم دیوانی

وہ پاپا کے ساتھ بیٹھی ہوئی کاغذ پہ آڑھی ترچھی لکیریں بنا رہی تھی پاپا اس وقت آفس میں نہیں تھے اس لیے وہ بیٹھی ہوئی بور ہو رہی تھی آفس آنے کا پاپا کا تازہ حکم تھا ورنہ وہ اس اکتاہٹ کے چکر میں ہرگز ہرگز پڑنا نہیں چاہتی تھی۔

”کاش اس وقت کہیں سے للی آ جائے......“ ہر وقت ہر لمحہ کی ساتھی کو اس نے اس تنہائی میں بھی پکارا تھا اور ،،لمحہ قبولیت کے وہ کھلا کھلاتی ہوئی اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی ”گھر گئی تھی پتا چلا آج آرٹ کی دنیا کی رابن ہڈ بنیاء گیری کر رہی ہے......“

”بکواس نہ کرو للی میرے پاپا کا کام آرٹ اور بزنس کا ایک خوبصورت امتزاج ہے تو انہیں بنیاء نہیں کہہ سکتی۔“

”اچھا کیا بات ہے تیری لائق فائق بیٹیاں ایسی ہوتی ہیں میری طرح تھوڑی کے سب سے بڑی تنقید نگاری کرتی رہتی میں اپنے پاپا کی......“ وہ خود ہی اپنے عمل پر شرمندہ ہو رہی تھی اور سمرہ سے مسکرا کر بولی تھی ”ہاں یہ تو ہے انکل کے ساتھ تو بہت زیادہ زیادتی کر جاتی ہے حالانکہ وہ اتنی محبت کرتے ہیں تجھ سے......“

”محبت......اوئے ہوئے آج پتا چلے گا بی بی سمرہ کو یہ دیکھ سلپ دیکھی ہے پے منٹ کی......“

”45 ہزار......“ اس نے تیزی سے سلپ چھین کر پڑھی اور تھوڑی پریشان سی نظر آنے لگی اور للی نے اس کی طرف دیکھ کر آہستگی سے طنزیہ کہا ”ہاں جب ہم رابن ہڈ بن رہے ہوتے ہیں تو ہمیں نہیں پتا چلتا کتنی محنت سے کمایا ہوا پیسہ کتنی آسانی سے بلاوجہ کے کاموں پر لٹا رہے ہیں۔“

”بلاوجہ کے کام تو نہ کہہ للی کی بچی وہ کتنے بوڑھے سے آرٹسٹ تھے کتنی مشکل سے انہیں اس آرٹ ایگزیبیشن میں جگہ ملی تھی اور میں چاہتی تھی انہیں کسی حد تک ریلیف ملے بس ان کی پی آر نہیں تھی ورنہ ان کا آرٹ دل کو چھونے والا تھا کہ نہیں......“ وہ اس سے ہی سوالیہ ہو کر پوچھنے لگی اور للی نے اثبات میں سر ہلایا......”ہاں تھا تو وہاں کھڑے بہت سے پی آر اور پرشئل آرٹ ایگزیبیشن میں شامل لوگوں میں کلاسک تھی ان کی تصویر......“

”پھر تو پاپا کو میں مطمئن کر ہی لوں گی......“ اس نے اطمینان کی گہری سانس کھینچی اور للی ہنس پڑی ”عجیب لڑکی ہے صرف میرے مطمئن ہو جانے کو سب کچھ سمجھتی ہے......“

”ہاں کیوں کہ تو بھی پاپا کی طرح وکھری لڑکی ہے اگر تجھے مطمئن کر لیتی ہوں تو مجھے لگتا ہے پاپا کو بھی میں

اچھی طرح اطمینان دلا سکتی ہوں کہ میں نے جو کہا وہ غلط نہیں تھا.....“

”تو اس میں بتانے جیسی کیا بات ہے تمہارے پاپا کو آنکھ بند کر کے تم پر اعتبار ہے بیٹا کہ تم کچھ غلط نہیں کر سکتیں.....“ عمیر احمد کے لہجے میں یقین بول رہا تھا

تبھی لُنی نے شرارت سے چیک سلپ اُن کے سامنے کی ”اسے دیکھ کر بھی آپ اس سے کوئی سوال نہیں پوچھیں گے انکل کہ اتنی بڑی رقم کہاں ضائع کی.....“

عمیر احمد بے ساختہ ہنس پڑے تھے ”شرارتی لڑکی میری دونوں بیٹیوں کو غیر ضروری فضول خرچی کی عادت نہیں اس لیے میرا یہ یقین اگر ہے تو غلط نہیں ہے آپ دونوں پر..... رہی دولت تو یہ آنی جانی چیز ہے اس لیے اگر یہ ٹھیک جگہ خرچ ہو رہی ہے تو مجھے اس پر کوئی ایشو نہیں میرا جو کچھ ہے سب سمرہ کا ہی تو ہے.....“

”ہم گڈ پاپا.....“ سمرہ نے پاپا کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور پاپا مسکرا کر آرٹ گیلری کی پے منٹ او کے کروانے لگے اور لُنی نے پھر سے شرارت سے دونوں کے پیار پر ہنس کر کہا ”انکل ڈیئر اب وقت جانے آپ نے کس موڈ میں دولت پر یہ درویشانہ کمنٹ دے دیا مگر یاد رکھیے یہی روش چل نکلی تو آپ کا سارا بینک بیلنس دنیا سے اُڑ جانے والی تتلی کی طرح اُڑنچھو ہو جائے گا پھر آپ ہوں گے اور دیوانِ غالب“

”کومت نائی گرل میرا جو کچھ ہے سب اسی کا تو ہے یہ سارا گولڈن ایمپائر اسی کے لیے تو ہے یہ دنیا میں نے اپنی اس لاڈلی کے لیے ہی تو تراشی ہے تا کہ اسے کوئی دقت نہ ہو، نہ میری زندگی میں نہ میرے بعد۔“

”پاپا آپ نے پھر وہی کہا آپ نے پرامس کیا تھا نا کہ پھر کبھی بچھڑنے کی بات نہیں کریں گے۔“ وہ یک دم خفا ہو گئی تو پاپا نے دلار سے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چوم لی پھر رندھے گلے سے بولے۔

”تم کچھ بھی کہو سمرہ یہ تو طے ہے نا کہ ہم نے کبھی نہ کبھی بچھڑنا تو ہے کوئی لمحہ ہماری تمہاری زندگی میں ایسا آئے گا ہی جب تمہارے کہنے پر بھی میں زندگی اور سانس کا رشتہ برقرار نہیں رکھ سکوں گا، سو سمرہ میں تو بس اسی لمحہ کا کہتا ہوں تا کہ تم پہلے سے تیار رہو، میں نے اپنا آپ مکمل تم پر اتار دیا ہے اپنی قابلیت نشست و برخاست تمہیں پروقاریت اپنے دل کی تمام محبت یہاں تک کہ تمہیں دل کر دیا، اس لیے سمرہ مجھے اتنا اطمینان تو ہے کہ یہ دنیا زیادہ عرصے میری کمی محسوس نہ کرے گی یہ سب تمہیں میری آنکھوں میں میرے لہجے میں یاد رکھیں گے اور تمہارے عکس میں تا دیر مجھے سراہتے رہیں گے۔“ وہ سنے گئی پھر بے سبب رو پڑی پاپا کے لہجے سے ایسے بچھڑنے کی باتیں سن کر وہ ہمیشہ ایسے ہی دھواں دھار رو پڑتی تھی، اسے خود پر اختیار ہی نہیں رہتا تھا ساری دنیا میں صرف پاپا ہی تو اس کا کل اثاثہ تھے اس نے آنکھیں رگڑ کر پھر سے پاپا کو دیکھا تو لُنی گنگنائی۔

”خفگی میں بھسم مت کر دینا ایک اکلوتے تو انکل ہیں میری۔“ اس نے جھنجھلا کے سامنے دھری فائل لُنی کے کاندھے پر دے ماری پاپا کا اس کی جھنجھلاہٹ پر ایک قہقہہ گونجا لیکن ابھی اس کے قہقہے کی گونج بھی کم نہ ہوئی تھی کہ انٹر کام کی بزر بج اٹھا، ریسیور اٹھایا تو پتا چلا کہ ان کا پی اے میٹنگ روم میں پہنچنے کی استدعا کر رہا تھا۔ پاپا نے سن کر کہا۔

”ہم آتے ہیں مسٹر سجاد۔“ ریسیور رکھ کر پاپا نے دو تین فائلیں اٹھائیں پھر بولے۔

”ارکان آ چکے ہیں وہیں سب سے تمہارا تعارف بھی ہو جائے گا اور گارمنٹ

کے اس نئے پراجیکٹ پر بات کی۔" وہ کینوس کا بیگ سنبھالتی اٹھنے لگی تو للی منمنائی۔

"آپ دونوں کے بعد میں کیا کروں گی ڈھنڈار آفس میں۔"

"یہ ڈھنڈار آفس ہے، ہوش کے ناخن لو۔" نگاہ ترچھی کر کے سمرہ نے اپنے پاپا کے دفتر کی خوبصورتی و آرائش کا دفاع کیا تو وہ مسکرائی پھر بولی۔

"میری نظر میں محل بھی اگر انسان نما چیز سے خالی ہو تو وہ کھنڈر دکھائی دیتے ہیں اور چھوٹے سے گھر جیتے لوگوں سے بھرے ہوں تو محل لگتے ہیں، کیا سمجھیں سمرہ ڈیئر۔"

"یہی کہ تم سے جیتنا کسی بھی کام میں ناممکن ہے۔"

"یعنی مانتی ہو نا ہماری اپروچ کو۔"

"کیوں نہیں، سمرہ کیا، تمہارا انکل بھی پوری طرح تمہاری اس اپروچ کو داد دیتا ہے للی یو آر تو ویری جینئس بائی گاڈ، تم بالکل میری طرح سوچنے لگی ہو۔" انہوں نے اسے سراہا تو وہ کالر اکڑانے لگی سمرہ نے اس کی اکڑ دیکھ کر جل کے کہا۔

"تمہارا بیٹھ کر ان کرسیوں اور در و دیوار پر اپنی ذہانت ظاہر کرنے سے بہتر ہے تم ہمارے ساتھ چلو۔"

"کیا مطلب یہی کہ میٹنگ روم میں چلو تھوڑی شدھ بدھ ہی حاصل کر لو ہو سکتا ہے انکل ظفر کا مستقبل بھی کچھ سنور جائے جو کہ فی الحال دکھائی نہیں دیتا۔"

"یوں نہیں کہتے بیٹا، اب اس میں للی کا کیا قصور ہے جو اسے بزنس کی بجائے فائن آرٹ سے دلچسپی ہے۔"

"یہی تو میں سمجھاتی ہوں اسے، اور پاپا کو، مگر دونوں ہی اس نہج پر نہیں سوچتے۔" وہ اور بھڑکانے لگی تو پاپا ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے سمرہ نے بے دردی سے اس کے بازوؤں میں چٹکی بھری وہ "سی سی" کرتی اسے گھورنے لگی تو اس نے پوچھا۔

"ویسے آج اس قدر صبح صبح آپ کی یہاں آمد میں کیا راز پوشیدہ ہے۔" جواباً للی کے لب کھلے۔

"صرف اتنا ہی ڈیئر کہ تمہارا دن اچھا گزر جائے کہتے ہیں خوبصورت اور فرحت بخش چہرے آنکھ کھلتے ہی دیکھ لیے جائیں تو سارا دن اچھی اچھی خبریں اور لوگ ملتے رہتے ہیں۔"

"ایکسیلنٹ، اس لیے میں صبح اٹھ کر پہلا کام یہی کرتی ہوں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر، میرا دن واقعی بہت اچھا گزرتا ہے اس لیے اس چہرے کی تو ویسے ہی نہیں۔" اس نے بے نیازی سے کہا تو للی نے بیگ اٹھا لیا پھر خفگی سے بولی۔

"یہاں ہم محترمہ کے لیے ایک خوشخبری لیے دوڑے دوڑے چلے آئے بنا ناشتا کیے ادھر محترمہ لفٹ ہی نہیں لگا رہیں ٹھیک ہے ہم خود اس نادر ترین موقع سے فائدہ اٹھائیں گے۔"

"مثلاً کون سا نادر ترین موقع للی ڈیئر۔" اس کی بات کا اثر لیے بغیر سمرہ نے اسے دیکھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ للی سدا اسے اپنی طرف کھینچنے کے لیے اسی طرح کے لالچ دیتی رہتی تھی جب حقیقت پوچھی جاتی تو جواباً صرف ہی ہی ہی کرتی رہتی سو وہ ڈھیلی پڑی ہوئی تھی اس لیے للی جھنجھلا گئی۔

"سوچ لو یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پچھتاؤ گی۔"

"پچھتانے پر اتھارٹی ہوں تم آگے کہو۔" اس نے عادتاً اس کی بات سرسری لی تو اس نے اپنی جینز کی جیب سے دو ٹکٹ نکال کر سامنے لہرائے۔

"یہ کیا ہے بھئی۔" وہ لمحہ بھر کو چونکی تو وہ کالر جھاڑ کر کہنے لگی۔

"یہ ٹکٹ ہیں مائی ڈیئر۔ آج ہیثم ولی کی آرٹ گیلری میں ایگزیبیشن ہے، سوچا تھا تمہیں ساتھ لے جاؤں مگر لگتا ہے اب تنہا ہی جانا ہوگا ویسے سنا ہے ہیثم ولی پہلی بار اس تصویری نمائش میں خود اپنا بھی دیدار کروا رہا ہے۔"

"کیا واقعی۔" فرطِ مسرت سے اس کی آواز ضرورت سے زیادہ بلند ہوگئی ورنہ تو پاپا کے پیچھے چلتے ہوئے دونوں ہی مدھم لہجے میں باتیں کر رہی تھیں اس لیے اس چیخ نما جملے پر میٹنگ روم میں داخل ہوتے پاپا یکلخت رک گئے پھر انہوں نے ہینڈل تھامے تھامے پوچھا۔

"کیا ہوا سمرہ بیٹا۔" للی نے پاپا کا لہجہ مشفق دیکھا تو اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

"جو لوگ ہیثم ولی کو اس کی تصویروں کے ساتھ خود اسے بھی دیکھنا چاہتے ہیں آج ان کا دن ہے۔"

"یعنی! آج ایگزیبیشن ہے اوہ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تھا۔"

"کیا انکل۔"

"کچھ نہیں تم لوگ جاؤ، آج کا دن تمہارا ہے.....!"

"مگر پاپا وہ نیا پروجیکٹ وہ میٹنگ۔" وہ حقیقتاً پاپا کے پروگرام کو مس کرنے پر کسمسائی، پاپا ہولے سے اس کا گال تھپکا کر بولے۔

"تمہاری زندگی اور عمر یہی تو ہے انجوائمنٹ اور اپنی مرضی سے گزارنے کی، میں سب ہینڈل کرلوں گا تم للی کے ساتھ جاؤ۔ لیکن واپس لوٹو گی تو میں تمام روداد تفصیل سے سنوں گا گاڈ بلیس یو مائی چائلڈ۔" پاپا میٹنگ روم میں داخل ہوگئے اور وہ سکتے کی کیفیت میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی سوچنے لگی۔

یہ پاپا آخر کس مٹی کے بنے ہیں کہ اپنے ہر موڈ، ہر پروگرام کو محض اس کی خوشی کے لیے رد کر دیتے ہیں۔

"اب کیا اسی مقام پر ٹائم گزارنے کا ارادہ ہے وہاں وہ ہیثم ولی سوکھ رہا ہوگا تمہارے انتظار میں۔"

"ہاں میں تو الزبتھ وومن ہوں نا۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولی تو للی نے اسے گھور کے دیکھا پھر کہا۔

"اس طرح کے بے ہودہ موڈ میں جانے سے بہتر ہے تم اس کمرے میں کمپیوٹرز مائنڈڈ افراد کے ساتھ جمع تقسیم کرتی رہو، بندی اکیلے ہی یہ لمحے انجوائے کر لے گی۔" سمرہ نے نظر اٹھا کر اس کے خفا چہرے کو دیکھا پھر، اس کے شیگی کٹ بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا اور بولی۔

"سنا ہے بعض چہرے ایسے ہوتے ہیں جو صرف دھلے ہوئے آسمان کی طرح ہی بھلے لگتے ہیں خفگی کی ہلکی سی گرد بھی ان کے آئینہ رو پر جم جائے نا تو زندگی بوجھل اور بے رنگ لگنے لگتی ہے اور....."

"اور یہ کہ آج کل گھی کے فی ڈبے پر تین روپے اچانک بڑھا دیئے گئے ہیں۔"

"یعنی ابھی تک تم میری بکواس کو مسکا پالش سمجھ رہی تھیں۔" وہ گھورنے لگی تو اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے آگے دھکیلا۔

"چل آگے چل وقت بہت کم رہ گیا ہے۔" وہ اس کے ساتھ چلنے لگی پھر للی کے ساتھ اس کی آسٹن میں بیٹھی تو اس نے رش ڈرائیونگ کے وہ کمالات دکھائے کہ سمرہ عمیر کو اپنے اگلے پچھلے گناہ و ثواب یاد آ گئے اور وہ چلائی۔

"لنی میں اپنے باپ کی ایک ہی بیٹی ہوں، مجھے کچھ ہوگیا تو میرے پاپا کا کیا ہوگا۔" اس نے سنا تو قہقہہ مار کر بولی۔

"ہونہہ میں بھی اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی ہوں، لیکن میرے پاپا تو ہر وقت میری طرف سے بری خبروں کے منتظر رہتے ہیں بلکہ اگر میرے مرنے کی خبر بھی انہیں دی گئی تو وہ اپنے سامنے سے ایک فائل اٹھا کر دائیں سے بائیں رکھ دیں گے اور فرمائیں گے۔"

"اچھا تو لنی مر گئی، "چلو خس کم جہاں پاک" "یقین کرو باقاعدہ شکرانے کے نفل بھی پڑھیں گے۔" وہ بظاہر سرسری مگر تلخی سے بولی تو سمرہ سب کچھ بھول کر اس کی دل داری میں لگ گئی ظفر انکل کی مصروفیات اور اس کی سرد مزاجی جانتی تھی اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ اس پر حق جتاتی اور اس کے پاپا اس کا خیال اپنی بیٹی کی طرح یوں رکھتے کہ پہلی بار دیکھنے پر لگتا وہ دونوں ہی ان کی بیٹیاں ہیں، وہ فری بھی تو بہت تھی جب دل چاہتا پاپا کے دفتر میں گھس جاتی کبھی اکیلی کبھی سمرہ کے ساتھ پھر ان کی ریوالونگ چیئر پر جھولتی رہتی پاپا کی کوٹ میں سے شاپنگ کے لیے رقم نکال لیتی پھر سامنے لہرا کر کہتی۔

"انکل یہ زیادہ تو نہیں۔" پاپا ہنس پڑتے۔

"زیادہ بالکل نہیں ہیں اور اگر ہوتے بھی تو میرا سب تم دونوں کا ہی تو ہے جاؤ خوب شاپنگ کرو۔" اور پھر وہ ہوتی سمرہ ہوتی جانے کہاں کہاں سے اس کی منی آسٹن گھوم گھما کر چھوٹی چھوٹی گلیوں سے ہوتی کسی پشاوری ہوٹل پہ جا رکتی قہوے خانے ہوتے جہاں کشمیری چائے ہوتی اور سمرہ سراہا کر اس کی معلومات کی داد دیتی رہتی شہر کے چپے چپے سے اس کی واقفیت کے گن گاتی اور کبھی جو اس کی ضرورت پڑتی تو بس ایک فون کھڑکا دیتی۔

"مجھے آ کر لے جاؤ فلاں بک شاپ تک جانا ہے فلاں ٹیلرنگ شاپ کا پتا معلوم ہے نا تمہیں۔" اور وہ اسٹیئرنگ گھماتی ٹیپ ریکارڈر کی طرح آن رہتی پوری لوکیشن بتاتی جاتی۔

"لنی کیا سونے لگیں۔" آسٹن میں بکھری خاموشی اور اپنی سوچوں سے گھبرا کر سمرہ عمیر نے اس کا شانہ ہلایا تو وہ پھر ہنسنے لگی۔

"سو تم رہی تھیں اور کتنی غلط بات ہے پوچھ مجھ سے رہی ہو ویسے باخبر ذرائع سے پتا چلا ہے کہ ہشم ولی اپنی تصاویر کی طرح خود بھی کافی حد تک دیکھنے کی چیز ہے اور اسے گرین آئیز بھی کافی پسند ہیں یعنی تمہارا مستقبل بہت روشن ہے۔"

"توبہ لڑکی تمہارا کیا خیال ہے، میں ایسی فضول قسم کی سوچوں کا شکار رہتی ہوں لنی ڈیئر ہشم ولی مجھے صرف اس لیے پسند ہے کہ وہ بہت اچھا مصور، مجسمہ ساز ہے اس کی ہر پینٹنگ ہر مجسمہ شاہکار ہوتا ہے مجھے بس اس کے فن کی چاشنی اور دکھ رنجیدہ رکھتا ہے جیسے اس کی ہر تصویر کی آنکھ میں آنسو ہو اور ہر آنسو اس کا چھپا دکھ ہو۔"

"الٹ پھیر کر بات تو وہی ہوئی، ویسے باخبر ذرائع نے یہ نہیں بتایا کہ وہ واس ہشم ولی کے دور پرے کا رشتہ دار ہوتا ہے۔"

"بکو مت۔" اس نے جھنجلا کر اس کے کاندھے پر مکا مارا تو وہ ہنستے ہوئے کار پارک کرنے لگی اور پھر وہ لنی کا ہاتھ تھامے ایک ایک تصویر کے سامنے کتنی دیر تک جمی خود بھی تصویر ہو جاتی لنی کو باقاعدہ اسے دھکیلنا پڑتا۔

"واؤ کیا خیال ہے۔" وہ ایک تصویر کے سامنے رک کر تیز آواز میں بولی تو اس کے برابر میں کھڑا بڑی بڑی آنکھوں والا سوبر سا نوجوان پوری توجہ سے اسے دیکھنے لگا سمرہ تصویر میں محو تھی مگر لنی کی نگاہ اس پر جم گئی بلاخر اس کی

زبان میں کھلتی ہوئی وہ اس کے دائیں طرف سے بائیں طرف آئی پھر گنگنانے والے انداز میں بولی۔

"محترم آپ نے ٹکٹ اگزیبیشن کے لیے خریدا تھا یا چاند چہروں کو گھورنے کے لیے۔"

"جی......ای......" چونک کر اس نے آفت کی پرکالہ کو دیکھا سمرہ بھی اس جی پہ ہڑبڑا کر اس نئی آنے والی آفت پہ غور کرنے لگی اور وہ نوجوان اس سے شستہ اردو میں مخاطب ہوا۔

"میرے خیال میں آپ کی مسز خوش فہمی کے مرض کا شکار ہیں۔"

"جی میں سمجھی نہیں۔" وہ حیرت زدہ تھی سو وہ، اس کی حیرت ختم کرنے کو بولا۔

"جس طرح آپ کی سمجھ میں اس وقت نہیں آ رہا مجھے بھی نہیں آیا تھا ملاحظہ کریں آپ ان کو اور یہ خود کو چاند چہرہ گردان رہی ہیں شاید انہیں معلوم نہیں میں نے چاند دیکھ رکھا ہے۔" عام بات تھی شاید شوخی بھی ہو سکتی تھی طنز بھی، مگر اس لہجے میں ان جملوں میں کچھ نا محسوس کاٹ اور سرد مہری تھی ضرور کہ بے ساختہ توہین کا احساس ہوتا اور للی تو حساسیت میں سب سے آگے بڑھنا چاہا، مگر وہ وہیں رک گئی پھر تلخی سے بولی۔

"چاند کا رنگ معلوم ہے کیسا ہوتا ہے مسٹر نا معلوم۔"

"یعنی آپ سمجھتی ہیں میں...."

"دراصل میں x-y-z ٹائپ لوگوں کو کچھ سمجھتی ہی نہیں، لیکن پھر کہنا چاہوں گی آپ کی بصارت پر بھروسہ کرنا حماقت ہوگا نہ جانے عینک کے پیچھے سے آپ نے چاند کو دیکھا تھا یا کسی فارغ البال کو، کون جانے۔"

"کھی کھی کھی۔" سمرہ کی اتنی سنجیدگی پہ ہنسی چھوٹ گئی اور وہ شخص غصیلی نظر ڈالتا ہوا آگے بڑھ گیا للی نے کالر اکڑایا پھر بولی۔

ایک وحشت زدہ سی لڑکی اٹے ہوئے بال، جا بجا زخم پھٹے ہوئے لباس میں سر گھٹنوں پر رکھے غمزدہ سی بیٹھی تھی، پیروں میں زنجیر کے گہرے گہرے نشانات تھے، تلووں سے خون رس رس کر ارد گرد جمع تھا اور للی کو یہی دکھ، زخم متوجہ کر رہے تھے، کہ سمرہ نے بے ساختہ کہا۔

"ہیثم ولی واقعی مصور ہے،" اور اس نے تائید کی سمرہ نے لہو کو چھو کر دیکھا اور کہا۔ "کتنی خوبصورت عکاسی ہے یہ لہو تو بالکل اصلی لگتا ہے۔" پشت پر سے کہیں سے آواز آئی۔

"خون جگر کہیں نقلی بھی ہوتا ہے محترمہ۔" للی نے نگاہ اٹھا کر دیکھا وہی شخص پھر سامنے موجود تھا سمرہ تصویر کے کیپشن میں الجھی ہوئی تھی مگر کیپشن کے نیچے جگہ خالی تھی سوالیہ نشان کے ساتھ سمرہ اس شخص کو نظر انداز کر کے دوبارہ تصویر کی طرف متوجہ ہو گئی پھر بولی۔

"محبت کی اس سے بڑھ کر تشریح ہو ہی نہیں سکتی للی۔" للی اسے ستائش سے دیکھ بھی نہ پائی تھی کہ وہ شخص متوجہ ہو کر پھر بولا۔

"آپ واحد لڑکی ہیں مس، جس نے اس تصویر کو صحیح انداز سے ہٹ کر اس ازروح پہ پہچانا ہے ورنہ سب کا خیال تھا کہ یہ مفلوک الحال فاقہ زدہ لڑکی کو پینٹ کیا ہے میں نے۔" آگے بڑھ کر اس نے مارکر سے خوبصورت ہینڈ رائٹنگ میں "محبت" درج کر دیا تو للی سر کھجانے لگی شرمندگی سے اور سمرہ یکلخت ہونق ہو گئی۔

"آپ! یہ آپ ہیں۔"

"محترمہ اگر آپ کا اشارہ تصویر کی طرف ہے تو مجھے اس کیفیت سے انکار ہے اگر میری طرف ہے تو برملا میں مانتا ہوں کہ میں ہی ہیشم ولی ہوں۔"

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" للی نے بے ساختہ پہل کی مگر وہ چڑ کر بولا۔

"آپ کو ہوئی ہوگی خوشی ورنہ مجھے آپ سے مل کر قطعاً کوئی خوشی نہیں ہوئی۔" للی نے سنا مگر آسانی سے کہاں ٹلنے والی تھی جھٹ سے خوش اخلاقی سے بولی۔

"دلوں کا سچ ایک طرف مسٹر ہیشم لیکن آپ میری طرح جھوٹ موٹ اخلاقی کا مظاہرہ تو کر ہی سکتے تھے۔ ناں مگر مجھے لگتا ہے آپ کی بصارت آپ کے اخلاق کا بھی ایک نمبر مزید گر چکا ہے نئی عینک فوراً لگوائیے۔"

"دیکھیے مجھے اجنبیوں کے ساتھ ہنسی مذاق بالکل اچھا نہیں لگتا۔"

"مجھے آپ سے اتفاق ہے کیوں ہر خبطی آدمی یونہی کہتا ہے۔" للی اس کا مزید جواب سنے بغیر آگے بڑھ گئی۔

اور پھر شام کو جب وہ لوٹے تو دونوں نے پاپا کو دفتر سے ہی پک کیا تھکے تھکے سے پاپا پر بے اختیار دونوں ہی کو پیار آ گیا اور خود پر شرمندگی بھی ہوئی اس لیے سمرہ نے پاپا کو دیکھ کر کہا۔

"آئی ایم ریئلی سوری پاپا ہمیں آرٹ ایگزیبیشن میں جانے کی بجائے آپ کا ہاتھ بٹانا چاہیے تھا۔" پاپا نے سنا تو ان کے لب مسکرائے۔

"پاپا جب جانتے ہیں کہ ان کی بیٹی کس جگہ جا کر زیادہ خوش ہو سکتی تو پھر شرمندگی کا کیا کام سمرہ تمہارے پاپا کی نظر میں تمہاری مسکراہٹ زیادہ قیمتی ہے، کرنسی نوٹوں کے مقابلے میں، اس لیے تمہارے پاپا تمہیں کسی معاملے میں بھی مکمل طور پر زور زبردستی اور اپنی مرضی پر نہیں چلاتے کیونکہ پاپا کو اپنی چندا بہت عزیز ہے۔"

"پاپا! پاپا آپ کیا ہیں آخر۔" وہ ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے آنسو بھی بھر لائی تو پاپا نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا للی کو بائیں طرف پھر باری باری دونوں کی پیشانی چومی کہا کچھ نہیں پاپا کی نگاہ کھڑکی سے باہر جمی تھی ان دونوں کی پاپا پر اور ڈرائیور مرسیڈیز کو سبک رفتاری سے سمرہ منزل کی طرف لیے جا رہا تھا تینوں ہی چپ تھے مگر گھر میں داخل ہوتے ہی للی شروع ہو گئی۔

"انکل ڈیئر یہ لڑکی بڑی، بور ہے پتا ہے وہاں ہیشم ولی آیا تھا۔"

"ہیشم ولی...... اچھا ہاں تم نے صحیح بتایا تو تھا کیا ہوا وہاں۔"

"ہونا کیا تھا انکل، آج دراصل وہ پہلی بار اپنی تصاویر کے ساتھ آرٹ گیلری میں مدعو تھا اور دلچسپ بات یہ کہ ہم اس کی صورت سے آشنا نہیں تھے پھر پتا ہے کیا ہوا۔" للی تمام روداد بیان کر کے ہنس پڑی۔ تو پاپا نے اس کا کان مروڑا پھر بولے۔

"بہت شرارت بلی ہے، مجھے معلوم ہے اتنے اچھے خاصے بندے کو پزل کر دیا ہوگا۔"

"آپ کو کیسے پتا کہ وہ اچھا خاصا تھا یا عام سا، ہو سکتا ہے ہم نے اس کی تصویر کشی میں غلط بیانی کی ہو۔"

"ہو ہی نہیں سکتا یہ، کیونکہ ہیشم ولی کو میں جانتا ہوں۔"

"آپ کس طرح جانتے ہیں میں نہیں مان سکتی۔" للی نفی میں سر ہلانے لگی تو پاپا نے سائیڈ جیب سے ایک انویٹیشن کارڈ نکال کر لہرایا پھر بولے۔

"یہ دیکھو اس نے خصوصی طور پر بھیجا ہے یہ کارڈ اب تو مانو گی نا۔"

"اس کارڈ کی وجہ سے اب تو ظاہر ہے ماننا ہی پڑے گا لیکن انکل آپ اتنی تاکید کے باوجود گئے کیوں نہیں پہلے بتا دیتے آپ تو میری پاکٹ منی کا خون تو نہ ہوتا۔" پاپا کھل کھلا کر ہنس پڑے مگر سمرہ کی طرف دیکھا تو تحیر سے پوچھا۔

"تمہیں کیا ہوا سمرہ بیٹا۔"

"انہیں افسوس ہو رہا ہے دراصل۔"

"کس بات کا افسوس بھئی۔" پاپا نے غور سے للی کی طرف دیکھا۔

"یہی کہ اسے محبت والی شاہکار تصویر پسند آئی تھی ہم نے ہیشم ولی سے اس کی سیل کرنے کو بھی کہا مگر نہیں جناب اپنے نام کے ایک ہی ہیں وہ مان کر نہیں دیئے، کہنے لگے "محبت بیچنے کی چیز تو نہیں محبت سے مانگیے ابھی دیتا ہوں۔" مگر انکل اجنبیوں سے احسان کیسے لیا جا سکتا ہے میں نے یہی سمجھایا تھا ورنہ یہ تو مچل رہی تھی وہیں اب مجھ سے ناراض بھی ہے اور اداس بھی پوچھیے اس سے ایسی بھی کیا دیوانگی کہ بندہ بالکل ہی کسی چیز کے آگے جھک جائے ہر چیز کو سرسری لیا کرو سمرہ فائدے میں رہو گی۔" انکل کو کہتے کہتے اس نے آخری جملہ اس کی طرف منہ کر کے کہا تو پاپا بھی تائید میں کہنے لگے۔

"للی ٹھیک کہتی ہے سمرہ، کیونکہ جو لوگ ہر چیز کو اہمیت دیتے ہیں حساس ہونے کی وجہ سے خود کو روگ لگا لیتے ہیں وہ دراصل کسی کا نقصان نہیں کر رہے ہوتے ہیں، بلکہ خود اپنی ذات کو تباہ کر رہے ہوتے ہیں، دنیا میں ہر چیز حاصل ہونے کے لیے نہیں بلکہ خواب کی طرح بس دور سے دیکھنے کے لیے ہوتی ہے میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا سمرہ کہ تم جتنا سرسری انداز سے اس دنیا کو دیکھو گی یہ دنیا اتنی ہی کشش کے ساتھ تمہارے سامنے پورے قد سے گری ہو گی کیا سمجھیں۔"

"جی پاپا بہت کچھ بلکہ سب کچھ۔" اس نے موڈ بہتر بنایا اٹھنے ہی لگی تھی کہ ایک ملازم نے ایک کارڈ پاپا کو لا تھمایا۔

"ارے ہیشم ولی یہ یہاں..... جاؤ بھیج دو۔" دونوں چلتے چلتے رک گئیں ہیشم ولی پہلے کے سے روپے میں تھکن سمیت وسیع ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اس کے ہاتھ میں خاکی کاغذ میں لپٹا ہوا ایک بڑا سا پیکٹ بھی تھما ہوا تھا۔

"کیسے ہو ہیشم۔" پاپا نے گرمجوشی سے اٹھ کر ہیشم ولی کو سینے سے لگایا تو وہ سمرہ اور للی کو دیکھ کر مسکرایا پھر بولا۔

"دراصل مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ آپ کی بیٹیاں ہیں، انکل ورنہ وہ بدمزگی ہوتی ہی نہیں، آپ تو مجھے جانتے ہیں میرے بیک گراؤنڈ سمیت، بس ایک سنجیدہ موقعے پر ان کی بے تکلفی کھل گئی، لیکن مجھے آپ پر رشک آتا ہے انکل یہ سمرہ صاحبہ تو بہت اندر تک ایک بہترین اور آرٹسٹ نگاہ رکھتی ہیں۔" وہ درمیان کی بات چھوڑ کر سمرہ کی تعریف کرنے لگا تو للی نے پہلو بدلا پھر بول ہی پڑی۔

"یہ کوئی نئی بات نہیں، ہم سب کے اندر ایک آرٹسٹک نگاہ ہوتی ہے مسٹر ہیشم مگر خوابیدہ سی جو کبھی جاگ جاتی ہے کبھی عمر بھر سوئی رہتی ہے اس میں نیا پن کیا ہوا۔" اس نے رکھائی سے کہہ کر تمام تر بے مہری سمیت اسے دیکھا تو وہ ہنس پڑا۔

"مجھے آپ کا مزاج نہیں پسند، مگر آپ کی باتوں پر میں بعد میں کافی دیر تک محظوظ ہوتا رہا۔" وہ لمحہ بھر کو رکا پھر

پکٹ میز پر رکھ کر مزید بولا۔ "سمرہ صاحبہ نے اس تصویر کو صحیح طرح ڈسکور کیا اس حساب سے تو یہی اس تصویر کی صحیح حقدار تھیں لیکن جب آپ نے میرے سامنے چیک بک کھولی تو مجھے الجھن ہونے لگی کیونکہ اچھے خیال، اچھے خواب، لمحے فارمل نہیں ہوتے یہ تو تحفہ ہوتے ہیں ہمارے لیے ہماری زندگیوں کے لیے سو میں یہ تصویر ایگزیبیشن کے بعد لے آیا یقیناً آپ یہ قبول کرلیں گی۔"

"کیوں نہیں اچھے لمحے لہجے اور تحفے ٹھکرانا اس گھر کی بھی روایت نہیں مسٹر ہیثم۔" لقی نے تصویر سے کاغذ اُتارا تو پاپا کی نگاہ تصویر پہ جم کر رہ گئی۔

"تو ابھی تک تمہارا یہ ہیڈک ختم نہیں ہوا ہیثم" ہیثم نے نگاہ اٹھا کر پاپا کو دیکھا پھر دکھ سے بولا۔

"محبت درد ہے، مگر انکل اگر یہ درد بھی دل کے قریب نہ رہے تو میں کیسے یقین کرادوں کہ میں زندہ بھی ہوں یا...... یہ درد تو دل کا ہالہ ہے آپ نے کسی ہالے کی بنا کوئی چاند دیکھا ہے۔"

"نہیں، مگر ہیثم چاند اس ہالہ کو دکھ کی طرح اگر سنبھالتے ہوئے کسی دن بجھے سیارچے کی طرح خلا کی وسعتوں میں بکھر کر مٹ گیا تو......"

"تو یہ اس کی قسمت ہوگی انکل، سنتے ہیں ویسے بھی محبت کی راہ میں مٹنے والے دیر تک یاد رکھے جاتے ہیں۔"

"ہوسکتا ہے کتابیں تو یہی کہتی ہیں، مگر ضروری تو نہیں کتابیں جو داستانیں سنائیں وہ سچی بھی ہوں۔"

"یہ بھی ہوسکتا ہے مگر اک تجربہ کرنے میں حرج ہی کیا ہے انکل۔" وہ دلآویز انداز میں مسکرانے لگا تو لقی نے تصویر اٹھائی پھر سمرہ کا ہاتھ پکڑ کر مڑی اور بولی۔

"آپ انکل سے یونہی لایعنی باتیں کیجیے ہم ذرا اس تصویر کا کام تمام کر ڈالیں چائے آتی ہوگی پی کر جائیے گا۔"

"کیوں نہیں مگر جیسے تصویر کے ٹکڑے ڈسٹ بن میں ڈالنے کی بجائے مجھے واپس کر دیجیے گا عنایت ہوگی۔"

"عنایت ہوسکتی تھی مگر سمرہ کا خیال ہے اس کا فریم کچھ اس قدر دلکش ہے کہ تصویر توڑنے کو دل نہیں چاہتا۔"

"یعنی آپ نے صرف فریم کی خوبصورتی سے آنکھیں سینکی ہیں۔"

"کیوں نہیں جس طرح آپ مرد حضرات خوبصورت چہروں کے صرف فریم سے محبت کرتے ہیں اندر کی اصل تصویر سے نہیں اسی طرح کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں مسٹر ہیثم ولی۔" وہ بولتی ہوئی آگے بڑھ گئی تو ہیثم ولی نے نگاہ موڑ کر پاپا کو دیکھا پھر بولا۔

"انکل آپ کی ایک بیٹی خاموش فریم کی طرح ہے، مگر یہ دوسری والی بہت باتونی ہے اس کی تصویر میں ہر رنگ زبردستی لگایا گیا ہے مگر اس کے چہرے میں محبت کے بیچ میں بے رخی دکھ بہت رچا ہوا ہے کیوں؟"

"شاید اس لیے کہ یہ بھی تمہاری طرح محبت کو مس بھی کرتی ہے اور اپنائی بھی نہیں ہے۔"

"مگر آپ کی بیٹی ہو کر محبت تو اس کا اصل موسم ہونا چاہیے تھا۔"

"ہونا تو چاہیے تھا۔ مگر نہیں ہے، اور پھر بعض لوگوں پر ہر موسم اثر انداز ہو، یہ ضروری بھی تو نہیں ہوتا نا۔"

انہوں نے جانے کیوں جلدی سے بات ختم کی اس نے محسوس تو کیا مگر کچھ بولا نہیں اور ملازم چائے بنانے لگا پاپا اس سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے یہاں تک کہ وہ چائے پی کر اٹھ گیا تو پاپا ملازم سے برتن اٹھانے کا کہہ کر بالوں میں

ہاتھ پھیرتے اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گئے۔

یہ کمرہ جو ان کے ہر موسم اور غم، ہر لمحے کا گواہ تھا انہوں نے وارڈ روب کھولی سامنے چھوٹی چھوٹی مگر یادگار لمحوں کے انمٹ نقوش سمیت کئی تصاویر آویزاں تھیں ایک ہی چہرہ بار بار کیمرے کی زد میں تھا مسکراتا ہوا بہار کے جھونکے کی طرح سے لبھاتا ہوا انہوں نے آنکھیں بند کر کے دوبارہ کھولیں تو پلکوں کے گرد آنسوؤں کے چھوٹے چھوٹے دیپ روشن ہو چکے تھے۔

ہر شام یہ دیپ آنکھوں کے طاقچوں پر روشن ہوتے تو ساری رات اردگرد اس چہرے کے خال و خد بکھر جاتے اور وہ ایک ایک سراپا ہاتھ میں تھامے کتنی دیر تک ساکت و صامت پڑے رہتے دل چاہتا اس دکھ پر احتجاج کیا جائے دل روح سمیت مگر وہ تو سدا کے دوسروں کے سکھ و آرام کے لیے خود کو تج چکے تھے، پھر بھلا کیسے وہ اس دکھ کا گوشوارہ رکھتے کیسے اپنی جان سے پیاری بیٹی کو بے کل، بے قرار کرتے کہ ایک اس کی خوشی کے لیے تو وہ اب تک زندگی کا زہر پیتے آ رہے تھے نہ چاہنے کے باوجود جیتے چلے آ رہے تھے اور ان کے فیملی ڈاکٹر جو دوست بھی تھے ان کے جینے پر حیران تھے اور کہتے تھے۔

"تم اندر سے جس طرح خود کو سخت محنت اور اسموکنگ سے تباہ و برباد کر چکے ہو اس کے بعد بھی اس قدر جی لینا کمال ہے، جانتے ہو عمیر تمہیں علاج کی سخت ضرورت ہے باہر چلے جاؤ تمہارا مکمل علاج بہت ضروری ہے۔" وہ سنتے تو ہنس پڑتے پھر کہتے۔

"تم صرف ڈاکٹر بن کر سوچتے ہو۔ کبھی میرے انداز میں زندگی کو پرکھو محسوس کرو تو تمہیں سمجھ میں آئے کہ میرے اندر زندگی سمرہ کا نام بن کر دوڑتی ہے، میری بیٹی کے سوا ہے ہی کون جس کے لیے میں جیوں یہ معجزہ نہیں محبت ہے رشید احمد۔"

"مگر تم میڈیکل جاننے والے اس جذبے کو کیا سمجھو گے کہ بقول تمہارے دل تو صرف صاف خون مہیا کرنے کا پمپنگ اسٹیشن ہے اور بس۔" ڈاکٹر رشید خاموشی سے عمیر کو دیکھتے مزید ٹیبلٹ پین کلر تجویز کر دیتے اور وہ ان کے پاس سے اٹھ آتے کتنی بار رشید احمد نے پوچھا۔

"آخر تم کیا سوچتے ہو، جب آتے ہو بی پی اپ ہی ہوتا ہے۔"

وہ ان کی بات سن کر ہنستے اور کہتے۔

"سمرہ کے علاوہ کیا سوچوں گا۔" ڈاکٹر رشید احمد کی تیز نگاہیں ان کے چہرے پر ٹک جاتیں۔

"بات صرف سمرہ کی نہیں لگتی عمیر تمہاری آنکھ میں ایک اور بھی عکس ہے تمہیں روشن گوہر یاد آتی ہیں نا۔"

"روشن نہیں مجھے بھلا وہ کیوں یاد آئے گی۔" وہ مکر جاتے تو دل کے قریب ٹیس اٹھ کر اس جھوٹ پر احتجاج کرنے لگتی ڈاکٹر رشید دیکھتے تو گھبرا جاتے انجکشن لگاتے کہتے۔

"خود کو دکھ مت کرو عمیر جو نام بظاہر تمہاری زندگی سے مٹ چکا اسے تم دل سے بھی کیوں نہیں مٹا دیتے۔"

وہ سنتے تو سر اٹھا کر دیکھتے پھر پوچھتے۔

"دل پر نقش ہونے والے نام کیا مٹائے جا سکتے ہیں رشید۔" ڈاکٹر رشید احمد لاجواب ہو جاتے۔

''جو نام جو چہرے ہمارے نام نہیں ہوتے وہ ہمیں وقت سونپتا کیوں ہے۔ ان چہروں سے ہمیں ملاتا کیوں ہے کہ پھر ان کی یاد ہمارے دل کو راکھ کر دیتی ہے مگر کتنی بے بسی ہے کہ ہم اس راکھ کو مٹھی میں بند کر کے یا وصر صر کے سامنے کھول بھی نہیں سکتے کیوں کہ کچھ اور نام اور چہرے ہماری زندگی کے لیے دست دعا پھیلائے ہمارے گرد حصار بن کر کھڑے رہتے ہیں۔''

روشن گوہر نہ جانے تم وفا کی کون سی منزل کی مسافر تھیں کہ نہ تم مجھ سے جدا ہو میں نہ مجھے ملیں تمہارا وجود کہیں اور ہے مگر مجھے یقین ہے تمہارا دل تمہارا دماغ ابھی تک میرے لیے سوچتا اور دھڑکتا ہے جس طرح میں تمہیں تنہائی میں سوچتا ہوں بالکل اسی طرح تم بھی مجھے تنہائی میں سراہتی ہو گی مگر کیا ہو جاتا جو تم محبت میں نارمل رہتیں محبت میں جنون نے نہ تمہیں کہیں کا رکھا نہ مجھے۔''

''پاپا آپ نے ابھی تک کپڑے نہیں بدلے۔'' یکلخت سوچتے ذہن پر ایک دستک ہوئی انہوں نے چونک کر تیزی سے آنکھیں رگڑیں سامنے سے ہینگر اتارا باقی کپڑوں کو برابر کیا پھر مڑے تو ازلی مسکراہٹ اور زندگی ان کے چہرے سے کرن کی طرح پھوٹ رہی تھی لیکن پھر بھی انہوں نے خود کو مزید کور ڈ کیا پھر ہولے سے بولے۔

''لالی چلی گئی کیا.....''

''نہیں تو بلکہ اس نے تو مجھے بھیجا ہے کہنے لگی پاپا کو جلدی سے ڈائننگ روم میں بھیجو شدت سے بھوک لگ رہی ہے سو میں یہاں آ گئی مگر آپ تو شاید ابھی تک ہاتھ نہیں لے سکے۔''

''ہوں بس ہیشم ولی کے متعلق سوچ رہا تھا بہت پیارا بچہ ہے مگر بہت کریزی ہے محبت میں، مجھے اس کے جنون سے ڈر لگتا ہے سمرہ۔'' انہوں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا سمرہ عمیر کو ہیشم ولی پر غصہ آ گیا خوامخواہ اس کے پاپا ان کے لیے آزردہ ہو گئے تھے اس نے سوچا پھر آگے بڑھ آئی دھیرے سے پاپا کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر پھر بولی۔

''ہمیں دن بھر میں، بہتیرے لوگ ملتے ہیں اور پاپا ہر شخص کا دکھ الگ اور دلگداز ہوتا ہے مگر ہم سب کے لیے تو کچھ کر نہیں سکتے پھر کسی کے دکھ سے خود کو دکھی کرنا کہاں کا انصاف ہے، ہیشم ولی کا اگر کوئی مسئلہ ہے تو اسے وہی حل کر سکتے ہیں ہم یا آپ آخر کس ناتے سے ان کے لیے کچھ کریں اور پھر ضروری تو نہیں ہیشم ولی بھی ہمیں اسی مقام پر رکھ کر دیکھیں جس مقام سے ہم انہیں دیکھتے ہیں بعض لوگ اپنے دکھ اپنے آنسو خود سے شیئر نہیں کرتے آپ سمجھ رہے ہیں نا پاپا۔''

''ہوں شاید۔'' وہ اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے ہاتھ روم کی طرف بڑھ گئے تو سمرہ دوپٹہ درست کرتی ہوئی ملازمین کو کھانا لگانے کا کہنے اٹھ کھڑی ہوئی۔

آج سے پہلے کسی نے اسے اس لہجے میں مخاطب نہیں کیا تھا جس لہجے میں لالی نے اسے انٹرٹین کیا تھا تمام لوگ اس کے آگے آنکھیں بچھاتے تھے لڑکیاں تو خاص طور سے دل اس کی راہ میں بچھانے کو بے قرار رہتی تھیں مگر یہ لالی ظفر جانے کس مٹی کی بنی تھی کہ اس کو بالکل اہمیت نہیں دی تھی۔

عجیب تھی اس کی طبیعت کہ جب لڑکیاں خود اس کی طرف کھنچتیں تو وہ توجہ نہ کرتا مگر جو لڑکی معمولی سی بھی بے نیازی دکھاتی تو اس کی تمام توجہ کشش کے دائرے کی طرح اس کے چہرے پر ہی مرکوز ہو جاتی اور دل چاہتا خود کو اگنور کرنے والے اس حسن تو پہ شکن کے بلند کمپوزیشن میں اپنے نام کے دیپ جلا دے دل کی اک اک نس میں اس محبت

دوڑ جائے اور جب وہ سرخم کر دے تو، تمام تر بے مہری آنکھ میں بھر کر اجنبی کی طرح کہے۔

"غبار راہ، کبھی منزل نہیں بن سکتا میری منزل تو کوئی اور راہ ہے۔" اور کی طرح گزر جائے گزرتا چلا جائے، مگر یہ لغی ظفر، اس کی ذہنی رو پھر لغی ظفر پر آ کر رک گئی تو اس نے اپنے تپتے دماغ کو ٹھنڈا کیا سبک رفتار شیراڈ چکنی سڑک پر پھسلتی جا رہی تھی اور پھر ایک طویل فاصلہ طے کر کے وہ ایک محل نما کوٹھی کے سامنے ہی آ رکا باوردی ملازم نے اس کی طرف کا دروازہ کھولا وہ پروقار قدموں سے اندر داخل ہوا تو سامنے ہی گارڈن میں اسے ممی موبائل پر کسی سے بات کرتی دکھائی دیں۔

وہ تھکا ہوا ہونے کے باوجود تیزی سے ممی کی طرف بڑھ گیا ممی ہی تو اس کی واحد کمزوری تھیں صرف یہی ایک وجود تو تھا یہی قدم تو تھے جن کے سامنے وہ خاک بن کر بچھ بھی سکتا تھا اور ان قدموں کے سامنے آنے والے خار پلکوں سے چننے کی سعی بھی کرنے کو ہر لمحہ تیار رہتا تھا۔ دوستوں میں اسی بات پر وہ ممی چائلڈ مشہور تھا مگر یہ وہ کمزوری تھی جس سے وہ کنارہ نہیں کر سکتا تھا۔

"تم آج بہت جلدی نہیں آ گئے یشم۔" ممی نے کھڑے ہوئے اپنا طواف کرتی اس کی نگاہ پر پہلی بار نظر ڈالی تو سرسری سا پوچھا اور وہ اس پوچھنے پر بولا۔

"ایگزیبیشن تو سات بجے ہی ختم ہو گئی تھی ممی بس انکل جبیر کے گھر کچھ دیر ہو گئی ورنہ اس سے بھی پہلے آ جاتا بائی گاڈ مجھے اپنا وعدہ یاد تھا ممی۔" وہ ان کے قریب دوسری کرسی پر بیٹھ کر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے لجاجت سے بولا ممی نے غصہ بھری نظروں سے دیکھا تو اس کی آنکھ اور لہجے میں پہلے سے زیادہ التجا آ گئی۔

"پلیز ممی آج کی سوری مان لیں آئندہ کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

"ٹھیک ہے دیکھ لیتی ہوں، آئندہ کے لیے بھی ویسے یشم وعدے توڑنا کوئی اچھی بات نہیں۔"

"آئی ایم سوری ممی" اس نے شرمندگی سے کہا تو ممی نے اس کی پیشانی چوم لی پھر بولیں۔

"کیسی رہی ایگزیبیشن میرا خیال تھا میں شام تک فارغ ہو جاؤں گی تو میں بھی شریک ہو جاؤں گی مگر میٹنگ ہی نے اتنا ٹائم لے لیا کہ مجھے اپنا پروگرام کینسل کرنا پڑا تم خفا تو ہوئے ہو گے، مگر بیٹا میں مجبور تھی۔"

"میں جانتا ہوں ممی آپ کی مصروفیت، اس لیے آپ کی کسی بھول چوک پر خفا نہیں ہوتا یقین کریں دنیا میں صرف آپ ہی تو میری اپنی ہیں بے لوث چاہنے والی۔"

ممی نے اسے دیکھا پھر کہا۔ "بے لوث تو تمہیں بہت سے لوگ چاہتے ہیں یشم تمہارے دوست احباب تمہارے فین جواد، جنید اور ستارہ......"

"میں جانتا ہوں سب مجھے چاہتے ہیں جنید بھائی جواد بھائی اور ستارہ بھی مجھے آپ کی طرح چاہتے ہیں مگر ممی محبت کرنا تو انہوں نے بھی آپ سے سیکھا ہے نا یہ چشمہ ان میں خود بخود تو نہیں پھوٹا نا، آپ کی چاہت ہی نے ان میں بھی چاہت جگائی ہے مترنم سبک آبشار کی طرح۔"

"آپ کی محبت اور ممتا ہم چاروں کے لیے زندگی گزارنے کا حوصلہ ہے ممی، کسی نے کہا ہے پتا نہیں سچ یا محض لفاظی کہ محبت منت کا دیا ہے جیسے آگ دکھا کر سبک پانیوں پر نادیدہ ہاتھوں نے بہا دیا ہے یہ چراغ ہے جو اندھیرے راستوں میں روشن ہے یہ دیا جو اماوس کی راتوں میں دریا کی سطح پر تیرتا ہے تو کتنے ہی دلوں میں حوصلہ اور آگے بڑھنے کی

لگن جلا دیتا ہے یہ تو روشنی کا سفر ہے نا ممی ایک دیپ سے دوسرا دیپ دوسرے سے تیسرا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان دیپوں کی ایک لمبی قطار۔

یہ منت کا دیا کہتے ہیں دل تھا جو کسی جوگی منش نے کسی کی بے وفائی پر سینے کی وسعتوں سے نکال کر بہا دیا تھا اس لیے کہتے ہیں جب یہ دیا ہم میں روشن ہوتا ہے تو ہمیں بھی جوگی کر دیتا ہے مگر ممی آپ کے اندر تو اس طرح کے دیوں کی ایک لمبی قطار سے روشن مگر، آپ تو زندگی کو تمام تر شدتوں اور ضرورتوں سمیت تیج کرتی ہیں آپ کا جوگ کہاں گیا۔" اس نے بولتے بولتے نظر اٹھا کر ممی کو دیکھا تو وہ اسے ہی دیکھ رہی تھیں حیرت سے۔

"ممی بتائیں نا آپ کا جوگ کیا ہوا۔"

"تیرے دل میں سما گیا ہیشم تیرے اندر یہ جو بے کلی ہے محبت کے لیے طلب ہے نا یہ میرا ہی تو جوگ ہے۔"

وہ لمحہ بھر کو رکیں کہتے کہتے پھر اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر بولیں۔

"اتنا مت سوچا کر ہیشم کہ تیرا دل بھی منت کے دیے کی طرح دھڑ دھڑ کر کے جل جائے بنا دھواں۔" انہوں نے آزردگی سے کہا اس نے دیکھا پھر مسکرایا۔

"ممی محبت میں جلنا بڑا لذت انگیز معرکہ ہے، کہتے ہیں محبت کی طلب میں راکھ ہونے والے لوگ اپنا سفر پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اور پھر ان کے راستوں پر چلتے ہوئے جب کوئی اور ان کی طرح ان تک پہنچتا ہے تو اس کا دل ان کی قبر پر رات میں دیپ بن کر جلتا ہے اور آنکھ آنسو بن کر عقیدت کے ہار پھول سے انہیں سجا دیتی ہے ان کی قبر پر ٹھنڈے آنسوؤں کی بارش ہوتی ہے ممی۔"

"بس ہیشم بس اب جاؤ تم ہاتھ لو جا کر، جنید، جواد سب آتے ہوں گے۔" وہ اس طرح کہنے سے یکلخت رک گیا ممی کی آنکھ میں حتمی انداز دیکھا تو بنا کسی حجت کے اٹھ گیا۔

"او کے ممی ایز یو لائک" وہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا تو صبیح چہرے والی ممی کے خال و خد میں تھکن اتر آئی وہ کرسی کی پشت سے سر ٹکائے کسی طویل سفر سے لوٹنے والے مسافر کی طرح ہانپنے لگیں۔

انہوں نے آنکھیں بند کیں تو ان کی نگاہ کے سامنے ایک پر وقار چہرہ گھوم گیا جو ہیشم ولی سے جدا ضرور تھا مگر وہ انہی کا پرتو تھا وہ جب اس گھر میں داخل ہوئیں تو جنید، جواد کے نام ان کے ہمراہ تھے اور ولی امام نے بڑے خلوص سے کہا تھا۔

"میں ان مردوں میں سے ہرگز نہیں ہوں جو عورت کو اس کے ماضی پر ٹیز کرتے ہیں، آپ نے جو زندگی گزاری وہ بہت تلخ تھی، آنسوؤں سے پر، مگر عمرانہ یہ گھر اور اس گھر کی ایک ایک چیز صرف تمہاری ہنسی سننا چاہتی ہے تم جواد، جنید کو اب اپنی ذمہ داری نہیں سمجھو بلکہ سوچو نکاح نامے پر دستخط کے ساتھ یہ بچے میرے لیے بھی اہمیت اختیار کر چکے ہیں مجھے یہ اپنے ہیشم کی طرح عزیز ہیں۔" اور انہوں نے دو سالہ ہیشم کو دیکھا تو انہیں اپنے جواد کی طرح وہ بہت معصوم تنہا اور محبت کے لیے پور پور تڑپتا دکھائی دیا سو انہوں نے جہاں خود کو اس گھر میں جذب کیا تھا وہیں ہیشم ولی کو بھی دل سے لگا لیا تھا۔

زندگی بہت پر سکون گزرنے لگی تھی کہ ایک دن ان کا اکلوتا بھائی جسے انہوں نے والدین کے مرنے کے بعد

ماں باپ بن کر پالا تھا ان کے گھر میں داخل ہوا اس کی حالت مخدوش تھی بہن کی محبت نے جوش مارا تو انہوں نے اسے پھر سے سینے سے لگا لیا ولی امام نے ان کی یہ خواہش بھی رد نہ کی مگر عمرانہ نے خود ہی بھائی سے کہا۔

”یہ جو تم اس نشے کی لت میں گرفتار ہو اسے ترک کرنا ہوگا۔“ اس نے سن کر ہامی بھر لی ولی امام نے اپنے ہی دفتر میں اسے نوکری دے دی عمرانہ ولی امام کے رویے، توجہ، محبت پر دل سے ان کی طرف جھک گئیں مگر جب بھی انہوں نے کامران کو دیکھا نہیں کامران کی آنکھیں سرخ انگارہ لگیں۔ وہ چلتے میں بھی لڑکھڑاتا بالآخر ایک دن انہوں نے ولی امام سے یہی بات کی تو انہوں نے دونوں ہاتھ ان کے کاندھے پر رکھے پھر آہستگی سے بولے۔

”تم بہت سیدھی اور ممتا سے پر ہو عمرانہ وگرنہ جس بھائی نے تمہیں اپنی ضرورتوں کے عوض بغیر تمہاری رضا لیے ساجد کو چند ہزار میں سونپ دیا اسے پھر سے سینے سے نہ لگاتیں میں بہنوں کی طبیعت، فطرت جانتا ہوں کہ دنیا میں اگر بار بار دھوکا اور دکھ کھا کر بھی کوئی ہستی ایک انسان کو پھر سے اپنا سکتی ہے دعا دے سکتی ہے تو وہ یا تو صرف ماں ہے یا ایک بہن۔

”تمہاری مجبوری یہ ہے کہ تم اس کی ماں بھی تھیں بہن بھی، اس لیے جب تم نے اسے قبول کیا میں نے تمہارے جذبوں پر جبراً اپنا حکم نہیں لگایا مگر عمرانہ یہ سچ ہے کہ منشیات جیسی لت میں گرفتار ہو کر کامران عزت نفس سچائی عہد و پیمان کے معنی بھول چکا ہے اب بھی اس کا تعلق بدنام و ناکارہ لوگوں سے ہے وہ اب بھی مارفیا کے انجکشن لیتا ہے اور۔“

”آپ اتنا کچھ جانتے ہیں برداشت کرتے ہیں پھر بھی آپ نے اسے اپنے دفتر میں رکھ لیا اس سے کوئی باز پرس نہیں کی۔“ حیرت سے کہتی عمرانہ صوفے پر ڈھے گئیں تو ولی امام ان کے گرد اعتماد و یقین کی طرح چھا گئے کہنے لگے۔

”وہ مجھے صرف تمہاری نسبت عزیز ہے عمرانہ یقین کرو میں نے زندگی میں اگر کسی کی طلب رکھی کسی چہرے کی پرستش کی تو وہ صرف تم تھیں، میں اول دن سے صرف تمہارا تھا اس لمحے کے بعد بھی جب تم نے محض کامران کے مستقبل کے لیے میرا پرپوزل رد کر دیا تھا میں تمہارا ہی رہا تھا عمرانہ، شازیہ سے شادی تو محض امی جان کی خواہش کے پورا کرنے کے لیے کی تھی مگر وائے ری قسمت کہ شازیہ میری سنگت میں زیادہ دیر چل نہ سکی میں اندر سے صحرا تھا اس حادثے کے بعد باہر تک خزاں رسیدہ درخت ہو گیا۔

اگر ہیثم میری زندگی میں نہ ہوتا تو میں بھی ناتمام حسرتیں دل میں لیے خاک ہو چکا ہوتا تم سمجھ رہی ہو نا عمرانہ میری بات۔“ عمرانہ ولی نے اثبات میں سر ہلا کر ولی امام کو عقیدت سے دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔

زندگی کے دن گزر رہے تھے کہ یکلخت بزنس میں کچھ نقصان ہو گیا تو ولی امام کا تمام اطمینان توجہ صرف بزنس کے لیے وقف ہو گیا جنید، جواد ہیثم کے ساتھ مگن تھے مگر ولی امام کو آج کل کسی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں تھی پھر دو چار بار ایسا ہوا کہ انتہائی اہم کام کرتے ہوئے انہوں نے جنید، جواد کو جھڑک دیا تو عمرانہ کو دکھ سا ہونے لگا۔

بچے تو ناسمجھ تھے وہ پاپا کی جھڑکیاں بھولے پھر سے ان کے گرد ہوتے مگر عمرانہ کو ولی امام کا رویہ بدگماں کرتا چلا جاتا اور وہ دیکھتیں کہ جنید، جواد کو تو ولی امام جھڑک دیتے ہیں ان کی ضد پر بعض اوقات ایک دو ہاتھ بھی لگا دیتے ہیں مگر ہیثم ولی کسی بھی وقت کوئی بھی فرمائش کرتا ولی امام فوراً اس کی خواہش پوری کرتے وہ کہتا تو اپنا سب کام چھوڑ کر اس سے کھیلنے لگتے جواد، جنید بھی اس کھیل میں شریک ہو جاتے مگر ایسے ہر لمحے، وہ زبردستی دونوں بچوں کو بے مصرف پڑھنے بٹھا دیتیں۔

ایک بال کیا آیا دل میں، دل کا آئینہ ہی دھندلانے لگا دل کے آئینے پر خراشیں پڑ گئیں تو مستقبل کی اصل

صورت ذرا دُنے خواب کی طرح نظر آنے لگی وہ دھیرے دھیرے کھنچتی چلی گئیں ولی امام سے، اور پھر ایک بار کامران سے انہوں نے اپنے خدشے کا کیا اظہار کیا اور اپنی فطرت کی بدولت اس نے ایسی ایسی دل ہلا دینے والی داستانیں سنا ڈالیں کہ عمرانہ ولی کا دل لرز اٹھا یک دم سے ہی انہیں جواد، جنید کا مستقبل شدید خطرے میں دکھائی دینے لگا۔

ولی امام نے ان کے بدلے تیور دیکھے تو حیرت سے سبب پوچھا انہوں نے کتنی ہی دیر بعد اپنے خدشے اپنی بدگمانی ان کے سامنے کہہ دی انہوں نے سنا تو ہنس پڑے کہنے لگے۔

”کامران کو تم جانتی ہو نا، پھر اس کی باتوں میں کیوں آ جاتی ہو۔“

”مگر اس کی باتیں اتنی غلط بھی نہیں آپ کا اپنا رویہ ان خیالات کو تقویت دیتا ہے۔“ انہوں نے مضبوط انداز میں انہیں دیکھا ولی امام صوفے پر بیٹھ گئے پھر آہستگی سے بولے۔

”ہیثم کے ساتھ تم جس رویے کے بارے میں بات کر رہی ہو عمرانہ، وہ عین فطرت ہے وہ دونوں میں چھوٹا ہے کمال ہے جنید، جواد یہ چھوٹی سی بات جانتے ہیں مگر تم...... نہ جانے کہاں کہاں کے وسوسے لے کر بیٹھ گئی ہو اچھا دیکھو آئندہ میں لاکھ مصروف رہوں مگر جواد جنید کو بھی انصاف سے ٹائم دوں گا، اب تو ہنس دو یار۔“ انہوں نے دنیا جہان کی شوخی بھر کر عمرانہ ولی کو دیکھا تو فی الحال تو وہ مسکرا دیں مگر کامران کی بتائی ہوئی بات کی تمام پراپرٹی بزنس ہیثم ولی کے نام ہے پریشان کر گئی مگر ان کے ہونٹوں پر یہ خدشہ ابھر کر شکوہ یا سوال نہیں بن پایا انہیں یہ بات معیوب لگی کہ وہ شوہر کے سامنے اس کی بات کا ذکر چھیڑیں سو وہ چپ ہی رہیں۔

پھر جواد، جنید بالترتیب بی اے اور ایف اے میں تھے ستارہ سکس اور ہیثم میٹرک میں تھا کہ اچانک ولی امام کی جیپ حادثے کا شکار ہو گئی۔ انہیں ہاسپٹل پہنچایا گیا مگر وہ کچھ کہے سنے بغیر ہی بچھڑ گئے۔ جنید، جواد آنکھوں میں آنسو لیے روتے رہے مگر ہیثم ولی نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

”پاپا میرے پاپا۔“ ہیثم کو روتا دیکھا تو ستارہ نے بھی بلکنا شروع کر دیا ستارہ اور ہیثم کسی سے سنبھالے نہیں جا رہے تھے جب جواد بھائی نے بڑھ کر بڑے بھائیوں والے مان بھرم سے انہیں اپنے سینے سے لگا لیا پھر ولی امام کا چہلم تھا جب ان کے وکیل نے ان کی وصیت پڑھ کر سنائی اور اس دن عمرانہ ولی کو کامران کی ہر بات سچی لگی، تمام جائیداد، بزنس ہیثم ولی کے ہی نام تھا وکیل کو اس کا گارجین مقرر کیا گیا تھا کامران نے وصیت سنی تو عمرانہ کو استہزائیہ انداز میں دیکھا اور کہا۔

”تمہاری بے عزتی کرنے کے باوجود میں آج بھی تمہارا ہمدرد ہوں، آپا دیکھا میرا ایک ایک خدشہ درست نکل رہا ہے اب تم دیکھنا یہ وکیل تمہیں اور تمہارے بچوں کو کیسے دھکے دے کر اس گھر سے نکالتا ہے، بھلا اسے یا اس ولی امام کی اولاد کو تم سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔“ کامران کی بات سن کر امید ہیثم سے انہوں نے [illegible] لیکن“ [illegible] غصے گیا۔

”تم اپنے اس خوابوں کے محل سے نکلو آپا یہ زمانہ اپنا حق چھیننے کا زمانہ ہے اس ولی امام کو تم سے اگر محبت یا ہمدردی ہوتی تو وصیت میں وہ تمہارا مستقبل بھی محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا مگر دیکھا اتنے برس بعد بھی کیا نتیجہ نکلا اسے تو اس گھر اور اپنے بچوں کے لیے ایک پارٹ ٹائم آیا کی ضرورت تھی سو وہ تم نے پوری کی آگے تم در در کی ٹھوکریں کھاؤ یا فاقے کرو اس سے اس کو کیا مطلب“

"تم بکتے ہو کامران۔" انہوں نے چیختے ہوئے کتنی دیر بعد کامران کی ہر بات جھٹلانے کی کوشش کی مگر انہیں اپنا لہجہ خود اتنا اجنبی، اتنا کمزور لگا کہ وہ مزید ایک لفظ نہ کہہ سکیں۔ جواد نے ان سے خدشہ سنا تو کہا۔

"آپ بھی کن کی باتوں میں آ گئی ہیں ممی، ماموں جی کو تو بس مارفیا کے انجکشن اور خوابوں کی جنت کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا انکل حفیظ الرحمٰن سے میری بات ہوئی تھی انہوں نے ہی مجھے بتایا کہ یہ وصیت بہت پرانی ہے شاید آپ سے پہلے کی پھر جب ہم یہاں آئے تو پاپا نے نئی وصیت کی ضرورت محسوس کی کچھ عرصے پہلے انہوں نے تمام کاغذات پھر سے تیار بھی کروائے تھے مگر پاپا بزنس کی مصروفیتوں میں کچھ اس طرح الجھے تھے کہ ان کاغذات پر دستخط نہیں کر سکے یہ دیکھیے میں انکل سے نئی وصیت لے آیا ہوں پڑھ لیجیے اس میں پاپا نے ہر بچے کا خیال رکھا ہے آپ کو سب بچوں کا گارجین بنایا ہے۔"

"مگر جواد یہ ہمارے اب کس کام کی ہے۔"

"کسی کام کی نہیں مگر ممی آپ کے خدشے اور شکوہ کا جواب تو ہے نا یہ پاپا نے جانتے بوجھتے جس طرح ہمیں محبت دی سینے سے لگایا ممی اس کی مثال کہیں ملتی ہے یقین کریں پاپا ہی میرا آئیڈیل تھے ممی اور اب جب کہ وہ ہم میں نہیں تو اس گھر کو پوری ذمہ داری سے چلانا میرا فرض اولین ہے، مجھے اس خارزار راہ کے لیے آپ کی دعاؤں ممتا اور تجربے کی ضرورت ہوگی آپ میرا ساتھ دیں گی ناں، کہیں ممی آپ میرے ساتھ ہیں۔"

ممی نے اپنے بیس سالہ باعزم بیٹے کو دیکھا دل چاہا اس کی ایک ایک بات پر ایمان لے آئیں لیکن کامران نے کچھ اس طرح سے ان کا ان کی سوچوں کا احاطہ کر لیا تھا کہ وہ خود سے کوئی فیصلہ نہ کر سکیں اور اپنے خدشات کے تحت بدگمانیوں کے رستوں پر چلتی چلی گئیں۔

بیشم، جواد، جنید اور ستارہ کی محبتوں میں پروان چڑھتا رہا ممی کی محبت سرد مہری کے ملے جلے امتزاج کے ساتھ اس کا حاصل رہی اور وہ اسی محبت سے اپنی زندگی سنوارتا۔ یہاں تک کہ اس کے رنگوں نے ایک راہ اپنائی وہ جو تصویر بناتا شاہکار میں ڈھل جاتی اور یار دوست کہتے۔

"اتنی شدید محبتیں تیرے ہمراہ ہیں پھر بھی تو پیاسا کیوں ہے۔" وہ ہنستا خاموش رہتا بالکل آج کی طرح۔

"کس قدر عجیب سا دکھ رچ گیا ہے اس میں، منہ سے کچھ نہیں کہتا مگر یہ دکھ اس کے ہر مسام سے آنسو کی طرح بہتا ہے۔" ممی نے آنکھیں کھولیں، تو وہ خود سے بہت زیادہ شکوہ کناں تھیں مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے خلاف کوئی محاذ بنا لیتیں ستارہ نے آ کر ان کے گلے میں بانہیں حمائل کر دیں۔

"واؤ ممی اتنی خوبصورت رہی آج کی پارٹی کیا بتاؤں، پتا ہے نجمہ اتنی کیوٹ لگ رہی تھی کہ نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ ممی بہت ہینڈسم شریک سفر ملا ہے اسے بالکل چاند سورج کی جوڑی ہے۔"

ممی کتنی دیر تک ساکت نظروں سے اسے دیکھتی رہیں، پھر کافی دیر بعد انھیں تو انہیں محسوس ہوا جیسے ان کے قدم اور زندگی پہلے سے زیادہ بوجھل ہے پھر وہ تھیں وہی ان کا کمرہ اور شام ان کے پلو سے بندھی ان کے ہمراہ سسکتی رہی۔

دوسری صبح بہت خوشگوار تھی سمرہ کو یونہی لگ رہا تھا جیسے آج کا دن اسے خصوصی طور پر مسکراتا ہوا ملنے آیا ہو وہ بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گئی تو سامنے ہی لگی تصویر نے ایکدم سے پھر سے اس کی توجہ سمیٹ لی، اس اگزیبیشن کے ایک ایک لمحہ

کی روداد پھر سے حافظے میں گھوم گئی کل وہ کمرے میں آ کر کتنا الجھی تھی تصویر پر ہیشم ولی پر۔

للی کا خیال تھا ہیشم ولی خواہ مخواہ خود کو پوز کرتا ہے ورنہ اتنی ڈیسنٹ شخصیت نہیں ہے ایسی کیا خاص بات ہے اس میں، عام سے خال و خد تھوڑا سا فیئر رنگ ہاں البتہ چہرے میں کچھ چھائی ہوئی ہیں تو وہ ہیں سبز آنکھیں اور کیا ہے، ہاں کچھ مصوری کا ہنر ضروری ہے یقین کرو سمرہ ڈیئر ہیشم ولی میں اگر کوئی چارم ہے تو وہ اس کی شخصیت کا یہی پہلو ہے وہ چھپ کر پر اسرار رہنا بھی چاہتا ہے اور دل کا حال چہرے پر چسپاں بھی کیے رکھتا ہے۔

”کیا مطلب للی ڈیئر۔“ اس نے آنکھیں پٹپٹائیں اور للی نے جواباً آنکھیں بند کر کے کہا۔

”مطلب یہی کہ اس کا ہیڈک محبت ہے، ہو گی کوئی وجہ اتنے ملال کی، مگر مجھے ایسے لوگ قطعاً اچھے نہیں لگتے، جو اپنے دکھوں، محرومیوں کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں یہ دکھ کی زبان میں پینٹ کی ہوئی تصویریں کیا ہیں اس کے اندر کا کرب لیکن اگر وہ اپنے اس کرب کو چھپا لینا جانتا تو آئی سویئر اس کی شخصیت میں اس سے کہیں زیادہ چارم ہوتا۔

جیسے خوشی ہمارے چہرے پر رنگ بکھرا دیتی ہے نا اسی طرح سچا دکھ ہمارے لیے روگ نہیں امرت بن جاتا ہے ہمارے اندر وہ دریچے بند دروازے بھی کھول دیتا ہے جو ہم بند کیے بیٹھے ہوتے ہیں۔ درحقیقت ہم انسانوں میں اوپری طور پر پرتیں ہوئی ہیں ناں بالکل اسی طرح ہمارے اندر بھی ہزاروں پرتیں ہیں ابھی ہم نے اپنے اندر کا گیان حاصل نہیں کیا سمرہ ورنہ ہم محض اس وجود میں جینے، مرنے کو ہی سب کچھ نہیں سمجھتے وجود کیا ہے ایک دیوار، بات تو تب ہے کہ ہم اس دیوار کے اس طرف کا کھوج بھی لگا لیں اور ہماری سانسیں بھی نہ پھولی ہوں اور ماتھے پر دکھ کی کوئی لکیر بھی نہ ہو۔

”للی میری جان جس طرح باقی لوگ اس طرح نہیں سوچتے تم بھی مت سوچا کرو دیوار کے اس طرف کیا ہے اسے چھوڑو اس طرف دیکھو اس طرف یہ سب ہے میں، پاپا، انکل ظفر اور ذہیر ساری محبت۔“

”محبت! سمرہ یہ محبت ہی تو ہمیں آگے تک سوچنے نہیں دیتی ہم ایک ذرہ پر اکتفا کر لیتے ہیں جب کہ ایک جہاں ہے جو ہماری کھوج کا انتظار کر رہا ہے۔“

”مگر ہمیں اس کھوج سے ملے گا کیا؟“

”بہت کچھ یا شاید کچھ بھی نہیں لیکن سمرہ کہتے ہیں کچھ نہ سوچنے کے مقابلے میں کچھ سوچ کر غمگین ہونا زیادہ بہتر ہے، کیونکہ پہلی صورت میں صرف ہم وقت ضائع کرتے ہیں دوسری صورت میں ہمارے پاس مارجن ہوتا ہے کہ ہم جس بات پر غمگین ہیں اس سے نکلنے کی اسٹرگل کرتے ہیں۔“

”کرتے ہوں گے مگر بات تو ہیشم ولی تھی مگر للی ظفر اور تم جانے کہاں لے گئیں۔“

”کہاں لے گئی...... سیدھی سی بیان کر دی ہیشم ولی بھی تو انسان ہے نا اس لیے! اسے اس طرح ڈسکس کر لیا اس کی پرابلم بھی یہی ہے دراصل اسے بھی دیوار کے اس طرف کی کشش کھینچ رہی ہے مگر وہ ابھی ٹھیک طرح سے اپنی احتیاج سمجھا نہیں ہے اور یہی احتیاج جو اس کے رنگوں میں محبت کی پیاس کی طرح چھائی ہوئی ہے جس دن وہ یہ سمجھ گیا، اس کی تصویر میں ہر شکوہ ختم ہو جائے گا اور اس کا دکھ اس کی پیشانی اس کے وجود کے گرد ہالے کی طرح چمکنے لگے گا سمجھیں کچھ مری نا سمجھ بہن۔“ اور وہ پوری طور پر سمجھی تو نہیں مگر اثبات میں سر ضرور ہلا بیٹھی۔

اور اس وقت بیٹھی وہ پھر سے تمام باتوں کو دوہرا رہی تھی کسی سبق کی طرح اسے للی بے طرح یاد آ رہی تھی

جانے کیوں، اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔

"پاپا تو دفتر چلے گئے ہوں گے۔" وہ سوچتی ہوئی ابھی باتھ لے کر باہر نکلی تو اپنے بیڈ پر للی کو دراز پایا۔

"خیریت ......" وہ بالوں کو تولیے سے خشک کرتی آگے بڑھی ہولے سے اس کا رخسار تھپتھپایا تو تیزی سے واپس ہاتھ کھینچ لیا۔

"للی تمہیں ٹمپریچر ہو رہا ہے کل تو تم اچھی بھلی تھیں۔" وہ اسے ہلانے لگی تو اس نے بدقت آنکھیں کھولیں پھر ذرا سا مسکرائی۔

"آج ایک اور انجوائمنٹ کا چکر ہے یار۔"

"انجوائمنٹ! تمہارا دماغ ٹھیک ہے کتنا تیز بخار ہو رہا ہے تمہیں۔"

"ہو رہا ہے یقیناً ہو رہا ہے مگر سمرہ ڈیئر سردی گرمی کی طرح بخار بھی تو ایک لحاتی موسم ہے مجھے نہیں سمجھ آتا لوگ اس بیماری سے اتنا گھبراتے کیوں ہیں۔"

"او مائی گاڈ، شاید بخار تمہارے سر پہ چڑھ رہا ہے۔" وہ واقعی گھبرا گئی اور اٹھ کر کھل کھلا کر ہنسنے لگی۔

"بیماری کوئی بھی ہو سمرہ ڈیئر انسان کے لیے اسپیڈ بریکر کا کام دیتی ہے۔ جو انسان اپنی صحت، اپنی امارت اپنی ذہانت سے ساری دنیا کو تہہ و بالا کرتا رہتا ہے، کرتے رہنے کا پلان بناتا ہے تم نے دیکھا ہوگا انہیں بھی یہ معمولی سا بخار فلو، اپنی حیثیت مان لینے پر اکساتا ہے سو میں نے کہا بخار میں بھی ایک فرصت ہے کہیں ٹیس اٹھے تو یہ خیال اندر زندہ رہتا ہے ناں کہ ابھی ہم زندہ ہیں اور......"

"اور یہ کہ تم خاموشی سے لیٹ جاؤ میں ابھی ڈاکٹر رشید کو بلاتی ہوں۔"

"بکومت یہ ڈاکٹر رشید ہارٹ سرجن کہاں سے بخار میں ٹپک پڑے۔"

"بس وہ ایسے موقعوں پر ہی ٹپک پڑتے ہیں فیملی ڈاکٹر ہیں ہمارے ہر قسم کی بیماری کا علاج جانتے ہیں وہ۔"

"خاک جانتے ہیں ڈاکٹر رشید کون سا سب ڈاکٹروں سے مختلف ہوں گے یہ سب ڈاکٹر وہی جانتے ہیں ناں جو انہوں نے کتابوں میں پڑھ رکھا ہے مگر سمرہ ڈیئر انسان میڈیکل کی چند تھیوریز مفروضوں کے بس کی بات نہیں ہے، یہ تو ایک بے کراں خیال ہے جو کسی نے سوچا اور اسکیچ کر کے اس جہان رنگ و بو میں چھوڑ دیا بھٹکنے کو تڑپنے کو۔"

"بس بس اپنے آپ کو زیادہ مفکر ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ نہ تمہاری شکل انٹلیکچول لوگوں سے ملتی ہے نا مفکرز کی جماعت سے تم آرٹسٹ لڑکی ہو آرٹسٹ ہی رہو جو سوچو بس اسے برش سے کینوس پر ابھارو لایعنی باتوں، خیالات کے چکر میں پڑ کر خود کو ضائع مت کرو کیونکہ بعض اوقات خیالات اتنی اہمیت نہیں رکھتے جتنی یہ بات کہ ہم نے کس خیال سے کیا سیکھا۔"

"میں سیکھنے کے عمل سے ہی تو گزر رہی ہوں یار بلکہ ہر شخص تمام عمر سیکھنے کے عمل سے ہی گزرتا رہتا ہے جو لوگ کہتے ہیں ہم اس کام میں حرف آخر ہو چکے ہیں وہ اور ان کا فن یا ہنر اسی لمحے ہی میں منجمد ہو جاتا ہے اور منجمد چیز نہ دماغ کو تازگی دیتی ہیں، نہ دل کو لذت یہ اور بات کہ کوئی برف کھانے کا پرانا شوقین ہو۔" وہ اپنے بال درست کر کے پھر سے شوخ ہو گئی تو سمرہ نے دراز میں موجود تھرما میٹر کو ہاتھ میں لے کر جھٹکنا شروع کر دیا۔

"منہ کھولو۔" اس نے حکم دیا تو وہ بلبلا گئی۔

"کتنے افسوس کا مقام ہے ایک بالشت کا چھوٹا سا آلہ ایک اچھے بھلے انسان کے اندر کے موسم کی پول کھول دیتا ہے۔"

"ہوں ٹھیک کرتا ہے تم جیسے اچھے بھلے انسان اس کے بغیر اپنے اصل موسم کسی پر آشکارا بھی تو نہیں کرتے۔" اس نے کہتے ہوئے زبردستی منہ میں مخصوص زاویے سے تھرمامیٹر لگا کر رسٹ واچ پر نظر ٹکا دی۔ تو جواب دینے کے لیے وہ بے چین نظر آنے لگی۔

"خاموش بیٹھو۔" اس نے ڈانٹ دیا پھر تھرمامیٹر لے کر دیکھا تو حیرت کی زیادتی سے چیخ پڑی۔

"او خدا کی بندی اتنا تیز بخار ہے تجھے اور تو آسٹن دوڑاتی آئی ہے، لُلی جھٹکے دے دے کر مار دے گی مجھے کیا۔" اس نے سنا تو مخصوص انداز میں ہنستی رہی پھر بولی۔

"آج کل انسان کی بیماریوں نے بھی ترقی کرنی شروع کر دی ہے یار، پہلے لوگ سو فارن ہائیٹ پر ہی آہیں بھرنے لگتے تھے مگر اب ایک سو دو اور تین یہ تو ایک نارمل سے صرف ایک آدھ ڈگری بلند ٹمپریچر ہے۔"

"تیری نظر میں ہوگا، کسی ڈاکٹر نے سن لی نا تیری یہ باتیں، تو سر دھن لے گا اور کہے گا میں نے خوامخواہ اس دشت کی سیاحی میں اتنی عمر خوار کی، شروع ہی سے لُلی ظفر کی شاگردی اختیار کر لیتا تو اب تک کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوتا ویسے اس "کہاں" میں جیل اور عدم دونوں آتے ہیں۔"

"مگر جنت بھی تو "ج" سے ہے نا سمرہ ڈیئر۔"

"ہے مگر...... لُلی جانے تو کس مٹی سے بنی ہے، ہاتھ ہی نہ آتی چکنی مچھلی کی طرح پھسل جاتی۔"

"شاید اس لیے کہ میری ممی نے پیراکی میں کئی گولڈ میڈل جیت رکھے ہیں کیا سمجھیں۔" وہ اثر لیے بغیر بولے گئی پھر بیڈ سے اٹھ کر جوگرز کے تسمے باندھنے لگی سمرہ آرام کا کہتی رہ گئی مگر اس نے سنا ہی نہیں بلکہ اس کی وارڈ روب سے اپنی پسند کا ڈریس نکال کر بیڈ پر ڈال کر کھڑی ہو گئی۔

"شام کو یہ کپڑے پہن کر تیار رہنا کیونکہ شام کو ایک ہوٹل میں شام غزل منائی جا رہی ہے بڑے بڑے گلوکار آ رہے ہیں جب آؤں تو تیار ملنا۔" وہ کہہ کر چلنے لگی تو سمرہ نے کلائی تھام لی پھر جھنجلا کر بولی۔

"یہ سب کچھ کہنے کے لیے دوڑے چلے آنے کی کیا ضرورت تھی فون کر دیا ہوتا۔" اس کی بات سن کر وہ ذرا مسکرائی پھر بولی۔

"ناشتے کے ساتھ جب تک تھوڑا سا فلسفہ نہ کھا لوں مزا نہیں آتا پاپا ویسے ہی فلسفے سے الرجک ہیں ایک تم ہو جو بک بک کو سن لیتی ہو سو ناشتہ ہضم کرنے کے لیے یہاں دوڑی چلی آئی۔"

"بکو مت تم ہمیشہ اصل بات گول کر جاتی ہو لُلی، کہنے کچھ آتی ہو کہہ کچھ جاتی ہو اور دل کو کچھ اور کہہ کر سمجھا لیتی ہو۔" اس نے پھر سے اس کے اوپر لفظوں کا جال پھینکا تو وہ پھر دور جا کر کھڑی ہوئی۔

"اس طرح پکڑنے کی کوشش کی نا تو تجھ سے بھی دوڑتی جائے گی میری جتنا بتاتی ہوں صرف اتنا سنا کر اپنی طرف سے مت کھوجنے لگا کر۔" اس کے لہجے میں سرد مہری آئی تو سمرہ بے کل ہو گئی۔

’’او کے بابا او کے مجھے تجھ سے غرض ہے تیرے خیال کے بیچ سے نہیں ویسے انکل دفتر چلے گئے کیا۔‘‘

’’چلے گئے ہوں گے۔‘‘

’’کیا مطلب اپنے پاپا کے متعلق تمہیں کچھ نہیں پتا۔‘‘

’’ظاہر ہے ضروری تو نہیں ہر کوئی اپنے پاپا کے متعلق اتنی خبریں رکھے جیسے تم سو جس طرح پاپا کو میری خبر نہیں ہے اسی طرح میں نے پاپا کی خبر رکھنا چھوڑ دی ہے، سمرہ ڈیئر خوامخواہ فائدہ بھی کیا ہے کسی کو اس رشتے سے جکڑ کر رکھنے کا جس کی کوئی اہمیت نہیں۔‘‘

’’انکل ظفر اب ایسے بھی نہیں ہیں للی پرسوں ہی تم لیٹ گھر گئیں تھیں تو ان کا گھبرایا ہوا فون آیا تھا کہ للی یہاں تو نہیں آئی پریشانی ان کی آواز سے ظاہر تھی۔‘‘

’’اچھا مگر غالب انکل نے تو ایسے موقعوں کے لیے کچھ اور کہہ رکھا ہے۔‘‘

’’کیا مطلب۔‘‘ اس نے حیرت سے اسے دیکھا وہ جذباتی بچے سے کس قدر دور بھاگتی تھی۔

’’یعنی سمرہ ڈیئر خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا۔‘‘

’’بائی گاڈ یہ فون والی بات سچ ہے للی۔‘‘

’’کیسے مان لوں تم سے زیادہ میں جانتی ہوں نا اپنے پاپا کو ان کے سامنے صرف کرنسی نوٹوں کی اہمیت ہے اور میں۔‘‘ اس کی آواز بھرانے لگی تو وہ پھر ہنس پڑی اور اسے شام کا پروگرام یاد دلاتی آگے بڑھ گئی۔

سمرہ کتنی دیر تک اس کی شخصیت کے اسرار پر سوچتی رہی پھر ہوش و خرد میں آئی تو جلدی جلدی لان کے شلوار سوٹ پر چادر نما دوپٹے کو سنبھالتی بالوں میں برش پھیرتی جوتی پیروں میں پھنساتی ڈائننگ روم میں پہنچی ناشتے کے ساتھ ساتھ اخبار بھی پڑھتی جا رہی تھی پھر ایکدم جیسے اچانک کوئی خوشی ملتی ہے وہ مجسم خوشی میں ڈوب گئی۔ ناشتا چھوڑ کر اس نے جلدی جلدی دو کالمی خبر پڑھی تصویر کو پھر سے غور سے دیکھا پھر آہستگی سے اخبار کے دفتر فون کرنے لگی۔

’’میں گولڈن ایرو کی اسسٹنٹ ڈائریکٹر بات کر رہی ہوں. جی آنسہ سمرہ عمیر، مہربانی کر کے مجھے ان کا پتا ہر صورت میں دے دیجیے مشکور رہوں گی۔‘‘ لجاجت سے کہہ کر وہ چپ ہوئی پھر ریسیور دائیں سے بائیں منتقل کرتے ہوئے بولی۔

’’جی لکھوائیے۔‘‘ اس کا قلم تیزی سے چل رہا تھا پھر وہ رکی اور اخبار کے ایڈیٹر کا شکریہ ادا کر کے ریسیور اس نے کریڈل پر واپس رکھ دیا ملازم نے اس کے کپ کو پھر سے گرم چائے سے لبریز کر دیا تو اس نے پوچھا۔

’’پاپا میرے لیے کوئی پیغام چھوڑ کر تو نہیں گئے بابا نصیر۔‘‘

’’جی آج میری ان سے بات نہیں ہوئی لیکن ٹھہریے شاید افضل کچھ جانتا ہو بھیجتا ہوں اسے۔‘‘ وہ اثبات میں سر ہلا کر ادھورا ناشتا پورا کرنے لگی افضل اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تو اس نے اخبار ایک طرف ڈال کر اس کی طرف توجہ کی اور وہ ٹیپ کی طرح چل پڑا۔

’’جی ہاں بڑے سرکار آپ کے لیے کہہ گئے تھے کہ جب آپ جاگیں تو آپ کو بتا دیا جائے کہ آج کوئی خصوصی میٹنگ ہے اور سائٹ پر بھی کچھ کام ہے۔‘‘

’’ہوں ٹھیک ہے۔‘‘ بیگ سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی پھر تیار ہو کر دفتر پہنچی تو پاپا کو اپنی مخصوص ریوالونگ چیئر پر

جھولتے پاپا وہ پین ہونٹوں سے لگائے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔

"ہیلو پاپا کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" وہ ٹیبل پر بیگ رکھ کر ان کے قریب جا کر آہستگی سے مخاطب ہوئی پاپا نے جھٹکے سے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور سمرہ کو لگا جیسے پاپا کی آنکھوں کا سکوت اس کے دل میں پھیلتا چلا گیا ہو۔

"پاپا کیا ہوا؟" اس نے گھبرا کر پاپا کے دائیں ہاتھ کو ہاتھ میں لے کر بے قراری سے پوچھا مگر پاپا کچھ کہے بنا بس اسے دیکھے گئے۔ پاپا اس نے ہولے سے ان کا شانہ ہلایا تو انہوں نے طویل سانس کھینچ کر کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا پھر بولے۔

"آج بہت خوش ہے ہمارا بیٹا کیا وجہ ہے سمرہ؟" اور وہ صاف مکر گئی جانتی تھی اگر اس نے اپنی خوشی کا راز کھولا تو پاپا پھر سے اس سے خفا ہو جائیں گے کہ شروع سے وہ اس نام سے جانے کیوں الرجک تھے سمرہ کو پتا نہیں تھا کہ اس کے پاپا جتنا اس نام سے دور بھاگتے تھے اتنا ہی اس کا دل اس نام کی طرف کیوں کشش کرتا تھا۔

اسے بچپن کے وہ دن یاد آنے لگے جب اسکول گیٹ پر وہ صبیح چہرہ اس سے ملنے آتا ڈھیر ساری چاکلیٹ بسکٹ وغیرہ کے ساتھ اور وہ اسے منع کر دیتیں اپنے متعلق پاپا کو بتانے سے وہ پوچھتی۔

"مگر میڈم میں پاپا کو آپ کے متعلق کیوں نہ بتاؤں۔" تو وہ کہتیں۔

"میں یہ صرف اس لیے چاہتی ہوں کہ تمہارے پاپا کو پتا چل گیا نا تو وہ تمہیں پھر ملنے نہیں دیں گے۔"

"مگر کیوں میڈم۔" وہ پونی ہلا کر پوچھتی تو وہ اس کی پیشانی چوم لیتیں اور کہتیں۔

"ہو سکتا ہے تمہارے پاپا یہ پسند نہ کریں کہ تم سے ان کی غیر موجودگی میں کوئی غیر ملے پھر آج کل اخباروں میں بچوں کے اغوا کی خبریں بھی تو بہت چھپتی ہیں نا۔"

"ہو سکتا ہے تمہارے پاپا سمجھیں کہ میں......" اور کم عمر سمرہ جمیر نے یہ بات اپنے وژن اور سچائی کی وجہ سے بہت جلد مان لی اب میڈم اس سے ملنے آتیں تو وہ دانستہ پاپا سے اس ملاقات کو چھپاتی مگر کب تک بس ایک دن پاپا نے دیکھ لیا تو آسمان سر پر اٹھا لیا۔ کتنی دیر تک وہ ان خاتون سے جھگڑتے رہے پھر اسے سینے سے لگا کر بولے۔

"اب تم میڈم سے مت ملنا بے بی ورنہ وہ تمہیں مجھ سے چھین لیں گی۔" مگر اسے کیا کیا جاتا کہ پاپا کی ہزار تنبیہ پر بھی اس میں ان کے نام کا چراغ ہمیشہ جلتا رہا وہ اس چہرے کے تمام نقوش حفظ کیے رکھتی پاپا نے ملنے سے روکا پھر نہیں ملی مگر ان کے معاملات سے باخبر رہنے میں بھلا کیا قباحت تھی وہ کوشش کرتی رہی۔

پھر پتا چلا میڈم وہ شہر چھوڑ گئیں تو اس کی شخصیت کا یہ دریچہ بند ہو گیا مگر آج کی یہ دو کالمی خبر کہ میڈم پھر سے اس شہر میں لوٹ آئی ہیں سوشل ورک کے ساتھ ساتھ وہ آرٹ اسکول بھی کھولنے کا ارادہ رکھتی ہیں کافی مشہور و معروف لوگوں کے نام تھے جنہوں نے ان کے اعزاز میں یہ شام منائی تھی اور اس نے پہلی فرصت میں ان سے ملنے کا سوچا تھا اب تو وہ بڑی ہو گئی تھی اس لیے میڈم اب اسے اغوا تو نہیں کر سکتی تھیں سو پاپا کا یہ خیال اور خوف بھی اب دور ہو جانا چاہیے تھا۔

"سمرہ میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے؟" پاپا نے اس کے چہرے کے سامنے ہاتھ لہرایا تو وہ شرمندگی سے ہنستی ہوئی کرسی قریب کھینچ کر بیٹھ گئی پھر اشتیاق سے بولی۔

"آج آپ نے صبح کا اخبار پڑھا پاپا؟"

"ہوں ہمیشہ کی طرح مگر آج ہی کیا خاص بات تھی اخبار میں، مجھے تو وہی سب کچھ دکھائی دیا تھا جو روز ہوتا ہے وہی قتل غارتگری اغوا، ڈکیتی، دہشت گردی اور چند سیاسی بیانوں کے علاوہ تھا ہی کیا اخبار میں جو ٹائم ویسٹ کرتا۔" اس نے غور سے دیکھا پاپا تو ایک ایک سطر کو پڑھنے والے لوگوں میں تھے چہ جائیکہ وہ اخبار ہی کو فضول گردان رہے تھے تو کیا۔ پاپا آج بھی اس نام سے الرجک ہیں۔ اس نے سیکنڈوں میں سوچ کر اصل بات بتا دینے کا ارادہ ترک کر دیا پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

"آج شام للی کے ساتھ شام غزل اٹینڈ کرنی ہے اور اصل خوشی کی بات یہ ہے کہ اس میں میرے پسندیدہ گلوکار بھی مدعو ہیں بہت عرصے سے ان سے ملنے، انہیں قریب سے دیکھنے کی جستجو تھی بس اس لیے خوش تھی۔" اس نے کہہ کر یوں دیکھا جیسے سکوت کی زبان میں پوچھنا چاہ رہی ہو۔ کیا یہ بات خوش ہونے کے لیے کافی نہیں۔

مگر پاپا نے اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی نگاہیں ہٹا لیں بنا کچھ کہے آہستگی سے فائل کھول کر بیٹھ گئے گارمنٹس فیکٹری کے لیے طے ہو جانے والا پروگرام کو ڈسکس کرنے لگے مگر سمرہ کو لگا جیسے بولتے بولتے ان کی آنکھوں میں نمی پھیلتی جا رہی ہو لہجے میں انجانا سا دکھ لہریں مار رہا ہو مگر وہ تمام تر کوشش سے خود کو مطمئن ظاہر کر رہے تھے۔

"پاپا آپ مجھے کچھ ڈسٹرب لگ رہے ہیں کچھ دنوں کے لیے آرام کیوں نہیں کر لیتے، آپ۔" اس نے غور سے دیکھا تو پاپا کی تھکن پھر سے اس پر خوف کی طرح حاوی ہونے لگی پاپا نے اسے دیکھا پھر جانے مسکرائے یا روئے اور بولے۔

"اپنے بیٹے کے ہوتے ہوئے میں نہ ڈسٹرب ہو سکتا ہوں نہ تھکن کا شکار، ہمارا بیٹا تو ہماری توانائی ہے نا بھئی مانو تمام تھکن اس چہرے کو دیکھ کر ایکدم ہوا ہو جاتی ہے۔" پاپا نے اس کی تھوڑی اوپر کرتے ہوئے جذب سے کہا تو تفاخر سے بولی۔

"جب آپ کو اپنے بیٹے پر اتنا مان ہے تو پاپا خود کو فضول سوچوں کا شکار مت کریں آپ کا یہ بیٹا آپ کے قدموں سے ہر خار چن لے گا۔"

"مجھے تم پر ایسا ہی اعتماد ہے سمرہ۔" اس کا کاندھا تھپتھپا کر سر جھکائے وہ کام میں لگ گئے۔

سات بجنے میں صرف بیس منٹ تھے جب وہ گھر پہنچی للی نے ٹھیک سات بجے کا وقت دے رکھا تھا اور للی ہر معاملے میں لاابالی تھی مگر ٹائم کی وہ سخت پابند تھی۔ سو وہ تیزی سے ہاتھ چلا رہی تھی پھر لمبی سی چٹیا میں ڈھیلے سے بل ڈال کر وہ لمبے لمبے آویزے پہننے لگی تو اچانک پشت پر تیز سیٹی کی آواز سنائی دی، وہ تیزی سے مڑی للی نیوی بلیو جینز پر کالے چیک کی شرٹ پہنے ہمیشہ کی طرح خوبصورت لگ رہی تھی۔ مگر للی پر اسے سراہنے کا بھوت سوار تھا اس لیے وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔

"دیکھا بزرگ ٹھیک کہتے ہیں جس کا کام اسی کو ساجھے اب اگر میں یہ کرتا شلوار اور چنا ہوا دوپٹہ پہن کر یہ آویزے پہن لوں تو کس قدر آکورڈ سا لگے گا درحقیقت سمرہ تمہارے یہ لمبے بال ہیں نا آئی لائک اٹ یار بس آگے کیا کہوں تم واقعی بہت اچھی لگ رہی ہو۔"

"اچھا" اس بے یقینی کے انداز میں کھسے پیروں میں ڈالے اور پھر جب پازیب کی چھن چھن چلتے ہوئے

اس کے ایک ایک قدم پر نثار ہونے لگی تو للی نے سر دھن لیا۔

"واہ واہ کیا ردھم ہے یار سمرہ آج واپس آ کر نظر اتروا لینا کیوں کہ آج لوگ غزل سنیں گے کم غزل کو مجسم دیکھیں گے زیادہ۔"

"فضول مت بکو۔" اس نے جھڑکا تو وہ ہنستی ہوئی کار کی طرف بڑھ گئی پھر جب وہ ہوٹل پہنچے تو موسیقی کا پروگرام شروع ہو چکا تھا۔

"کہیں میرے پسندیدہ گلوکار آ کر چلے نہ گئے ہوں۔" اس نے خدشہ ظاہر کیا تو اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے گاڑی پارک کی پھر بولی۔

"ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی، ہم پروگرام کے شروع ہونے سے صرف دس منٹ لیٹ پہنچے ہیں اس لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ اندر داخل ہوئی تو پروگرام شروع ہو چکا تھا وہ اپنی سیٹ پر جا بیٹھی للی کی ہاتھ ابھی تک گرم تھے چہرہ بھی بخار سے سرخ پڑ رہا تھا مگر وہ بھی مگن تھی۔ جھوم رہی تھی۔

جب گلوکار نے آ کر اپنے مخصوص انداز میں غزل شروع کی تو اس کے دل کے ساتھ ہر شائق کا دل آواز کے ردھم اور دکھ میں ڈوب کر ابھرتا رہا۔

ہم بھی گویا کسی ساز کے تار ہیں
چوٹ لگتی رہی گنگناتے رہے
اجنبی شہر کے اجنبی راستے
میری تنہائی پر مسکراتے رہے
میں بہت دیر تک یونہی چلتا رہا
تم بہت دیر تک یاد آتے رہے

اس سے کوئی بچھڑا نہیں تھا مگر خوامخواہ پھر بھی دل پر اداسی چھائی جا رہی تھی گویا لفظوں کا طلسم تھا کہ وہ نہ بچھڑنے کے باوجود خود میں ہجر کا نشتر اترتا محسوس کر رہی تھی مگر للی اب بھی چیونگم چباتے ہوئے بہت مطمئن تھی۔

"للی تمہیں کوئی غزل نہیں اچھی لگی کسی لفظ نے تمہیں متاثر نہیں کیا۔" اس نے سن کر سمرہ کو دیکھا پھر بولی۔

"یار سب کی غزلیں پرفیکٹ تھیں مگر اس غزل "یہ اجنبی شہر کے اجنبی راستے۔" کی تو بات ہی الگ ہے اس غزل میں جس ہجر کی مسافت کا ذکر ہے یہ مجھے زیادہ متاثر کرتی ہے اس لیے یہ غزل فی الحال لسٹ پر رہے گی۔" وہ کہہ کر لمحہ بھر کو رکی پھر غزل سنتے آنکھیں بند کیے جھومتے، سر جھکائے، غم کی تصویر بن جانے والے چہروں کو دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

"یہ غزل سننے کے لیے بندے کا خود کو شہنشاہ غم ثابت کرنا لازمی ہوتا ہے کیا، جس کے چہرے پہ دکھ چسپاں نہ دکھائی دے کیا منتظمین اس بندے کو ہال سے باہر نکال دیں گے سمجھ میں نہیں آتا یہ سب لوگ خود کو موسیقی اور لفظوں کا استاد ثابت کرنے کے لیے اتنا ڈرامہ کیوں کرتے ہیں۔"

"شاید اس لیے کہ دکھی ہونا اور دکھی نظر آنا آج کل فیشن میں شان ہے۔" ایک مردانہ آواز اس کی بات کاٹتی

ہوئی ابھری تو اس نے بائیں طرف دیکھا تیز نظروں سے گھورا بھی تبھی وہ نیلی شرٹ میں ملبوس لڑکا لاابالی انداز میں بولا۔

"دیکھیے دیکھیے آپ اس وقت جس قدر مختلف باتیں کر رہی ہیں اپنے رویے سے بھی مختلف دکھائی دے رہی ہیں عام لڑکیوں کی طرح گھورنا آپکو سوٹ نہیں کرتا۔" سمرہ نے منہ موڑ کر ہنسنا شروع کر دیا بندہ فکر کا ملا ہے اس نے دل میں بے اختیار سوچا اور للی نے تیزی سے اپنے چہرے کے تاثرات بدلے پھر بولی۔

"آپ خود اس قدر مختلف دکھائی دے رہے ہیں کہ آپ کے چہرے کی کوئی لکیر دوسری لکیر سے نہیں ملتی لیکن پھر بھی آپ اس عام سے محفل میں شریک ہیں۔"

"ہوسکتا ہے قدرت کو اس طرح آپ جیسی مختلف لڑکی سے ملانا منظور تھا ورنہ میں یہ غزلیں وغیرہ سننے والوں میں سے نہیں ہوں خوامخواہ کی ریں ریں، میں میں، ایک عدد لڑکی اس کی خوبصورتی اور پھر ہجر کے قصے، ارے جناب بہادری تو یہ ہے کہ جسے پسند کرو فوراً اس کا ہاتھ تھام لو یوں......" اس نے باقاعدہ ہاتھ پکڑ کر اداکاری کی اور للی بنا کسی گھبراہٹ کے بولی۔

"آپ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ مجھے پسند کرتے ہیں۔" اس کی بات پر سمرہ تو سٹپٹا گئی مگر وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا جھٹ سے بولا۔

"کچھ مضائقہ بھی نہیں، آپ کو پسند کرنا کچھ اتنا مشکل بھی نہیں، ویسے بھی آج کل پسندیدگی کا گراف کچھ گرتا جا رہا ہے میرا، مجھے یوں بھی ہر لڑکی ایک جیسی لگتی ہے اپنی طرف متوجہ کرتی ہوئی۔"

"مگر یہاں ڈھکی چھپی لجائی شرمائی لڑکیوں کی کمی نہیں۔"

"نہ ہو مجھے تو وہ بھی اپنی طرف متوجہ کرتی نظر آتی ہیں اب یہی دیکھیے ان محترمہ نے جس طرح کا لباس زیب تن کیا ہے بالوں میں ہاتھوں میں اتنے گلاب پہنے ہیں اوپر سے اتنی خوشبو لگائی ہے تو کیا اس میں یہ ترغیب پوشیدہ نہیں کہ میری طرف متوجہ ہو۔"

"ہاں ہوسکتا ہے لیکن پھر انہیں اس طرح اس محفل میں چلے آنے کی کیا ضرورت تھی ہر نگاہ تو پارسا نہیں ہوتی نا۔"

"ہوں یہ تو ہے مگر بھئی یہ ان کا ہیڈک ہے آپ مجھے دیکھیے میں تو اس سمبل پر پوری اترتی ہوں نا۔"

"نہیں آپ کو دیکھ کر میرے ذہن میں یہ سب نہیں آتا۔"

"ہوسکتا ہے آپ کا ذہن خراب ہو وگرنہ یہ جینز اور یہ شرٹ تو باقاعدہ یہی راگ الاپ رہی ہے۔" وہ بحث کرنے لگی باقاعدہ، اور سمرہ دونوں کو پوری حیرت اور تجسس سے دیکھے گئی اور وہ اس کی حیرت سے متاثر ہوئے بغیر بولا۔

"مجھے یہاں آپ سے اختلاف ہے ہماری فطرت میں ہے کہ جو چیز ہمیں ٹرے میں پیش کر دی جائے ہم اسے اہمیت نہیں دیتے آپ کو ڈسکور کرنے کے لیے "کہ میری طرف توجہ دو۔" کا چیلنج نہیں ہے کیونکہ میں آپ کو وضاحت سے دیکھ سکتا ہوں۔" سمرہ بلش ہوگئی مگر للی ویسے ہی تنی بیٹھی رہی۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے۔" اس کی خاموشی پر سمرہ کو اس کا دفاع کرنا پڑا تو اس کی توجہ للی سے اس کی طرف ہوگئی مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتا ان کے برابر والے صاحب جھنجلا کر بولے۔

"پلیز محفل کی آداب کا خیال رکھیے ہم لوگ ڈسٹرب ہو رہے ہیں۔" سمرہ شرمندہ ہونے لگی اور للی نے توجہ

موسیقی کی طرف کر لی سمرہ کو گمان ہوا شاید وہ اس بندے کے سچ سے ہرٹ ہوگئی ہے اس شخص نے بھی کچھ دیر خاموشی کے بعد کچھ سوچا تبھی بے ساختہ بولا۔

"مختلف لگنے کے باوجود اگر ناراضگی والا خانہ آپ کا بھی عام لڑکیوں کی طرح ہے تو سوری محترمہ میں بھی یونہی بکواس کرتا ہوں ورنہ دل کا برا نہیں۔"

"جی ہاں یہ ڈائیلاگ میں پہلے بھی ہزاروں فلموں میں سن چکی ہوں ہیرو لڑکیوں کا پیچھا کرتا ہے لڑائی جھگڑا کرتا ہے فضول قسم کے گانے گاتا ہے مگر پھر بھی اس کی ماں کہتی ہے بس عادت کا شوخ ہے ورنہ دل کا برا نہیں۔"

"یعنی آپ مجھے ہیرو کہہ رہی ہیں برملا۔" وہ پھر سے شوخ ہوگیا تو سمرہ نے للی کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھایا۔

"جب تمہیں پروگرام سے دلچسپی نہیں تھی تو پیسے کیوں ضائع کیے۔"

"واہ آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ ان کے پیسے ضائع ہوگئے اب دیکھیے اگر یہ یہاں نہ آتیں تو ہماری ان کی ملاقات کیسے ہوتی۔" سمرہ نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا للی اٹھنے لگی تو اس نے بے تکلفانہ اپنا کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"ناچیز کو حسن عمار کہتے ہیں۔"

"للی ظفر۔" وہ جواباً اپنا تعارف کرواتی، کارڈ تھام کر اٹھ گئی تو وہ پشت پر محفل کے آداب ملحوظ رکھے بغیر چلایا۔

"آپ کی دوست کا کیا نام ہے مجھے یہ زیادہ مختلف لگ رہی ہیں۔"

"پھر تو ان کا نام جاننا آپ کے لیے ضروری نہیں۔" جلدی سے کہہ کر للی آگے بڑھ گئی تو وہ لمبی سانس کھینچتا وہیں کرسی پر ڈھیر گیا پھر ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ ایک کھنک دار آواز قریب گونجی۔

"پھر کیا پتہ لگایا......"

"یہی کہ وہ بہت مختلف ہے مت کر اس سے عشق ورنہ یاد رکھ تجھے کسی بھی خاطر میں نہ لائے گی اور بے مزا بھی نہیں ہوگی سارا شجرہ نسب مختلف کر کے رکھ دے گی۔"

"ہوں پہلے تو یہ ممکن تھا مگر اب......اب یہ معرکہ مار کر ہی رہوں گا دیکھتا ہوں وہ مختلف ہے یا میں۔" دلفریب اسرار بھرے انداز میں ہنستے ہوئے ہیثم ولی نے برگر اور کوک اس کے ہاتھ میں تھما دی تو وہ شکر گزار نظر آنے لگا۔

"تھینکس یار اس وقت واقعی کچھ کھانے کی ہی طلب ہو رہی تھی تو پتا اتنا فلسفہ بولتی ہے وہ لڑکی کہ اگلا پچھلا کھایا پیا سب ہضم ہو جائے۔" وہ برگر سے شغل کرنے لگا تو ہیثم ولی نے غزل پر توجہ دے دی۔

اپنی آگ کو زندہ رکھنا کتنا مشکل ہے
پتھر بیچ آئینہ رکھنا کتنا مشکل ہے
کتنا آساں ہے تصویریں بنانا اوروں کی
خود کو پس آئینہ رکھنا کتنا مشکل ہے

ہیثم ولی نے کرسی کی پشت سے سر ٹکایا اور پھر اس لڑکی کی طرف خیال چلا گیا۔ دل پکارا، آخر اس کی طلب کیا ہے للی کی محبت یا محض مردانگی کا خراج یا اس کے اگنور کیے جانے کا غصہ اور ان لڑکیوں کی طرح اس کی بھی تمام توجہ کشش کے ہالے کی طرح اپنے ہی گرد سمیٹے ہوئے دیکھنے کی تمنا۔" جواب ملا "صرف مردانگی کا خراج" اور اس نے اپنے

اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے۔

للی کار میں آ کر بیٹھی سمرہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"آخر تمہیں لڑکی ہو کر اپنی فطرت سے اس قدر مختلف نظر آنے کا کریز کیوں ہے کسی مشکل میں پڑ جاؤں گی، لاکھ تم ہر دیوار گرا دو مگر یہ طے ہے کہ تم ایک لڑکی ہو یہ تھرلنگ والا شعبہ تمہارے لیے نہیں ہے دیکھا تھا کیسے پٹر پٹر باتیں کر رہا تھا وہ بندہ للی بدلو خود کو ورنہ راہ چلتے لوگ تمہیں اسی طرح مزا چکھنے کے فریب میں تم پر چوٹ کرتے رہیں گے۔"

"میری بلا سے۔" اس نے سن کر اطمینان سے کہا تو وہ چلائی۔

"آخر تمہیں یہ سب کر کے ملتا کیا ہے۔"

"لذت، تمہیں نہیں اچھا لگتا ہر شخص کی توجہ مجھ پر مرکوز ہو جاتی ہے بنا ہاتھ پیر مارے۔"

"یعنی تم کہنا چاہتی ہو تم خود نمائی چاہتی ہو۔" اسے افسوس ہونے لگا اس کی سوچ پر اور وہ استہزائیہ انداز میں ہنسنے لگی۔

"مائی ڈیئر سمرہ کیا تم بتانا چاہو گی کہ یہاں ایسا کون سا شخص یا چہرہ ہے جو خود نمائی کا شکار نہیں، ہم سب جو نہیں ہوتے ہیں درحقیقت وہ بننے کی جستجو رکھتے ہیں ایک خود نمائی کا نظام ہم سب میں قدرت نے رکھا ہے بزدل بہادر کے قصے سنا کر نمایاں ہونا چاہتا ہے جھوٹا، سچا، پارسا بن کر خود کو مقام دینا چاہتا ہے جو خوبصورت ہیں وہ خود کو اپنے حسن سے لاپرواہ دکھائی دے کر خود نمائی چاہتے ہیں۔

جو عام خال و خد کے ہیں وہ نت نئے فیشن اور میک اپ کے تمام شیڈز سے چہرے کو رنگ کر نمایاں ہونے کے لیے سرگرداں ہیں جو عقلمند ہیں وہ خاموشی کے ذریعے خود کو نمایاں کرتے ہیں اور جو کچھ نہیں ہیں وہ میری طرح لایعنی باتیں کر کے خود کو مطمئن اور سب میں خود کو نمایاں کرنے کا پُرفریب کھیل کھیلتے ہیں۔

یہاں ہر شخص کسی نہ کسی چکر میں ہے سمرہ ڈیئر یہاں ہم سب اس خود نمائی خودستائی کا شکار ہیں لہٰذا نو پرابلم لوگ کیا سمجھتے ہیں میرے بارے میں سمجھنے دو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

"یعنی تم نہیں بدلو گی۔" سمرہ نے گھور کے دیکھا للی نے ہونٹ بھینچ کر ونڈ اسکرین پر نظر گاڑ دی اور کار سبک رفتار سے کوٹھی کی طرف بڑھتی چلی گئی اور پھر جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو پاپا کو انہوں نے جاگتے پایا۔

"ارے پاپا آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔" سمرہ آگے بڑھی للی بھی قدموں میں آ بیٹھی اور پاپا بس سمرہ ہی کو ایک ٹک دیکھتے رہے۔

"کیا ہوا پاپا ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔" سمرہ کو پاپا کے رویے پر حیرت ہونے لگی ان کی آنکھوں میں توجہ کم حسرت زیادہ تھی للی نے بھی یہی بات نوٹ کی تو پاپا کو بے قراری سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سمرہ ٹھیک کہہ رہی ہے انکل کیا ہوا ہے آپ کو۔"

"کچھ نہیں۔" انہوں نے طویل سانس لی پھر آہستگی سے پوچھا۔

"شام غزل کیسی رہی سمرہ اپنے پسندیدہ گلوکاروں سے آٹوگراف لیا۔"

"کہاں پاپا یہ آپ کی دوسری بیٹی ہے نا یہ ہر جگہ مسئلہ کھڑا کر دیتی ہے وہاں بھی شروع ہو گئی۔" وہ تفصیل سے

واقعہ بتانے لگی کچھ حذف کر گئی پاپا سر جھکائے سنتے رہے پھر نگہ اٹھائی تو اس نگاہ میں کیا کیا نہیں تھا، ملال دکھ سوگ اور بھی بہت کچھ ایک زاویے میں تو سب سما تا نہیں تھا پتا نہیں پاپا کی آنکھ کی پتلی میں کیسے سمٹ آیا یہ سب کچھ۔

"آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے پاپا۔" سمرہ نے پاپا کا ہاتھ تھام کر کہا تو انہوں نے جیسے سنا نہیں اور بولنے لگے۔

"آج سے پہلے سمرہ تم نے اپنے پاپا سے جھوٹ نہیں بولا تھا مجھے بس یہی دکھ کھائے جاتا ہے۔"

"پاپا کس بات سے آپ کو لگا کہ میں نے آپ سے غلط بیانی کی ہے۔" حیرت کی شدت اور دکھ سے وہ پتھر ہوگئی پاپا نے دیکھا نہیں اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیئے پھر جیسے کوئی جان کنی میں تڑپتا ہے پاپا۔ پے ان کے لب کانپے اور دکھ ان کے ہر مسام سے آنسو کی طرح بہنے لگا۔

"روشن گوہر۔" "بچپن سے لے کر آج تک تمہارے اور میرے بیچ راز کی طرح رہی سمرہ تم نے بچپن میں بھی صرف روشن گوہر کے لیے مجھ سے جھوٹ بولے تھے میں نے درگزر سے کام لیا تھا میں سمجھتا تھا شعور آئے گا تو تمہیں اپنے پرائے کی تمیز ہو جائے گی لیکن میری تمام محبت بھی تمہیں نہیں جکڑ سکی آج برسوں بعد بھی تم نے اس ہی نام کے لیے میرے اعتماد اعتبار کو ٹھیس پہنچائی کیوں سمرہ کیوں۔" لٹی پاپا کے سے انداز میں سمرہ کو دیکھنے لگی مگر اس کی آنکھ میں صرف حیرت تھی روشن گوہر اس کی سماعت کے لیے بالکل نیا نام تھا اس لیے وہ اس نام سے منسوب کہانی سننے کے لیے بے قرار تھی مگر سمرہ ابھی تک مجسم بت بنی بیٹھی تھی۔

"سمرہ بولو بتاؤ مجھے کہ میری محبت میں کہاں کمی رہ گئی جو روشن گوہر تمہاری زندگی سے ابھی تک نہیں نکل سکی۔"

"پاپا۔" اس نے جی جان سے پکارا پھر ان کے گھٹنے سے سر لگا دیا تو پھر جھجک اور جھوٹ کی ہر دیوار گر گئی۔

وہ کہنے لگی۔

"میں نہیں جانتی پاپا کہ روشن گوہر سے میں اتنی مرعوب کیوں تھی؟ مرعوب تھی بھی یا صرف یہ میری محرومی تھی جس نے مجھے ان کے قریب کر دیا پاپا جب وہ اسکول گیٹ پر مجھ سے ملنے آتیں تو مجھے انوکھا سا فخر محسوس ہوتا سب بچوں کی نظر میں ان کے لیے پسندیدگی کے تاثرات ہوتے تو مجھے لگتا یہ سب مجھے سراہ رہے ہیں پھر جب وہ مجھے اپنے سینے سے لگاتیں تو مجھے ان کے سینے سے وہ خوشبو آتی جو کہیں میرے اندر سے پھوٹی تھی۔ شاید یہ میرے اندر کی طلب تھی پتا نہیں وہ ممتا کی طلب تھی یا توجہ۔

ماما کے نام کا جو خانہ مجھ میں خالی تھا وہ روشن آنٹی کے نام نے انجانے میں بھر دیا تھا مجھے ان کی آمد کا بہت انتظار رہتا تھا پہلے مجھے پڑھائی سے چڑ تھی جب میں سب بچوں کے ساتھ ان کی ماما کو دیکھتی تو مجھ میں ہوک اٹھتی دل نہیں چاہتا کہ اسکول جاؤں مگر ان کے ملنے کے بعد سے میں صرف ان سے ملنے کے لیے اسکول جاتی ہم ایک دوسرے کے بہت عادی ہوگئی تھیں جب آپ نے ان سے ایک دن جھگڑا کیا مجھے آپ کی باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں لیکن مجھے روشن آنٹی کی التجائیں مجھ سے ملنے کی اجازت لیتے ہوئے ان کا رونا نہیں بھولا وہ مجھے اس دن بہت مظلوم لگی تھیں۔

اس دن پہلی بار میں نے آپ سے دوری محسوس کی مگر جب آپ نے مجھے سینے سے لگا کر کہا کہ میں روشن آنٹی سے دوبارہ نہ ملوں ورنہ وہ مجھے آپ سے چھین لیں گی تو مجھے حیرت ہوئی بھلا روشن آ؟ مجھے زبردستی کیسے چھین سکتی تھیں مگر میں نے آپ سے وعدہ کر لیا کہ میں ان سے پھر نہیں ملوں گی میں نے اپنا وعدہ نبھایا مگر پاپا بعض نام اور چہرے

دل سے زبردستی تو نہیں مٹائے جا سکتے ناں، سو یہ نام میرے دل سے بھی نہیں مٹا اور اب کئی برس بعد جب وہ اس شہر میں آ گئیں تو میں نے سوچا اب تو وہ مجھے اغوا نہیں کر سکتیں چھین نہیں سکتیں اس لیے ان سے ملنے میں کوئی حرج نہیں۔

میں آپ کو یہ بتانا چاہتی تھی مگر پاپا صبح اخبار پر ہونے والی گفتگو نے مجھے یہ سمجھانے میں دیر نہیں لگائی کہ آپ اب روشن آنٹی سے مجھے ملنے نہیں دینا چاہتے بس اتنی سی بات تھی پاپا بائی گاڈ میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا آپ کے اور اس للی کے علاوہ میرا ہے ہی کون جس سے میں سچ بولوں اپنے دل کا راز بتاؤں۔" پاپا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا مگر للی کو پھر بھی جانے کیوں لگا جیسے وہ ابھی تک غیر مطمئن اور دکھی تھے۔

"انکل پلیز بی ایزی اگر آپ کو اطمینان نہیں تو یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ یہ روشن آنٹی سے کبھی نہیں ملے گی آپ کی کسی خواہش کو رد کرنا نہ اس کے بس کی بات ہے نہ میرے، بلیوی انکل۔" پاپا نے جواباً کچھ نہ کہا اٹھ کر اپنے بیڈروم کی سمت چلے گئے اور للی نے وہیں صوفے سے ٹیک لگا کر قالین پر بیٹھتے ہوئے سمرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ پہلا موقع ہے سمرہ جو انکل کسی معاملے میں اس قدر انوالو ہو رہے ہیں، ورنہ ہر معاملے میں وہ تیری پسند ناپسند اور خوشی کا خیال رکھتے ہیں مگر یہاں مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا ویسے یہ روشن گوہر ہیں کیسی، کیا بہت خوبصورت ہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" سمرہ نے ترچھے تیوروں سے اسے دیکھا تو وہ ہنسنے لگی۔

"میرا مطلب ہے ہو سکتا ہے انکل یہ سمجھتے ہوں گے کہیں تم انہیں خوبصورتی کی وجہ سے زیادہ ہی ایڈمائر تو نہیں کر رہیں، ہو سکتا ہے انہیں شدت سے جیلسی ہوئی ہو کہ تم ان کے علاوہ کسی اور کو اتنا کیوں چاہ رہی ہو بھئی یہ محبت بڑی اوکھی چیز ہے بندہ جسے چاہتا ہے ناں اس کے لیے دل میں یہ گمان رکھتا ہے کہ چونکہ وہ مقابل کو بے پناہ چاہے جا رہا ہے اس لیے اس کے محب کو صرف اس تک اپنی توجہ رکھنی چاہیے کسی اور کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے خون خرابے ہو جاتے ہیں یار اس محبت کے پوائنٹ آف ویو کی وجہ سے۔" وہ چپ ہوئی تو سمرہ نے کچھ کہے بغیر خاموشی اختیار کیے رکھی۔

للی نے چند لمحے اسے دیکھا پھر کہا۔

"میرے خیال میں تمہیں میری باتیں وزن دار نہیں لگ رہیں تم سوچتی ہو گی محبت سے چڑنے والی محبت پر بات کیسے کر سکتی ہے تو سمرہ ڈیئر مجھے کہنے دو کہ محبت سائنس کی تھیوری نہیں جس پر تجربہ کیے بغیر بات نہیں کی جا سکتی محبت تو ایک جذبے کا نام ہے کہتے ہیں یہ بھی ایک مفروضہ ہے اور مفروضوں پر بات کرنا مجھ سے زیادہ کون جانتا ہو گا اے سمرہ کیوں اس قدر سینٹی مینٹل ہو رہی ہو دیکھو صبح انکل جاگیں گے ناں تو انہیں کوئی بات بھی یاد نہ ہو گی۔ بائی گاڈ یہ وقتی ابال تھا جو اٹھا اور پھر انکل کے دل میں اگر کوئی چور ہوتا یا اس معاملے میں کوئی الجھاؤ ہوتا تو وہ یہ بات دل میں رکھتے تم سے وضاحت نہ مانگتے یقین کرو یہ صرف وقتی بات ہے اور بس۔" سمرہ نے امید وبیم سے اسے دیکھا اس کی باتیں سمجھ میں آنے والی تھیں اس لیے کسی قدر وہ مطمئن ہو گئی للی نے چہرے کے تاثرات کی گمبھیرتا میں کچھ کمی پائی تو مسکرائی۔

"جاؤ لڑکی سوؤ جا کر دیکھ لینا انکل صبح بالکل فریش تم سے ملیں گے۔" اس نے شانہ تھپکا تو وہ اٹھی للی نے الوداعی ہاتھ ملایا اور باہر نکل گئی سمرہ اندر کی طرف چلی گئی پاپا کے کمرے کے سامنے سے گزری تو دل چاہا پوچھے۔

"آپ نے مجھے معاف کر دیا۔" مگر پھر سہم کر پاپا کا رویہ سوچا تو ارادہ ترک کر دیا۔

آج پاپا نے پہلی بار کسی بات پر اتنا تند لہجہ اختیار کیا تھا ورنہ وہ تو بادلوں کی طرح سبک نرم اور زمین کی طرح

بے کراں مزاج رکھتے تھے مگر آج انہی پاپا کو اس نے شعلہ جوالا بنے دیکھا تھا روشن گوہر آخر کیا تعلق ہے اس نام کا پاپا کے ساتھ۔" اس نے سوچا، کمرے میں آ کر طویل و عریض بیڈ پر لیٹ گئی خود سے کوئی جواب نہ سوجھا تو للی کی باتیں پھر سے دماغ میں گھومنے لگیں۔

"یہ صرف جیلسی کیس ہے اور بس۔"

"شاید للی ٹھیک کہتی ہے لیکن اگر للی ٹھیک نہ بھی کہے تو مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ پاپا کے بدلے وہ روشن گوہر سے تعلق نہیں چاہتی تھی ٹھیک ہے میں بھول جاؤں گی کہ یہ نام کبھی میری زندگی میں موجود بھی تھا میں پاپا کی منت کروں گی کسی بھی طرح انہیں منالوں گی ہاں یہ ٹھیک ہے میں صبح ہی سب سے پہلے یہ کام کروں گی بلکہ کل صبح میں پاپا کو آفس بھی نہیں جانے دوں گی ہم کل خوب گھومیں گے میں، للی اور پاپا مزا آئے گا۔

للی کی باتیں کس قدر دلچسپ ہوتی ہیں وہ جھوٹ بھی بولتی ہے تو دل یقین کر لیتا ہے مگر نہ جانے انکل ظفر کب للی کو بھیجیں گے ہائے للی۔" وہ سوچنے کچھ بیٹھی تھی سوچ کی تان کہیں اور پہنچ گئی اس نے بور ہو کر لائٹ آف کر کے خود کو نیند کے بہتے دریا [illegible] الے کر دیا پھر وہ شاید سو رہی تھی یا جاگتے سونے کی کیفیت میں تھی کہ اسے محسوس ہوا جیسے پاپا اس کی پیشانی پر جھکے رو رہے ہوں۔

"پاپا۔" وہ ہڑبڑا کر اٹھی پاپا نے پشت موڑ لی۔ جانے کیوں آنسو چھپانے کے لیے یا اس لمحے کے سحر کو چھپانے کے لیے۔

"پاپا کیا ہوا آپ اس وقت۔" اس نے وال کلاک کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا رات کے تین بج رہے تھے۔

"آپ اتنی رات گئے تک جاگتے رہے ہیں کیوں پاپا۔"

"پتا نہیں شاید مجھے خوف ہو گیا تھا۔"

"خوف کس بات کا پاپا؟" وہ معصومیت سے پاپا کا ہاتھ تھامے پوچھنے لگی اور پاپا پھر سے اسے دیکھے گئے شدت جذبات سے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں بے قراری سی جم گئی تھی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی پھر سے کہ پاپا نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر پھر چوم لیا اور پھر جیسے کوئی التجائیہ پکارتا ہے پاپا کا روم روم صدا بن گیا۔

"سمرہ میں، میں تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکوں گا بیٹا۔" وہ بت کی طرح پاپا کی طرف دیکھتی رہ گئی پھر کتنی ساعتوں بعد اس کی زبان نے اس کا ساتھ دیا تو وہ بولی۔

"میں نے کہہ دیا تھا پاپا روشن آنٹی اب ہماری زندگی میں کبھی نہیں آئیں گی بائی گاڈ پاپا آپ میری زبان سے اب یہ نام کبھی نہیں سنیں گے یقین کریں پاپا۔" پاپا کہے بغیر چشم دلی کی تصویر کو یک ٹک دیکھے گئے پھر ان کے لب کانپے

"محبت اختیاری جذبہ نہیں ہوتا سمرہ اور پھر تم نے ہی تو کہا تھا بعض نام دل سے زبردستی نہیں مٹائے جا سکتے۔"

"کہا تھا میں نے اور اب یہ بھی میں ہی کہہ رہی ہوں کہ یقین کریں میرا میں یہ ناممکن کام کر دکھاؤں گی پاپا۔" اس نے ایک عزم سے مایوس پاپا کو دیکھا تو وہ ہنس دیے عجیب سا دکھ بھی تھا اس ہنسی میں، رائیگانی کا احساس بھی، اور سمرہ کو یہ اندازہ برچھی کی طرح دل پر لگتا محسوس ہوا وہ بے کل ہو گئی پھر پاپا کا ہاتھ تھام کر بولی۔

"آپ کو اپنی بیٹی پر اعتماد نہیں پاپا۔" انہوں نے اس کے بکھرے بالوں کو سمیٹا پھر بولے۔

"زندگی میں تمہاری ماما کے بعد تم ہی تو ہو جس پر میں نے اعتبار کیا ہے اور اعتبار بھی اندھا مگر سمرہ مجھے تمہارے دل میں موجود اس محرومی سے ڈر لگنے لگا ہے جانے کب تمہیں محسوس ہو کہ تمہارے پاپا کا وجود درحقیقت تمہاری خوشیوں کی راہ میں دیوار ہے مجھے ڈر لگتا ہے اس لمحے سے سمرہ جب تم بھی مجھے چھوڑ دو تم ممتا کی کمی پوری کرنے روشن گوہر۔"

"فار گاڈ سیک پاپا یہ سب سوچنے کی پہلے میری دعا ہے میں زندہ ہی نہ رہوں۔"

"یوں نہیں کہتے بیٹا۔" پاپا نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ بلک پڑی۔

"اتنی محبتیں دیتے ہیں توجہ سے دل کو اپنی طرف مسلسل موڑے رکھتے ہیں پھر بھی سمجھتے ہیں میں سمرہ عمیر اپنے پاپا کی بیٹی کسی اور کی محبت میں اپنے پاپا کو چھوڑ دوں گی آئی سویئر پاپا دنیا میں صرف آپ میرا محور ہیں اول و آخر پلیز آئندہ اپنے دل کو کسی خدشے سے آلودہ مت کیجیے گا کیونکہ میں جب تک زندہ ہوں صرف آپ کی بیٹی ہوں اور صرف آپ کی بیٹی رہوں گی۔" پاپا نے یقین سے سنا پھر بھیگی پلکوں سے اس کی آنکھوں کا بوسہ لیا پھر شانہ تھپتھپاتے ہوئے اٹھے۔

"بی ایزی صبح ہم ایک اچھے دن اور زندگی کا آغاز کریں گے بیٹا۔"

"کیوں نہیں پاپا کل ہم واقعی ایک بہترین زندگی کی طرف قدم اٹھائیں گے۔" اس نے موڈ خوشگوار کر کے جواباً کہا پاپا کمرے کی لائٹ آف کر کے باہر نکل گئے وہ پھر سے تکیے پر سر ڈالے گم صم ہو گئی۔

"پاپا اس معاملے میں اتنا حساس کیوں ہو رہے ہیں آخر کون ہیں یہ روشن گوہر۔" اس نے وعدہ تو کر لیا تھا پاپا سے مگر پھر بھی دل اس نام کی گتھی سلجھانے کے چکروں میں پڑا تھا۔

"خیر دیکھا جائے گا ضروری تو نہیں میں اپنی اس جاسوسی سے پاپا کو آگاہ بھی کروں پاپا خوامخواہ وہموں میں الجھ جاتے ہیں کس میں طاقت ہے کہ ان سے ان کی بیٹی کو چھین سکے پاپا کی محبت تو زندگی کی کشش ہے اور کس میں ہے اتنی کشش ہے کہ اس کے بدلے خدانخواستہ میں پاپا سے منہ موڑ لوں گی۔

ویسے للی کے ذریعے روشن گوہر کے معاملے میں انویسٹی گیشن تو کرنی چاہیے نا۔" آنکھیں بند کر کے حتمی پروگرام بنا کر سو گئی۔

صبح اٹھی تو جلدی جلدی تیار ہوتے ہوئے للی کو فون کرنے میں مصروف تھی ملازمین پاپا کی گاڑی میں پکنک کا سامان رکھنے میں مصروف تھے اور پاپا دوسرے فون پر دفتر میں کام کی پروگریس کے ساتھ ساتھ دن بھر کے لیے احکامات بھی ڈکلیئٹ کروا رہے تھے پھر وہ للی کو پروگرام سمجھا کر واپس لوٹ بھی آئی مگر پاپا کو ہنوز اپنے خاص انداز میں فون پر گفتگو کرتے ہی پایا وہ کسی بات پر اختلاف کر رہے تھے وہ چائے کا کپ لے کر صوفے پر ہی بیٹھ گئی پاپا نے نظر اٹھائی پھر حتمی لہجے میں بولے۔

"نہیں بھئی ذیشان یہ پروگرام کسی طرح کینسل نہیں ہو سکتا بلکہ آج تو میں مرنے کے بارے میں بھی سوچ نہیں سکتا آج میں اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ وعدہ کر......" پاپا کہتے کہتے یکلخت چپ ہو گئے سمرہ نے تحیر سے پاپا کو دیکھا دوسری طرف سے "کیا ہوا سر کیا ہوا۔" کی گردان ہو رہی تھی کہ کھڑے کھڑے پاپا یکدم صوفے پر گر گئے سمرہ نے گھبرا کر کپ تپائی پر رکھا تیزی سے ان کی طرف بڑھی۔

"پاپا کیا ہوا۔"

"رشید کو فون کر دو میں ٹھیک ہوں۔" پاپا نے رک رک کے لہجے میں کہا پھر ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی زیادہ دیر نہ لگی ڈاکٹر رشید کو بھی پہنچنے میں۔

"کیا کر لیا اچانک......" وہ چیک اپ کرنے لگے پھر سمرہ کو دیکھا تو آہستگی سے بولے۔

"ایک کپ گرما گرم چائے تو لاؤ سمرہ بیٹا۔" سمرہ نے بے قراری سے دیکھا ڈاکٹر رشید ہنسنے لگے۔

"بھئی سمرہ بے فکر رہو تمہارے پاپا کو کچھ نہیں ہوا بس معمولی کمزوری سمجھو۔" وہ لمحہ بھر کو رک کے پھر بولے۔ "کل کیا کوئی غیر معمولی واقعہ ہوا ہے۔"

اس نے انکل کو نا سمجھنے والے انداز میں دیکھا تو بلڈ پریشر لیتے ہوئے ڈاکٹر رشید نے اٹھا کر اسے پھر سے دیکھا۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" ڈاکٹر رشید نے انجکشن پاپا کے بازو میں انجیکٹ کرتے ہوئے طرح کہا۔

"سمرہ عمیر تمہارے پاپا بالکل جوان ہیں مشکل سے بیالیس کے ہوں گے اور پھر تمہاری جیسی بیٹی کے ہوتے یہ بیمار ہونے کی کوشش تو کر کے دیکھیں تمام کڑوی دوائیں نہ پلوا دیں تو کہنا۔"

"کس سے کہنا اور کیا کہنا انکل رشید۔" للی اچانک کمرے میں داخل ہوئی تو پاپا نے خود کو بہت حد تک بہتر پایا۔

"بیماری ہے کیا..... صرف بچھڑنے کا خوف اندر کی تنہائی اگر یہ یونہی تمام عمر میرے ارد گرد رہیں تو میں بھول کر بھی بیمار نہ پڑوں۔"

"کیا سوچنے لگے مسٹر بزنس مین۔" ڈاکٹر رشید نے کاندھا ہلایا تو پاپا نے غور سے تینوں کے چہرے دیکھے پھر بولے۔

"تم لوگوں کے ہوتے ہوئے بھلا میں کچھ سوچ سکتا ہوں۔"

"یعنی آپ چاہتے ہیں ہم آپ کو ڈسٹرب نہ کریں۔"

"میرا حکم ہے ہر وقت اس کے سر پہ سوار رہو اور سمرہ تم ہر وقت اسے باتوں میں لگائے رکھو یہ صرف اکتا گیا ہے تنہائی سے اور بس۔" پاپا نے گھور کر ڈاکٹر رشید کو دیکھا تو ان کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"اگر تمہیں پتہ چل جائے کہ تمہارے بچے تم کو چھوڑ کر الگ گھر بسا لیں گے تو کیا تم پھر بھی اسی طرح مطمئن زندگی گزارنے کے نسخے بتاتے رہو گے۔" سمرہ کی زندگی پاپا کے روکھے لہجے پر آنکھوں میں کھنچ آئی للی نے بھی دیکھا اور ڈاکٹر رشید نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پورے یقین سے کہا۔

"یقین کرو عمیر اگر مجھے اس کا یقین بھی ہو جائے کہ میری تمام محبت کے باوجود میرے بچے اپنی زندگیوں پر میرے اصول میری سوچ میری پسند کو لاگو کرنے کے حق میں نہیں اپنی زندگی اپنے طور پر گزارنا چاہتے ہیں تو آئی سوئیر میں حرف شکایت زبان پر نہیں لاؤں گا ہاں یہ ہے کہ کچھ دن مجھے ان کی عادت ان کی محبت تڑپائے گی مگر میں خود کو سنبھال لوں گا۔

ایک انسان کو جذباتی طور پر اتنا اسٹرانگ تو ہونا چاہیے ناکہ وہ اپنے دکھوں پر بھی پردہ ڈالے رکھے اور پھر یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ محبت پالتو پرندوں کی طرح پنجرے میں قید نہیں کی جا سکتی یہ تو آزاد ہے اپنی مرضی کی تابع ہے اگر

تمہاری قسمت میں ہے تو ہزار راستوں مسافتوں کے بعد تم تک ہی لوٹ آئے گی ورنہ تم چاہے جتنی زنجیریں ڈال لو بظاہر اس کے وجود کو جکڑ لو لیکن اس کے اندر محبت کے تن پر تم اپنا نام نہیں کھود سکتے۔" ڈاکٹر رشید کہہ کر چپ ہوئے تو للی اور پاپا نے پہلی بار سوچا کہ یہ ڈاکٹری روپ میں تو ہم سب کے خیال سے بالکل الگ نکلے اتنا عمیق اور تلخ سچ کتنے اچھے لفظوں میں پرو دیا۔

"انکل یو آر جینئس پہلے تو میں آپ کو صرف ڈاکٹر سمجھتی تھی لیکن آپ تو میڈیکل کی کتابوں کے علاوہ بھی بہت کچھ جانتے ہیں۔"

"شاید اس لیے کہ میں نے انسان کو صرف میڈیکل کی تھیوریز پر نہیں پرکھا ایک انسان ان کتابوں کے علم سے کہیں بے کراں علم ہے بھئی، ابھی تو ہم نے صرف اس علم کی ایک بوند چکھی ہے انسان سمندر ہے بے کراں سمندر جس کی کوئی تھاہ نہیں۔"

"یہی تو میں کہتی ہوں۔" للی بے تہنی سے ان کے قریب بیٹھ گئی تو سمرہ چائے کا کہنے باہر چل دی اس کے جاتے ہی پاپا نے للی کو دیکھا اور کہا۔

"للی سمرہ کا بہت خیال رکھنا یہ بہت حساس بہت شدت پسند ہے محبت میں۔" ڈاکٹر رشید اور للی دونوں نے پاپا کے لہجے کو محسوس کیا تو انہیں جھڑکا۔

"کیا کرتے ہو غیر معمولی سا بلڈ پریشر کیا ہو گیا بالکل سنجیدہ ہو گئے۔" انہوں نے تنبیہہ کی تو پاپا نے چہرے کا رخ سمرہ کی طرف کر دیا جو چائے کی ٹرے لیے دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی گئی تو ملازم سے کہنے تھی مگر ڈاکٹر رشید کے کہنے پر خود ہی بنا کر لائی تھی ڈاکٹر رشید نے چائے پی کر کہا۔

"اب میں چلتا ہوں ویسے انجکشن اور دوا تو دے دی ہیں لیکن پھر بھی کوئی پرابلم ہو تو سمرہ کو کہہ کر فون کر دینا اور مسٹر ٹریجڈی ہیرو زیادہ سوچنے کڑھنے اور اینگری ہونے کی ضرورت نہیں آرام کرو اور دوا وقت پر استعمال کرو۔" وہ ہاتھ ملاتے اٹھ گئے سمرہ عمیر انہیں باہر تک چھوڑنے گئی واپس لوٹی تو للی نے پاپا کو دلار سے تاش ہی تو سمرہ نے بھی ہاتھ آگے بڑھا دیا للی پاپا سے ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول ہو کر ان کا دل بہلانے لگی مگر روشن گوہر کے نام کی پھانس پاپا کے عین دل کے بیچ بار بار ٹیسیں دیتی رہی اور وقت بیتتا رہا۔

ہیشم ولی اس وقت خاموشی سے ایزل پر لگی اپنی ایک تصویر مکمل کر رہا تھا جب اچانک جنید بھائی اور ستارہ نے اس کے اسٹوڈیو میں حملہ کیا ستارہ نے آتے ہی بھائی کے ہاتھ سے برش لے لیا اور جنید بھائی رعب ڈالتے ہوئے بولے۔

"آج ما بدولت کا باہر گھومنے کا پروگرام ہے یار۔ آج کوئی کام نہیں ہوگا۔" ہیشم نے مسکرا کر بڑی بڑی پلکیں اٹھا کر پھر کہا۔

"جنید بھائی ہمارے ملک میں ویسے ہی کون سا شعبہ ہے جس میں کام ہو رہا ہے اوپر سے آپ ہیں کہ کام کرتے بندوں کے ہاتھ روکنے چلے آئے ملک کو بہت نقصان ہوگا بھئی۔"

"ہاں ملک آپکے کاندھوں پر ہی تو دھرا ہے ناں یہ چند ٹوٹی پھوٹی تصاویر نہ سمجھ میں آنے والی پینٹنگ ہی تو اس ملک کا سرمایہ ہیں بتایئے بھلا یہ سب ملک کو کیسے فائدہ پہنچا سکتے ہیں....." ستارہ شرارت پر اتر آئی تو اس نے اسے گھور کر دیکھا۔

"پورا ملک میرے فن کی داد دے رہا ہے اور تم ہو کہ انہیں بے کار سمجھ رہی ہو۔"

"میں مان سکتی ہوں آپ کی بات مگر ثابت کیجیے کہ آپ کارآمد ہیں۔" جنید بھائی ہنستے ہوئے ان دونوں کے قریب ہو گئے پھر بولے۔ "ثابت کرنے کے لیے گیرج کافی ہے ذرا اتنی کاریں ہیں ان حضرت کے پاس کہ یہ جوتوں کی طرح کپڑوں سے میچ کر کے نکلتے ہیں۔"

"جنید بھائی۔" اس نے خفگی سے گھورا تو وہ ہنس پڑے۔

"بھئی ستارہ ذرا اپنا ہاشم کچھ ہے یا نہیں ہے لیکن یہ طے ہے کہ اس کی لکیروں میں بڑا دم ہے۔" ہاشم نے کالر اکڑا لیا جنید بھائی نے چہرہ اونچا کیا پھر بولے۔

"ہر لکیر اپنی جگہ فٹ لیکن یہ آنکھیں ہیں نا ان میں کچھ ضرور ہے بندہ ایک بار ڈوبے تو ابھرے ہی نہیں کنارے جو تیز ہوتے ہیں۔"

"یعنی آپ اتنی دیر سے میرے چہرے پر ریسرچ فرما رہے تھے اور میں سمجھ رہا تھا کہ شاید کفر ٹوٹ گیا خدا خدا کر کے لیکن جناب آپ اور یہ......" وہ ادھورا جملہ کہہ کر غصے میں ہاتھ صاف کرنے لگا ستارہ نے اسے سنجیدہ دیکھا تو فوراً اس کے کاندھے سے جھول گئی پھر بولی۔

"ریسرچ نہیں اسے تنقید کہتے ہیں بھائی لیکن خیر ان سے قطع نظر میں کہتی ہوں کہ ہاشم بھائی جیسا ایک بھی ہو دنیا میں تو لا کر دکھا دیں۔"

"یعنی چیلنج کر رہی ہو مجھے۔" جنید بھائی نے طرح دی ستارہ نے اثبات میں سر ہلا دیا تو وہ بے ساختہ بولے۔ "ہاشم ولی جیسا شخص کل ہی میں نے دیکھا تھا واہ کیا پرسنالٹی تھی اتنی بڑی بڑی آنکھیں یہ شاندار مونچھیں اور جھیل کا گہرا پن تو ان سے بھی زیادہ تھا بہترین نفیس کپڑوں میں تو وہ کہیں کا شہزادہ لگ رہا تھا۔" ہاشم دلچسپی سے جنید بھائی کو دیکھ رہا تھا مگر ستارہ سے ضبط نہ ہو سکا جلدی سے بولی۔

"آخر آپ نے ہمارے ہاشم بھائی جیسا پرنس چارمنگ کہاں دیکھا۔"

"کل صبح ستارہ میں ابھی ٹھیک طرح سے اس چہرے سے آنکھیں سیراب بھی نہ کر سکا تھا کہ بڑے بھیا کی آواز آئی جنید دفتر نہیں جانا کیا، پھر! پھر مجھے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے سے ہٹنا پڑا ورنہ......"

"او جنید بھائی آپ۔" اس نے جنید بھائی کے کاندھے پر ہلکا سا مکا مارا ہاشم دوہرا ہو کر ہنسے جا رہا تھا جنید بھائی بڑے آرٹسٹ بندے تھے لمحوں میں دوسروں کی توجہ اپنے من پسند نقطے پر مرکوز کروا لیتے باتوں کے جال یوں پھیلاتے کہ بندہ چاہتے ہوئے بے وقوف بن جاتا ہاشم نے ہنسی کو یکدم بریک لگایا پھر سنجیدگی سے بولا۔

"کہاں جانا ہے؟" جنید بھائی جو اس کی بنائی تصویروں پر خاموشی کی زبان میں داد دے رہے تھے اس سوال پر چونک کر مڑے۔

"دیکھیے ہاشم بھائی آج آپ کی ضد نہیں چلے گی جہاں ہم جانے کو کہیں گے آپ کو ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔"

"تو مجھے کب انکار ہے بھئی لیکن پتہ تو چلے جانا کہاں ہے۔" جنید بھائی نے سنا تو ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا۔

”بس چلو آج میری پسند کا ڈنر کرو۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا بنا کسی حیل و حجت کے جنید بھائی حسب سابق ایک شاندار ہوٹل میں ان کے ساتھ داخل ہو گئے۔

پھر وہ ہوٹل سے کھانا کھا کر لوٹے ہی تھے ملازم نے اُسے کافی کا مگ لا کر دیا تھا وہ کوٹ اتار کر عجیب سی پراسرار مسکراہٹ سے کافی کے کپ کو دیکھنے لگا تھا ”مجھے آپ سے بہت محبت ہے ماما بہت زیادہ مگر کاش آپ کبھی اس بات کو سمجھ سکتیں“ اُس نے کافی کے کپ کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تھا کہ جنید بھائی تیزی سے اندر داخل ہوئے اور کراہ کر بولے ”ہائیں کیا بات ہے میری ماں کی بن کہے دل کی بات سمجھ جاتی ہیں اس وقت واقعی کافی کی بہت طلب ہو رہی تھی......“

انہوں نے ہشم ولی سے بھی پہلے کافی کا کپ پکڑا ”نہیں جنید بھائی یہ کافی صرف میری ہے......“ اُس کا انداز بہت حتمی تھا جنید بھائی کو حیرت ہوئی تھی وہ تو اپنے آگے سے چیزیں اٹھا کر دے دینے کا عادی تھا پھر آج کیوں جنید بھائی بدمزہ ہو گئے تھے مگر پھر بھی چہرے پر مسکراہٹ سجا کر بولے ”لے لو بھئی۔ میں میں خود بنا لیتا ہوں کافی......“ وہ کپ رکھ کر نکل گئے پھر کافی بنا کر واپس لوٹے تھے ارادہ تھا ساتھ بیٹھ کر ٹی وی انجوائے کریں گے لمحہ بھر کی خفگی کی گرد کافی کے پانی میں ڈوب چکی تھی۔

”کیا دیکھا جا رہا ہے بھئی......“ وہ چہکتے ہوئے اندر داخل ہوئے وہ صوفے پر بیٹھا تھا اور میوزک پروگرام چل رہا تھا ”یہ تیری چوائس کو کیا ہو گیا ہے اتنے ہار بل سونگ کب سے سننے لگا“ وہ انگلش سونگ پر کہہ رہے تھے مگر وہ ٹی وی کو بہت غور سے تو دیکھ رہا تھا مگر بہت غیر فطری انداز تھا اُس کا......“

”ہشم کیا ہوا تم ٹھیک ہو ناں......“ انہوں نے کپ رکھ کر اُسے جھنجھوڑا......اُس نے چونک کر انہیں دیکھا مگر کچھ نہیں بول سکا تھا۔ ”ہشم کیا ہو رہا ہے تمہیں“ جنید بھائی ایک دم سے گھبرا گئے تھے۔ وہ باہر کی طرف بھاگے تھے ”ستارہ، ماما...... بڑے بھیا......“ وہ زور زور سے چیخے تھے اور ذرا سی دیر میں سب اُس کے گرد تھے جواد بھائی نے فوراً ڈاکٹر کو بلا لیا تھا فوری طور پر کچھ انجکشن لگائے گئے تھے اور وہ یک ٹک ماما کو دیکھ رہا تھا ”آئی لو یو ماما......“ یہ اُس کا پہلا مربوط جملہ تھا ماما کے دل کو کچھ ہوا تھا تبھی حسن عمار کی آواز سنائی دی تھی۔

”یہ تجھے کس نے فون کر دیا یار......“ وہ بہت مدھم سے بول پا رہا تھا۔

”بس کر دیا کسی میرے اپنے نے، تجھے یہ اچانک سوجھی کیا، کیوں بھئی یہ انٹوائی کھٹوائی لے کر کیوں پڑے ہو......“ وہ بیڈ پر ہی چوکڑی مار کر بیٹھ گیا تو ہشم دھیرے سے ہنسنے لگا۔

”بیمار تو میں پہلے بھی نہیں تھا اب بھی نہیں ہوں ذرا دیکھنا تو بیمار چہرے ایسے ہوتے ہیں کسی ڈاکٹر نے سن لیا نا تو سر پیٹ لے گا کہ ایسے پہلوان لوگ بھی بیمار کہلاتے ہیں۔“

”ہوں کہتا تو ٹھیک ہے۔“ لمحہ بھر کو وہ رکا پھر بولا ”تیرے لیے ایک خبر ہے وہ جو تیری محبوبہ دلنواز ہے نا اس کے والد بزرگوار ایک ہفتے سے کچھ بیمار پڑے ہوئے ہیں۔“

”اچھا مگر کیسے۔“ وہ یکلخت اٹھ کر بیٹھ گیا حسن عمار نے اس کی بے قراری دیکھی تو ہنسی نہ ضبط کر سکا پھر بولا۔

”واہ میرے شیر تو تو مجنوں سے بھی دو ہاتھ آگے ہے یعنی دوست سے زیادہ اس کے ابا کی فکر ہے تجھے۔“

”بکومت حسن عمیر انکل لبنی کے تعلق سے پہلے ہی مجھے عزیز تھے پتہ نہیں کوئی مختلف سی بات ہے ان میں جو

ہزاروں میں بھی کھڑے ہو جائیں تو، دور سے ہی ان کی پہچان کروا دیتی ہے کوئی آنچ دیتا ہوا دکھ کوئی نامحسوس تعلق ہے ان کے اور میرے درمیان جو کھینچتا ہے خود بخود۔"

''مائی گاڈ آج کل کہیں اجرام فلکی کی کتب بینی۔ نہیں ہو رہی کشش سے لے کر ہالے تک۔ یونہی مصروف رہو تب جلدی کوئی نیا سیارہ ڈھونڈ نکالو گے ویسے نام اس کا اپنے دوست کے نام پر ہی رکھنا۔"

حسن نے تمسخرانہ انداز میں کہا، مگر اس نے برا نہیں منایا بلکہ ہلکے سے کہا۔

''حسن دراصل تم نے انہیں دیکھا نہیں ہے نا اس لیے یوں کہہ رہے ہو ایک بار عمیر انکل سے مل لو گے نا تو افسوس کرو گے کہ اتنے عرصے ان سے دور کیوں رہے عمیر انکل از گریٹ وہ بزنس مائنڈ لوگوں سے بالکل الگ ہیں ان کی انگلیاں کمپیوٹر پر بھی چلتی ہیں تو لگتا ہے جیسے دل کے کواڑ کھٹکھٹا رہی ہیں وہ مجسم دل ہیں ان پر کرنسی نوٹوں کی ہوس بھی غالب نہیں آتی وہ بہت مختلف انسان ہیں یار۔"

''مختلف! کیا سارے مختلف انسان تیری ہی قسمت میں لکھے ہیں، میں مختلف تیری گرل فرینڈ مختلف، اب ان کے ابا بھی مختلف او مائی گاڈ......" اس نے سر تھام لیا تو اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''لگی عمیر انکل کی بیٹی نہیں ہے انڈر اسٹینڈ......" درمیان میں اس طرح ٹوکنے پر وہ ہنس پڑا۔

''بہت برے ہو ہیثم کے بچے دوست میری ہے اور معلومات تمہارے پاس ہیں مجھے کھل رہی ہے یہ بات" ہیثم نے سنا تو اس کے کاندھے پر زور سے چٹکی بھر لی۔

''ذرا دل اور دماغ سنبھال کر میرے یار دلدار یاد رکھنا کہ تم اسے میرے لیے تسخیر کر رہے ہو۔"

''یعنی اس بار بات کچھ سنجیدہ ہے؟"

''ہو بھی سکتی ہے نہیں بھی ہو سکتی، اصل حسن ابھی مجھ پر کچھ واضح نہیں ہو رہا۔"

''لیکن تمہارے اس واضح ہونے سے پہلے مجھ پر ہی کچھ انکشاف ہو گیا تو، اس نے شرارت سے دیکھا تو ہیثم نے ترچھے ہو کر اسے دیکھا پھر کہا۔

''اگر بالفرض ایسا کچھ ہوا تو فلمی سچویشن کے کلائمکس کی طرح تمہیں میری لیے اپنی محبت کی قربانی دینی پڑے گی۔"

''واہ یہ اچھی رہی دکھ سہے بی فاختہ کوے انڈے کھائیں۔"

''تمہاری یہ مثال میرے اس کان سے داخل ہو کر اس کان سے نکل گئی حسن عمار۔"

ملازم چائے کی ٹرالی لیے داخل ہوا تو دونوں سنجیدہ صورت بنا کر بیٹھ گئے پھر حسن عمار تو کچھ دیر بیٹھ کر لٹی کے متعلق پروگریس دے کر مٹی سے دعا سلام لیتا اٹھ گیا جبکہ ہیثم ولی جنید بھائی کے روکنے کے باوجود کپڑے بدل کر گیرج کی طرف بڑھ گیا حقیقتاً اسے عمیر انکل کی فکر ہو رہی تھی جن سے وہ پہلی بار اتفاق سے ملا تھا۔

اس دن آرٹ ایگزیبیشن میں تصاویر ارینج کر کے وہ خود، دیکھنے والی آنکھوں کے ساتھ نگاہ بنا ایک ایک چہرے کے تاثرات اور زبان سے ادا ہونے والے جملوں کو جمع کر کے تھک کے بیٹھا ہی تھا کہ عمیر انکل نے اسے چائے پیتے دیکھ لیا وہ آرٹ گیلری کے منتظم پر خفا ہونے کا سوچ ہی رہا تھا کہ انکل عمیر نے بے تکلفی اس کا شانہ تھپکا پھر بولے۔

''تمہاری لکیریں آنچ دیتا ہوا دکھ ہیں مگر ان میں بھی کہیں کہیں آسودگی کو نجتی ہے، جو دکھ انسان کو آگہی اور

اپنے اندر جھانکنے کا سلیقہ سکھاتے ہیں وہ ایک دریچہ ہوتا ہے جس سے ملال کی ہوا کے ساتھ ساتھ روشنی بھی داخل ہوتی رہتی ہے نئے جہانوں، نئے رازوں سے پردہ اٹھانے کے لیے، ینگ بوائے تمہاری ایک ایک تصویر اسی دریچے سے جھانکتی روشنی ہے جو اندھیروں میں ڈوبتی نہیں بلکہ راہ منزل کی سمت بن کر روشن دیا ہو جاتی ہے مجھے فخر ہے تم پر۔"

اور وہ ہاتھ میں کپ تھامے بت بنا رہ گیا وہ کس قدر نادر لفظوں میں اس کی تعریف کر کے جا بھی چکے تھے اور وہ ابھی تک ان کے سحر میں گرفتار بیٹھا تھا کتنی ساعتیں اسی خاموشی کی نظر ہوئیں تب کہیں جا کر اسے ہوش آیا اور اس نے پوچھا۔

"آپ انہیں جانتے ہیں رضی انکل......" رضی آرزو نے اثبات میں سر ہلایا پھر بولے۔

"درحقیقت عمیر خود ایک دریچہ ہے روشنیوں کا اس لیے جب اس نے کہا وہ تم سے ملنا چاہتا ہے تو میں تمہارے اصرار اور تمہاری شرط بھلا کر اسے تم سے ملانے لے آیا، ہیشم یقین کرو اگر میرے کسی کل میں یہ شخص نہ ہوتا تو میرا آج اتنا تابناک نہ دکھائی دیتا، میری ذات صرف اس سورج شخص کی ایک مدھم سی کرن ہے بیٹا ہی از ویری گریٹ مین ہیشم۔"

اور اس نے اس دن کے بعد عمیر رحیم سے مزید جانے کتنی ملاقاتیں کروائی تھیں ہر نشست میں اس پر عمیر رحیم کسی اور طرح واضح ہوتے اور اس میں سوچ کی ایک نئی کھڑکی کھول جاتے ایک نیا دریچہ بڑھ کر وا کر دیتے اور وہ اسی کشش میں ان سے ملتا رہتا۔

"جانے عمیر انکل بیمار کیوں ہو گئے۔" اس نے سوچا اور کار کو اسپیڈ دے دی۔

☆

للّی اور سمرہ پاپا کی بہت توجہ سے دیکھ بھال کر رہی تھیں، اتنی تندہی سے کہ ڈاکٹر رشید کو خیال ہوا کہیں وہ دونوں خود ہی بیمار نہ ہو جائیں سو جب وہ شام کو چیک اپ کے لیے آئے تو بولے۔

"عمیر اب تم بچیوں کو زیادہ پریشان مت کرو ان میں گھوما کرو۔"

"میں تو کہتا ہوں مگر یہ دونوں ہی نہیں سنتیں۔" پاپا نے عذر تراشا تو وہ گھورنے لگے۔

"تم ان دونوں کے بڑے ہو، یا یہ تمہاری بڑی وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں، خدا کے بندے انسان اچھا بھلا ہو کر بستر پر پڑا رہے تو وہ بیمار ہو جاتا ہے۔

ابھی بھی اعصاب کو نارمل نہ کیا تو مزید بیمار ہو جاؤ گے پھر میری دوا بھی اثر نہیں کرے گی۔ سمجھے کچھ، چلو اٹھو خود کو پھر سے اپنے قدموں پر کھڑا کرو ابھی تو بہت کام ہیں تمہارے کرنے کے۔"

پاپا نے بھی سوچا اس پہلو پر تو پہلی بار اٹھ کھڑے ہونے کی لگن جاگی ہاتھ ڈاکٹر رشید کی طرف بڑھا دیا تو ڈاکٹر رشید کا چہرہ کھل گیا۔

"ہوں یہ ہوئی نا بات" بیڈ سے انہیں اٹھنے میں مدد دینے لگے پھر دو چار قدم کمرے ہی میں چہل قدمی کروائی پھر آرام سے بیڈ پر واپس بٹھایا تو سمرہ پاپا کے چہرے پر پسینہ دیکھ کر گھبرا گئی۔

"یو آل رائیٹ پاپا۔"

"ہاں تمہارا پاپا بالکل ٹھیک ہے" پاپا نے کہا۔

سمرہ انہیں سوپ پلا رہی تھی جب للّی سرخ گلابوں کا گلدستہ لیے ہیلو ہیلو کرتی اندر داخل ہوئی۔ وہی بلیو جینز

تھی ہاں البتہ شرٹ سرخ رنگ کی تھی۔

للی نے گلدان سے ایک خوب صورت سی کلی نکال کر ڈاکٹر رشید کی طرف بڑھا دی اور بولی۔

”انکل یہ سرخ گلاب کی کلی میں خاص آپ کے لیے لائی تھی اس لیے یہ لیجئے اور مسکرائیے ذرا۔“

اس نے ڈاکٹر رشید کے کالر میں کلی لگا دی تو وہ ہلکے سے مسکرا دیے۔

ایک ملازم کارڈ لے کر اندر داخل ہوا پاپا نے کارڈ لے کر پڑھا۔

”ہیشم ولی...... بھیج دو اندر۔“

”مصور ہے۔“ ڈاکٹر رشید بولے۔

”مگر سائنس سے اس کا تعلق نہیں اس لیے تم نہ جانتے ہو گے۔“ ہیشم اندر داخل ہونے سے پہلے دستک دے ہی رہا تھا کہ پاپا نے بے ساختہ کہا۔

”تو تو بائی سن یہ خانہ درویش ہے“ نظر اٹھا کر بے وجہ پاپا کے بائیں طرف کھڑی للی کو دیکھا اور سوچا ”کیا محبت میں یہ میجر انکل اس قدر آگے بڑھ چکے ہیں کہ دل کے راز راز نہیں رہنے دیتے۔“

”کیا سوچنے لگے مائی چائلڈ ادھر آؤ نا۔“ وہ جھجکتا ہوا آگے بڑھا حالانکہ ہچکچانا اس کا مسلک نہیں تھا مگر میجر انکل کے سامنے وہ خود کو بڑا ان ایزی فیل کرتا تھا جانے یہ اندر سے کس قدر نرم دل تھے کہ تنے ہوئے دل اور مزاج بھی ان کے آگے جھک جاتے تھے۔

”میں نے سنا ہے آپ کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔“

”خراب تھی مگر اب تو انکل کافی سے زیادہ بہتر ہیں میرے خیال میں آپ کو اپنی باخبر ایجنسی کو معطل کر دینا چاہیے۔“

”للی یوں نہیں کہتے بیٹا کیا پتہ کیا پرابلم ہو اس کی۔“

”کیا پرابلم ہو سکتی ہے ایک رئیس زادے کی انکل محض چند کھنکتے سکے اور بے شمار محبتیں لٹاتی نگاہیں۔“

”للی بیٹا اسٹاپ اٹ سمرہ بھائی کے لیے چائے لاؤ۔“

”جی پاپا۔“ سمرہ اٹھنے لگی تو ہیشم نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

میرے خیال میں چائے رہنے ہی دیں فی الحال للی صاحبہ کی باتیں ہی کافی ہیں اسٹرانگ ود آؤٹ شوگر جیسی۔

”ارے نہیں ہیشم بیٹا یہ آنے والے ہر شخص کے بارے میں کچھ اندازے لگا لیتی ہے پھر اس سے پرکھتی رہتی ہے لیکن بہت پیاری محبت خیال رکھنے والی بچی ہے۔“ ڈاکٹر رشید نے اس کا دفاع کیا مگر وہ خاموش رہا پھر بولا۔

”یہ انصاف تو نہیں کہ بنا کسی تصدیق کے ہم کسی کے کردار پر ریمارک دیں۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو للی تمہیں ہیشم سے اس مس بی ہیویر کی سوری کرنی چاہیے۔“

”جی پاپا ضرور کرنی چاہیے مگر جو بات تصدیق شدہ ہو اس کا کیا کرنا چاہیے انکل۔“ للی کا لہجہ چڑانے والا تھا او [illegible] والا ہی تھا کہ پاپا نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ہو سکتا ہے کہ کوئی غلط فہمی ہو یوں ایک دوسرے سے دل میلا نہیں کرتے چلو للی ہیشم کے لیے تم چائے بناؤ۔“

سمرہ تو ہیشم کے منع کرنے کے باوجود چائے بنا لائی تھی دونوں کی محاذ آرائی دیکھ رہی تھی مگر جب پاپا نے کہا

تو سمرہ مطمئن ہو گئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ للی سب کو ڈل سکتی ہے مگر پاپا کو نہیں۔

سو وہ نہ چاہنے کے باوجود چائے بنانے بیٹھ گئی سرہلکٹ کی پلیٹ کیک چھوٹی ٹیبل پر رکھنے لگی۔

ہیشم سمرہ کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا اس میں اور ستارہ میں کتنی مشابہت تھی وہی چپ چاپ کام کیے جانا آنکھوں میں زندگی مگر پر شور دریا کی مانند نہیں بلکہ بہتے جھرنے کی طرح قدم قدم چلے پھر بھی صدا نہ دے۔

”لیجیے ہیشم ولی صاحب چائے۔“ للی نے اسے غور سے سمرہ کو گھورتے ہوئے دیکھا تو ناپسندیدگی سے چبھتے ہوئے لہجے میں مخاطب کیا وہ چونکا کیک کے ساتھ چائے کا سپ لیا تو بے ساختہ بولا۔

”آپ کے ہاں شکر دان رکھنے کا رواج نہیں مس للی۔“

”ہے مگر شکر ہر ایک کے کپ میں انڈیل دینے کی روایت نہیں۔“

”للی چائے میں چینی نہیں ڈالی کیا۔“ پاپا نے پوچھا مگر اس نے سنے بغیر کہا۔

”سنیے مس للی میں یہاں انکل کی عیادت کے لیے آیا ہوں کسی کو مانگنے نہیں۔“ سمرہ نے بے بسی سی پاپا کو دیکھا مگر پاپا بہت مطمئن تھے ڈاکٹر رشید چائے میں یوں مگن تھے جیسے چائے ہی دنیا کا اصل مسئلہ ہو ہاتھ میں چائے کا کپ ہو تو ہر جنگ جیتی جا سکتی ہے۔

”لائیے ہیشم بھائی میں چینی ڈال دوں۔“

”نو نو سسٹر مجھے للی کی خواہش کا احترام کرنا چاہیے سوری مس للی آپ آئندہ مجھے یہاں کبھی نہیں دیکھیں گی۔“ پاپا سیدھے ہو کر بیٹھے پھر بولے۔

”ہیشم یہ کیا اتنی معمولی سی نوک جھوک سے بھلا کوئی یوں بھی تعلق ختم کرتا ہے یقین کرو دوبارہ ملو گے ناں تو یہی بہت ویل مینرڈ طریقے سے تمہیں انٹرٹین کرے گی۔“

”لیکن اگر ویل ایجوکیٹڈ ہونے کے باوجود انہیں ویل مینرڈ کے معنی نہ معلوم ہو سکے تو۔“

”تو تمہیں کسی جنگل میں منگل منانے کا لطف آ جائے گا ہماری للی تیکھے بڑے مزے کے ہوتی ہے آزما کے دیکھ لو۔“ ڈاکٹر رشید نے طرح دی تو وہ ہنسا۔

”سوری سر ابھی میں زندگی سے اتنا بھی عاجز نہیں ہوں کہ ان کی بھینٹ چڑھا دیا جاؤں۔“ وہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ پاپا نے دیکھا تو کہا۔

”ارے بس ابھی سے چل دیے کچھ دیر تو اور بیٹھو نا بیٹا۔“

”آپ کے قرب میں کچھ لمحے گزارنا میری لیے کسی اعزاز سے کم نہیں لیکن اب یہ ملاقات آپ کے دفتر ہی میں ہو گی آپ دفتر کب تک جوائن کریں گے۔“ وہ ہاتھ تھام کر کہنے لگا تو پاپا ہنس پڑے۔

”تم جیسے پیارے بچوں کی محبت مجھے زیادہ بیمار رہنے کہاں دے گی گڈ بوائے، دو تین دن میں، میں دفتر جانے لگوں گا۔“ انہوں نے کہتے کہتے ڈاکٹر رشید کی طرف دیکھا تو وہ مسکرائے۔

”تو پھر ٹھیک ہے چار دن بعد ہی سہی ملیں گے پھر آپ سے بہت سی باتوں سمیت۔“

”کیوں نہیں میرے! سارا وقت تمہارا ہے بلا جھجک آ جاؤ کسی بھی وقت۔“ پاپا نے کہا تو وہ ان سے مل کر

آگے بڑھ گیا۔

للی نے اس دن پاپا کے چہرے کے متغیر رنگ دیکھا تو تھا مگر سمرہ کی وجہ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا لیکن اس کے دماغ میں کھچڑی پک رہی تھی، سو جب کافی دن بعد خود سمرہ نے کہا روشن گوہر سے پاپا کی تلخی کا راز کیوں نہ ڈھونڈا جائے تو وہ ہنس پڑی چٹکی بجائی اور پھر تیسرے دن اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

”کیا لاٹری نکل آئی؟“

”سمرہ کی بچی روشن گوہر کے آرٹ کلب میں رکنیت مل گئی ہے، میں کل سے ان کے نئے سال کی شروع ہونے والی فائن آرٹ کی کلاسز لوں گی۔“

”آرٹ کلب میں روشن آنٹی کیا کچھ سکھاتی ہیں۔“

”آرٹ کے زمرے میں جو کچھ آتا ہے تمہاری روشن گوہر آنٹی وہ سب کچھ سکھاتی ہیں ماڈلنگ مصوری اور مصوری کی تمام اصناف یعنی پین اینڈ انک ورک ریلسٹک، واٹر کلر آئل پینٹ پینسل کلر وغیرہ کلاسیکی موسیقی اور......“

”یعنی اتنا کچھ سکھاتی ہیں روشن آنٹی، وہ مینج کیسے کرتی ہیں یہ سب اس کے لہجے اور آنکھوں میں حیرت عود آئی تو للی اس کے بیڈ پر چوکڑی مار کر بیٹھ گئی۔ پھر بولی

”وہ یہ سب تنہا تھوڑی کرتی ہیں، وہ اس ادارے کی اعزازی سربراہ بنائی گئی ہیں یوں سمجھو، اس ادارے کے کرتا دھرتاؤں نے ان کے نام کو کیش کیا ہے وہ صرف آرٹ سے منسلک ہیں ہاں لیکن معلومات کے مطابق انہیں ہر صنف آرٹ میں بہت زیادہ شد بد ہے۔

تو پھر تمہیں ہر شام کلب سے پک کرنے تو آ سکتی ہوں ناں۔“

”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن اگر تمہارا سینٹی مینٹل موڈ روشن آنٹی کہہ کر ان سے لپٹ گیا تو جبیر انکل سے بے بھاؤ کی سننے کو ملیں گی مجھے، اور وہ تعلق توڑنے والا معرکہ وہیں دم توڑ دے گا سمرہ ڈیئر، مجھے تو وائلن بجانا بھی نہیں آتا کہ ایسے موقع پر ہی کوئی بیراگی دھن چھیڑ کر دل کی بھڑاس نکال سکوں۔“

”یعنی میں تمہیں لینے نہیں آؤں۔“ اس نے مایوسی سے دیکھا تو اس نے کہا۔

للی اسے منانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ کمرے کا انٹرکام بجا للی نے ریسیور اٹھایا پھر بولی۔

”بس پانچ منٹ میں آتے ہیں انکل۔“ پھر سمرہ کی طرف رخ کر کے کہنے لگی۔

”جلدی جلدی برش کرو انکل ناشتے پر ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔“

”اوہو، مجھے تو یاد ہی نہیں رہا آج بہت اہم میٹنگ تھی میری پاپا کے ساتھ۔“ جلدی سے اس نے چٹیا سے بل ڈالے پھر کوٹ شوز پیر میں ذاتی کینوس بیگ سنبھالتی للی کے ساتھ کھانے کے کمرے میں پہنچی پاپا ناشتہ لگ جانے کے باوجود ان دونوں کے منتظر تھے۔

”آج صبح ہی صبح کیا باتیں ہو رہی تھیں بھئی۔“ پاپا نے کپ میں چائے انڈیلی۔

”کوئی خاص بات نہیں تھی پاپا، للی نے آرٹ کلب جوائن کیا تھا بس یہی بات بتانے وہ دوڑی آئی تھی۔“ پاپا نے کچھ کہنے کو سر اٹھایا پھر للی سمرہ کے چہرے کا اطمینان دیکھا تو سر جھکا لیا اور دل میں سوچا۔

''یہ تمام بچے یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ ان کی جھوٹی سچی تاویلوں سے ان کے بڑے مطمئن ہو جاتے ہیں حالانکہ وہ جس عمر کی طرف قدم بڑھاتے ہیں اس عمر کا تجربہ تو ان کے پاس پہلے سے موجود ہوتا ہے یہ تو درگزر ہوتی ہے جسے بچے سمجھتے ہیں انہوں نے اپنے بڑوں کو حرف عام میں بے وقوف بنالیا۔

آرٹ کلب جوائن کرنا درحقیقت اصل خوشی نہیں اصل خوشی تو روشن گوہر تک پہنچ جانے کی ہے کل ہی تو ظفر صاحب نے انہیں للی کی اس ضد اور کارنامے سے آگاہ کیا تھا اور انہوں نے بروقت انہیں سمجھایا تھا کہ بچوں کو اپنی خوشی سے جلنے، دو ورنہ اپنی مرضی سے تم اس وقت تو چلا لو گے انہیں کہ تم میں توانائی ہے لیکن جب تم کمزور ہو جاؤ گے تو اپنی خواہش نہ پوری ہونے کی خفگی میں یہ سرکش بچے ہر اس راستے سے خود کو دور کرلیں گے، جہاں تمہارے طلے تمہارے نقش قدم کا گماں بھی ٹھہرے گا تم تنہا رہ جاؤ گے۔

ظفر صاحب نے یہ باتیں سنیں یا نہیں مگر بہرحال للی نے آرٹ کلب جوائن کرلیا تھا۔

''روشن تم نہ جانے فلک محبت کو کونسا سیارہ ہو کہ ہر سیارہ تمہاری طرف کشش کرتا ہے مگر تم خود کسی کے محور کے گرد چکر نہیں لگاتیں، نہ جانے تم کیا ہو روشن گوہر نہ جانے کتنے دل اور تسخیر کرو گی تم اور کتنے دل۔''

''پاپا آپ ناشتہ کیوں نہیں کر رہے۔'' سمرہ نے سر اٹھا کر حیرت سے دیکھا منہ چلاتی للی نے بھی پاپا کے چہرے کے ملال اور بے قراری کو نوٹ کیا مگر کہا کچھ نہیں پاپا نے بھی تمام توجہ ناشتے کی طرف مرکوز کردی یہ اور بات کہ اب بھی نگاہ صرف سمرہ کے گرد دعا کی طرح مرتکز ہو رہی تھی خوف میں ڈوبی ہوئی جدائی سے لرزتی ہوئی۔

''میں تو چلی بھئی آٹھ بجے کلاس شروع ہو جائے گی۔'' وہ بیگ سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی پاپا کا دل چاہا للی کو روک دے کہ جدائی کا راستہ ہموار کرنے مت جاؤ للی، تم اور سمرہ مل کر جو عقدہ حل کرنا چاہتی ہو اس پر پردہ ہی پڑا رہنے، ورنہ تمہارے انکل کے پاس کچھ نہ بچے گا جینے کو۔'' وہ کہنا چاہتے تھے۔ مگر کہہ نہ پائے اور للی ان کی نظروں سے اوجھل ہوئی اور سمرہ نے محسوس کیا اس کے پاپا اس کے سامنے ہونے کے باوجود اس کے سامنے نہیں تھے۔

للی روشن گوہر کے سامنے تھی اس [illegible] اد اس کی رگ رگ سے جھلک رہا تھا روشن گوہر ہر اسٹوڈنٹ سے تعارف لیتی اس کے سامنے آئیں تو اس نے ادا سے کہا۔

''شیکسپیئر کہتا ہے، گلاب کے پھول کو گلاب نہ کہا جائے وہ تب بھی خوشبو دیتا ہے اور خوشبو نام و نسب کے چکر میں نہیں پڑتی۔''

تمام کلاس نے حیرت سے دیکھا اور روشن گوہر نے اطمینان سے اور پھر کہا۔

''میں جانتی ہوں خوشبو کا کوئی نام نہیں ہوتا، مگر میں تمہیں کس نام سے پکاروں گی یہاں مخاطب کے لیے کوئی نہ کوئی اسم تو ہونا چاہیے نا بیٹا۔''

للی نے ان کی آواز کی شیرینی سے خود کو ڈوبتا تسخیر ہوتا پایا تو شان بے نیازی سے کہا۔

''للی کہتے ہیں مجھے۔''

''بہت اسم بامسمی ہو۔'' وہ مسکرائیں۔

''اصل نام جان کر آپ اس سے بھی زیادہ تعریف کریں گی۔''

"یعنی کیا ہے اصل نام۔" انہوں نے دلچسپی لی تو اس نے شرٹ کالر درست کیا پھر بولی۔

"لیلیٰ ہے میرا نام، مگر میرے والدین میں سے کوئی بھی محبت کی وجہ سے واقف نہیں۔" کئی دبے دبے قہقہے گونجے روشن گوہر نے طائرانہ نگاہ ڈالی کہا کچھ نہیں اور پوری کلاس ڈسپلن کی فضا میں لوٹ آئی۔ اور لیلیٰ اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔

پھر محترمہ روشن گوہر نے پہلے دن انہیں جو کچھ سکھایا تو لیلیٰ کی بوریت سوا ہوگئی یہ سب تو اسے پہلے ازبر تھا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اس کا اور یہ یہاں سے شروع کر رہی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی رہی جب اچانک وہ اس کی طرف پلٹیں۔

"کیوں لیلیٰ تم دھیان نہیں دے رہیں۔" صاف کینوس دیکھ کر محترمہ روشن گوہر نے حیرت سے دیکھا تو وہ کسمسائی۔

"میڈم یہ سب تو میں بچپن میں حفظ کر چکی ہوں۔" انہوں نے سنا تو ہنسنے لگیں۔

"مجھے پہلے دن تمہارے ہاتھ کہ مہارت اور تکنیک دیکھ کر اندازہ ہوگیا تھا مگر بیٹا یہ بھی تو دیکھو، وہ سب تم نے بنا کسی استاد کے سیکھا ہے ہوسکتا ہے میں بحیثیت استاد تمہارے اس فن میں کسی نئے دریچے کو کھول دوں، ہوسکتا ہے میرے سمجھانے پر کوئی اور اچھوتا خیال سوجھ جائے تمہیں اسے یوں کو جیسے یہ سب سامنے کینوس پر کھینچی ہوئی لکیر دیکھ رہے ہیں مگر یہ صرف ان کے لیے ایک لکیر ہے مگر میری نظر میں نامعلوم سے معلوم کی طرف کا پہلا نقطہ ہے کسی راستے کا پہلا نشان کسی منزل کی پہلی سمت کسی آنے والی کل کا آج ہے تم سمجھ رہی ہو نا لیلیٰ۔" انہوں نے اسے دیکھا تو لیلیٰ ان کی باتوں میں اپنا مشن بھول کر واقعی کینوس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

پہلی لکیر واقعی اس کے لیے نیا در کھول گئی تھی یہ لکیریں تو اس نے ہر تصویر بنانے سے پہلے کینوس پر لگائی تھیں مگر اس نے واقعی خط کو اتنے گہرے معنوں میں نہیں پرکھا تھا۔

"تھینکس میڈم آپ نے واقعی مجھے دیکھنا سکھا کر میرے اندر کے کئی بند دریچے کھول دیے اب میں چیزوں کو صرف سطحی انداز سے نہیں دیکھوں گی۔" کلاس کے اختتام پر اس نے چیزیں سمیٹتے ہوئے پورے احترام سے کہا تو روشن گوہر مسکرانے لگیں پھر بولیں۔

"تمہارے متعلق میں نے جو اندازہ لگایا تھا مجھے خوشی ہے تم اس سے مختلف نہیں ہو۔"

"آپ نے میرے متعلق کیا اندازہ لگایا تھا میڈم۔" اس نے تیزی سے پوچھا شاید آواز بھی تیز ہوگئی تھی غصے میں نہیں تجسس میں کہ وہ تو عمر بھر خود کو کورڈ کر کے ان ڈسکورڈ جزیرہ رہی تھی کامیاب بھی تھی اس کوشش میں مگر یہ روشن گوہر کہہ رہی تھیں کہ وہ پہلے ہی دن اسے جان چکی ہیں۔

"آپ نے بتایا نہیں میڈم آپ نے میرے متعلق کیا اندازہ لگایا۔"

"کوئی خاص نہیں سوائے اس کے کہ تم محبت پر بلیو کرتی ہو مگر محبت سے متنفر دکھائی دینے کی کوشش کرتی ہو تمہارے اندر ایک حساس دل ہے مگر بظاہر تم نے خود پر ہارڈ اسٹون لیبل چسپاں کرلیا ہے۔" اس نے سنا تو فوراً پوچھا۔

"آپ کو کیسے پتا کہ میں حساس دل ہوں۔" انہوں نے سنا تو ہنس کر بولیں۔

"سامنے کی بات ہے مائی چائلڈ حساس دل ہی ان آرٹ کے رہگزاروں میں قدم دھرتے ہیں، بقول سب کے وقت برباد کرتے ہیں مگر درحقیقت اپنا کھوج لگا کر امر ہو جاتے ہیں۔" اس نے مزید جواباً کوئی چبھتا ہوا جملہ نہ کہا مبادا کوئی اور پرت نہ کھل جائے اور آہستگی سے باہر نکل آئی۔

ڈرائیور کو وقت کا بتا کر کہا تھا کہ پک کر لینا مگر دور دور تک کوئی دکھائی نہ دے رہا تھا وہ کینوس کا بڑا سا بیگ کاندھے سے لٹکائے سڑک پر چلنے لگی تاکہ مین اسٹاپ سے کوئی ٹیکسی یا رکشہ کرے، مگر ابھی اس نے چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ کالی نیو سوزکی مرگلا اس کے قریب آ کر رکی چہرہ دیکھا تو برا سا منہ بنایا۔

”کہاں جائیے گا، آئیے میں آپ کو چھوڑ دوں۔“ للی نے غور سے دیکھا اور سوچا کیا برا ہے سڑک پر کھڑے ہونے سے بہتر ہے وہ اس کی آفر قبول کر لے وہ کوئی عام لڑکی تو نہیں تھی، دوستوں میں مردمار مشہور تھی۔ اس لیے اگر محترم زیادہ پھیلنے کی کوشش کرتے تو سارا نام نسب رٹوا دیا جاتا۔

”اوکے۔“ وہ فیصلہ کر کے اس کے برابر بیٹھ گئی کار سبک رفتاری سی چلنے لگی۔ حسن عمار نے اسے گہری نظروں سے دیکھا پھر بولا۔

”آج نصیب دشمناں کہاں کا قصد تھا وہ بھی اتنی تیز چلچلاتی گرمی میں۔“

”آپ نہ بھی بتاتے تب بھی کار کی ٹھنڈک بتا رہی ہے کہ یہ ایئرکنڈیشنڈ ہے۔“

”ارے توبہ آپ تو سیدھی سی بات غلط سمجھیں، میں تو پوچھ رہا تھا آج آپ کہاں ماری ماری پھرتی رہیں؟“ اس نے اسے توجہ سے دیکھا پھر کہا۔

”کھوج میں نکلی تھی اپنی، اپنی ذات کی، اس طرح۔ دیکھیے، کا شوق ہے مجھے بس یہی شوق یہی جنون پھرائے پھرتا چہار وقت۔“

”کیا مطلب“ حسن عمار نے چہرے پر سنجیدگی طاری کی یہ اور بات کہ اس کا دل اور دماغ بیشم ولی کی شان میں قصیدہ پڑھتے ہوئے جھوم رہا تھا۔ (یار کیا ساری دنیا میں عشق لڑانے کے لیے یہی خبطی لڑکی رہ گئی ہے۔ بیشم ولی تیرا بیڑا پار ہے۔)

”آپ کا مطلب بہت طویل نہیں ہو گیا مسٹر حسن۔“ اس نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے خاموشی کو توڑا، تو وہ تھوڑا سا ہوش میں آیا پھر غائب دماغی اور بے پرواہی آنکھوں میں بھر کر بولا۔

”یعنی طویل خاموشی میں صرف اس لیے محسوس ہوا کہ آپ کا جواب۔ وہ میری سماعت نے نہیں سنا اور جو چیز سنی نہ ہو اس پر رائے دینا میرا شیوہ نہیں۔“

”مگر حسن صاحب آج تو ہر شخص کا مزاج یہ ہے کہ ہم جو چیزیں نہیں دیکھتے جو نہیں سنتے اس پر زیادہ جان دار بحث کرتے ہیں بلکہ عالمی مثالوں میں ان ہی ان دیکھی چیزوں پر مقالے پڑھ کر داد سمیٹتے ہیں اور اعزاز بھی پاتے ہیں۔“

”مثلاً وہ اندیکھی چیزیں کیا؟“ للی۔

”کسی کا کردار بھی ہو سکتا ہے، زندگی بھی ہو سکتی ہے، اس سے منتھی جذبے بھی، اس مثلاً میں تو بہت کچھ آ سکتا ہے میں بھی آپ بھی مسٹر حسن۔“ ”ہو سکتا ہے ایسا ہو، لیکن مجھے کسی پبلک ٹاک کا ٹاپک بننے کا زیادہ شوق نہیں۔“

”حالانکہ آپ سر سے لے کر پیر تک ایک پبلک ٹاپک ہی ہیں۔“

”کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟“

”یہی کہ آپ اس معاشرے کی طرح کرپٹ ہیں، مسٹر حسن عمار اور کرپشن کا موضوع آج کل زبان زد عام ہے۔“

"لاحول ولاقوۃ، دیکھیے مس للی آپ ٹمپریچر لوز کر رہی ہیں۔" وہ سیدھی چوٹ کیسے برداشت کرتا اکھڑنے ہی لگا تھا کہ اس نے ایک طرف اشارہ کر کے کار روکنے کو کہا۔ پھر اترتے ہوئے بولی۔

"ہمیں ہمیشہ صرف اپنی زبان سے بولنا چاہیے مسٹر حسن عمار، کسی کے رٹائے لفظ یاد کر کے رٹو طوطا نہیں بننا چاہیے۔" اس کی بات سن کر حسن نے جل کر کار اسٹارٹ کی تو وہ ہنستی ہوئی سڑک کراس کر کے اپنی کوٹھی کی طرف بڑھ گئی۔ ڈرائنگ روم میں قدم رکھا ہی تھا کہ فون رکھتے پاپا نے تیغ نگاہ سے اسے دیکھا بولے۔

"سیکھ آئیں فائن آرٹ۔"

"ابھی کہاں پاپا، ابھی تو صرف لکیر کھینچنا سیکھی ہے لیکن خوشی اس بات کی ہے پہلے ہی دن دیکھنا سیکھ گئی۔"

"یہ دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ تو ہو سکتا ہے، مگر خیر میں مان لیتا ہوں کہ تم نے دیکھنا سیکھ لیا پھر اس سیکھ لینے سے مجھے کتنا فائدہ ہوگا اور تمہیں کیا ملے گا۔" تمسخرانہ انداز میں پاپا نے لائٹر سے نیا سگار جلا لیا تو وہ صوفے پر ڈھے گئی پھر بولی۔

"دنیا کا اصل مسئلہ یہی تو ہے پاپا کہ ہم میں سے کسی کو دیکھنا نہیں آتا ہر چیز کو ہم بالکل سطحی انداز میں دیکھتے ہیں ہم جیتے جاگتے انسان ہیں ہمیں جینے والوں کی طرح جینا چاہیے نا، ہم سب ایک مخصوص وقت کے لیے ہیں پاپا یہ وقت بہت تھوڑا ہے جب کہ ہم نے تو ابھی ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں ٹھیک سے جانا بھی نہیں۔"

"للی مجھے لگتا ہے تیز دھوپ میں چل کر آنے سے تمہارا دماغ ٹھیک کام نہیں کر رہا۔" وہ گھبرا کر کہنے لگے تو وہ مسکرائی۔

"آج ہی تو اس دماغ کی بیٹری چارج ہوئی ہے پاپا آج ہی تو مجھے پتا چلا ہے کہ ایک دکھ نایاب ہوتا ہے جو دکھ آپ میں سوچ کی نئی کھڑکی کھول دے وہ دکھ نہیں ایک اپروچ سے دوسری اپروچ تک کا راستہ ہے پُر خار سہی مگر یہ مسافت آپ کو کرنے نہیں دیتی سچی محبت سچی خوشی میں سب سے اول اور مونس آپ کا ہم نشین آپ کا سچا دکھ ہوتا ہے۔"

"تم کیا کہہ رہی ہو، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا للی، کاش میں تمہارے انداز میں سوچ سکتا یا تم وہ ہوتیں جو میری تمنا تھی تمہارے ہوتے ہوئے بھی میں کتنا تنہا ہوں للی مگر تم کیا جانو یہ بات۔" للی نے سنا مگر کچھ کہے سنے بغیر اٹھ گئی پھر اس نے اپنے بیڈ روم کا دروازہ کھولا تو لگا طویل و عریض کمرہ بھی اس کی طرح تنہا ہو۔

"یہ کمرہ تو ہمارے دل کی طرح ہی تنہا ہے ہمارے وجود کو جذب کرنے کی تمنا میں تڑپتا ہوا بالکل ایسے جیسے مجھے آپ کی محبت سے دل کا دامن بھرنے کی تمنا ہے مگر پاپا آپ کیا جانیں کہ آپ نے تو اتنے برس گنوا کر بھی دیکھنا نہیں سیکھا۔" بیگ صوفے پر اچھال کر وہ جوتوں سمیت بیڈ پر گر گئی پھر تھکن کب نیند بن کر اس کے حواسوں پر چھائی اسے معلوم نہیں۔

پاپا لائبریری میں بیٹھے کوئی کتاب دیکھ رہے تھے کہ سمرہ نے پشت سے آ کر ان کی آنکھیں بند کر لیں۔

"بھلا بتایئے تو کون؟" سمرہ کے ساتھ آنے والے بوڑھے نصیر بابا لرزتی آواز میں بولے تو پاپا ہنسے اور بولے۔

"اس قدر پیارے ہاتھ تو صرف ہماری بیٹی کے ہو سکتے ہیں کیوں نصیر بابا ٹھیک کہا نا۔"

"جی صاحب۔" نصیر بابا آسودگی سے ہنسنے لگے اور سمرہ پاپا کے گلے میں جھول گئی، پھر ہنستے ہوئے بولی۔

"گھر میں صرف ہم دو ہی تو ہیں اس لیے آپ نے جلدی سے پہچان لیا ہم زیادہ بہن بھائی ہوتے تو پوچھتی

کیسے پہچانتے مجھے۔" پاپا نے آنکھیں بند کر لیں پھر بولے۔

"بعض چہرے، بعض لوگ کسی بلاواسطہ یا بالواسطہ رابطے سے نہیں پہچانے جاتے سمرہ ان کی صرف ایک پہچان ہوتی ہے اور وہ ہوتی ہے محبت اور یہ بھی کہ ہم کس سے کس قدر محبت کرتے ہیں بعض لوگ برسوں ساتھ رہیں تب بھی ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکتے اور بعض لوگ چند دنوں میں ہمیں اتنے عزیز ہو جاتے ہیں کہ محض ان کے قدموں کی چاپ سے ہم انہیں پہچان لیتے ہیں یعنی ثابت ہوا محبت اول و آخر ہے باقی سب بعد میں آتا ہے۔"

"آپ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ مجھے بے پناہ چاہتے ہیں۔" اس نے بے سبب پوچھا اور پاپا نے کھینچ کر اسے سینے سے لگالیا پھر بولے۔

"تمہارے اور لنی کے سوا اور کوئی ہے بھی، جسے میں اس قدر چاہوں میری زندگی تم دونوں ہی تو ہو۔" اور اس کی آنکھیں اس سچ پر مسکرا اٹھیں پاپا نے اسے سامنے کیا پھر لنی کا پوچھنے لگے۔

"تین چار دن ہو گئے لنی کو دیکھا نہیں کیا بات ہے آپس میں کوئی ناراضگی تو نہیں تم لوگوں کی۔" وہ ہنسنے لگی پھر بولی۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں پاپا دراصل آج کل وہ آرٹ کلب میں بہت مگن ہے نا اس لیے مجھ سے خود بھی اس کی ملاقات نہیں ہوتی فون کرتی ہوں تو وہ بھی انگیج ملتا ہے جانے کا سوچتی ہوں تو دفتر کی مصروفیات آڑے آ جاتی ہیں اور میں۔"

"مگر سمرہ بیٹا یہ ہونا تو نہیں چاہیے، جن لوگوں سے ہم محبت کرتے ہیں یا جو ہم سے محبت کرتے ہیں انہیں ہمیں اس طرح مصروفیتوں کے درمیان اگنور تو نہیں کرنا چاہیے یہ دفاتر یہ کام تو ساری زندگی چلتے رہتے ہیں مگر بیٹا دوستیاں، محبتیں، خلوص بہت کم کم ملتا ہے جہاں میں، اس لیے اسے رد کرنے کی بجائے دھڑکن بنا کر ہمیشہ دل میں چھپا لینا چاہیے۔"

"سوری پاپا مجھے واقعی لنی کا خیال رکھنا چاہیے تھا، وہ ہی دوڑی چلی آتی ہے مجھے دراصل اس لیے یہ غیر معمولی بات نہیں لگی شاید مجھے اس وقت بھی امید تھی کہ وہ ہی مجھ تک آئے گی جب کہ درحقیقت مجھے خود بھی اس تک جانے کے راستے ہموار رکھنے چاہئیں، ایک دم سے متروک یا ناپختہ راستوں پر اچانک چلنا پڑے تو پاؤں بھی زخمی ہوتے ہیں، اور شاید دل بھی۔"

"یس مائی چائلڈ تم بالکل درست انداز میں سوچ رہی وہ، ہو سکتا ہے اس بار وہ بھی تمہارے ہی آنے کی منتظر ہو اپنے گھر کے دروازے پر۔"

"میں کل دوپہر کو لنچ اس کے ساتھ ہی کروں گی پاپا۔" اس نے یقین دلا دیا تو پاپا نے نگاہ پھر سے کتاب کی طرف موڑ دی۔

اور دوسرے دن حسب وعدہ اسے پک کرنے وہ کلب پہنچی تو لنی کو روشن گوہر سے کسی بات پر الجھتے پایا سمرہ سوچ میں پڑ گئی آگے بڑھے یا انتظار کرے، کشش تو اس کشاں کشاں ان کی طرف کھینچے لے جا رہی تھی مگر پاپا سے کیا وعدہ اس کی راہ روکے کھڑا تھا سو اس نے کتنی دیر بعد فیصلہ کیا کہ اسے لنی سے اس وقت نہیں ملنا چاہیے اور سوچ کر وہ

چپ چاپ واپس کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی لیکن ابھی اس نے کار اسٹارٹ نہیں کی تھی کہ للی کی اچانک اس پر نظر پڑ گئی۔ وہ دوڑتی ہوئی آئی اور اسے زبردستی کار سے نکالا پھر بغل گیر ہوئی۔ روشن گوہر دلچسپی سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ خود اس کے بارے میں کچھ پوچھتیں للی نے ہی تعارف کروایا۔

"یہ سمرہ عبیر ہے میری بیسٹ فرینڈ اور سمرہ یہ میری آرٹ ٹیچر ہیں تمہاری طرح میری بیسٹ ٹیچر۔" روشن گوہر نے بے تکلفی سے اس کا کان مروڑا پھر بولیں۔

"سمرہ اس کی باتوں میں ہرگز نہیں آنا یہ سب کو اپنا بیسٹ بتاتی ہے حالانکہ یہ نہ خود کسی کی بیسٹ ہے نہ کسی کو حقیقت میں بیسٹ سمجھتی ہے۔"

"میڈم یہ تو ناانصافی ہے آپ کے بارے میں تو میرے ریمارک سو فیصد سچے تھے۔" للی بسورنے لگی۔ تو انہوں نے اس کا شانہ تھپکا۔

"اوکے اوکے تم کہتی ہو تو مان لیتی ہوں کہ میں بھی تمہارے خاص لوگوں میں ہوں۔" سمرہ باتوں کے درمیان بھی نظر ہٹائے بغیر ان ہی کو تک رہی تھی انہوں نے پلٹ کر اس سے پوچھا۔

"کیوں بیٹا تمہیں بھی آرٹ سے دلچسپی ہے۔"

"نو میڈم" سمرہ نے گڑبڑا کر کہا اور للی ہنس پڑی۔

"درحقیقت، آرٹ اس کے خون میں شامل ہے میڈم اس کے پاپا یعنی میرے انکل بہترین شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے سنگ تراش بھی ہیں، یہ اور بات کہ آج کل ان کا بزنس انہیں موقع نہیں دیتا ورنہ اگر وہ اس میدان میں آ جاتے نا تو بہت ساروں کے بستر گول کر چکے ہوتے اب تک۔" روشن گوہر دلچسپی سے للی کی ساری باتیں سن رہی تھیں کہ کلب کی گاڑی ان کے قریب آ رکی تو وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولیں۔

"سوری للی بیٹا، اب اجازت چاہوں گی۔" وہ وین میں بیٹھ گئیں تو للی اس کی طرف مڑی پھر بولی۔

"ایسا نہیں لگا تھا آخری لفظ جیسے صرف انہوں نے تمہارے لیے کہا تھا۔"

"چلو دماغ مت خراب کرو کیونکہ ابھی تمہیں اتنے دن غیر حاضر رہنے پر صلواتیں بھی سنانی ہیں پتا ہے کتنی پریشان ہو گئی تھی میں۔"

"کوئی نہیں ہوئیں تم پریشان تم نے تو ایک لمحے کے لیے بھی مجھے نہیں سوچا میں اتنے دنوں سے ملی نہیں تم سے تو کیا سب خبر تو رکھی ہے نا تمہاری، ہر روز اسی شان سے دفتر جاتی، اور فائلوں پر دستخط کرتے وقت اطمینان سے چیونگم چبا رہی تھیں کیا کچھ غلط کہا میں نے۔"

"بالکل غلط کہا۔" وہ صاف مکر گئی تو للی ہنسنے لگی پھر بولی۔

"محبت کی جانچ کا آلہ ہوتا ہے ہر دل میں کوئی اسے چارج کر لیتا ہے کوئی اس پر توجہ نہیں دیتا اور سمرہ ڈیئر میرے دل کا یہ آلہ، پیمانہ محبت چارج ہو چکا ہے اس لیے مجھے مل کر، دیکھ کر، سن کر، ہی کچھ ایقان ہو جاتا ہے کہاں مجھے یاد رکھا گیا، کہاں نہیں رکھا گیا ایسے جیسے بعض قریبی لوگوں سے مل کر ان کی تمام تر محبت لٹانے پر بھی ہمیں لگتا ہے جیسے ان کے دل میں کہیں نہ کہیں گرہ لگی ہوئی ہے اور کہیں کسی سے اچانک اور پہلی مرتبہ ملو تو لگتا ہے روح سیراب ہو گئی ہے یہ سب اس

حسن کا کرشمہ ہے سمجھیں تم۔" پھر ابھی وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہی تھی کہ کالے رنگ کی مرگلا پھر اس کے قریب آ رکی۔

"ارے آج تو بڑے لوگ آئے ہوئے ہیں... کیوں مس للی ہمیں بھی شرف ملاقات بخشوا دیجیے۔"

"سوری یہ قطعی میرا ذاتی معاملہ ہے مسٹر حسن عمار اور آپ سن لیجیے کہ آئندہ یہاں مت دکھائی دیجیے گا میں ہر روز شرافت کی زبان میں آپ سے بات کرتے کرتے تھک چکی ہوں اس لیے کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے کوئی غلط راستہ چننا پڑے۔"

"غلط راستہ...... مس للی اگر آپ غلط راستے پر بھی چلیں گی تو بائی گاڈ وہ آپ کے قدموں سے سنورتا چلا جائے گا اور مجھے آپ کے نقش قدم پہ چلتے ہوئے خوشی ہوگی۔"

"کیوں خوشی ہوگی آپ کو کیا میں آپ کی بزرگ ہوں یا آپ میرے دست راست ہیں جو میرے نقش قدم پر چلتے ہوئے آپ خوش نصیبوں کی فہرست میں شامل ہو جائیں گے۔" اس نے غصہ سے ایسے دیکھا کہ حسن عمار کے چودہ طبق روشن ہو گئے مگر وہ پھر بھی ڈھٹائی سے جما رہا۔

"آپ مانیں نہ مانیں میں ہی آپ کی منزل ہوں؟؟؟؟"

"اور آپ بھی سمجھ لیں، مجھے منزل سے کبھی دلچسپی نہیں رہی راستے، مسافتیں، مجھے زیادہ متاثر کرتے ہیں۔"

"آپ کہہ کر تو دیکھیے اس رنگ میں نہ ڈھل جاؤں جو آپ کا من بھاتا ہے تو کہیے گا۔" سمرہ نے حیرت سے حسن عمار کی طرف دیکھا اور للی کار سے منہ باہر کر کے بجلی سی شان بے نیازی سے بولی۔

"کسی چیز کو ثابت کرنے کے لیے قطعاً محنت مت کیجیے گا کیوں کہ میں پہلے آپ کو نمبر دو ہی گردانتی ہوں۔"

"مس للی آپ تو بے موت مارنا چاہتی ہیں مجھے، میں آپ کو دل کی گہرائیوں سے چاہ رہا ہوں اور آپ ہیں کہ اسے ڈرامہ بازی سمجھ رہی ہیں۔" اس نے ناکام ہیرو کی شکل بھی بنائی مگر للی نے جواب دینے کی بجائے کار آگے بڑھا دی اور سمرہ تجسس سے حسن عمار کے متعلق پوچھنے لگی اس نے اس کا تجسس دیکھا تو کہا۔

"کوئی خاص بات نہیں بس بے وقوف بنا رہا ہے محترم سمجھتے ہیں سب ان کی طرح ہی بے وقوف ہیں۔"

"کب سے تنگ کر رہا ہے؟"

"جب سے کلب جوائن کیا ہے مگر اپنے لیے نہیں کسی کے کہنے پر۔"

"کس کے کہنے پر۔" اس نے حیرت سے دیکھا تو للی ہنس پڑی۔

"ہیشم ولی کا یار غار ہے تمہیں یاد نہ ہوگا مگر میں جو چہرہ ایک بار دیکھ لوں بھولتی نہیں، جب ہم وہ پینٹنگ خریدنے کے چکر میں اس کے دفتر میں داخل ہوئے تھے تو یہ حسن عمار ہیشم ولی کے بالکل برابر بیٹھا تھا بظاہر سنجیدہ مگر دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے سے بہت کچھ کہہ رہی تھیں پھر حسن عمار چند سیکنڈ بعد اٹھ گیا مگر میری بصارت اسے بھولی نہیں کوئی عجیب بات تھی اس میں۔"

"عجیب بات، اس میں نہیں تم میں ہے للی ڈیئر چند سیکنڈ کسی کا چہرہ دیکھا اور حفظ کر لیا اور آنکھوں کی زبان بھی سمجھ لی بظاہر تو تم میز پر نگاہیں گاڑے بیٹھی تھیں مگر للی ہاؤ اسٹرینج ہی۔" للی ہنسنے لگی پھر دھیرے سے بولی۔

"یہ دنیا میلے کی طرح ہے سمرہ ڈیئر، جہاں نگاہ چوکی وہیں آپ کی عمر بھر کی کمائی لوٹ لی گئی سو ہمیں ہر وقت آنکھیں کھلی رکھنی پڑتی ہیں ورنہ بعد میں چوٹ کھا کر ہوسکتا ہے ہماری آنکھیں بند ہونا بھی بھول جائیں اور پھر اس

معاملے میں اور بات بھی ہے کہ جس طرح حسن عمار میرے لمحے لمحے کی خبر رکھتا ہے تو اس سے مجھے پہلے بھی کچھ شک ہوا تھا پھر میں بھی اسی طبقہ سے تعلق رکھتی ہوں میرا بھی حلقہ وسیع ہے اس لیے میرے لیے پتا لگانا کوئی مسئلہ نہیں تھا کہ حسن عمار ہیشم ولی کا یار غار ہے کہ نہیں یہ پتا چل گیا تو سارے ڈرامے کی پول کھل گئی کچھ وہ باتیں یاد تھیں کچھ فریش معلومات لے لیں اور مسئلہ حل۔" وہ مزے سے بتانے لگی اور سمرہ عمیر حیرت کے سمندر میں ڈوب ڈوب کر ابھرتی رہی یہاں تک کہ کتنی ساعتوں بعد وہ کہہ پائی۔

"للی یار تم بہت عقلمند ہو۔"

للی نے اس کی طرف نگاہ کی، پھر بولی۔ "ہاں میں عقلمند ہوں، میری یہ عقلمندی بھی مجھے کسی منزل تک نہیں پہنچائی، ایک وقت تھا میں نے تم سے کہا تھا ہمیں دیوار کی اُس طرف بھی دیکھنا چاہیے، مگر سمرہ ایک وقت یہ بھی ہے جو میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ دیوار کے اُس طرف بھی اگر یہی کچھ ہوا تو کیا ہوگا یہ جو ایک پردہ ہمارے اور فطرت کے درمیان قائم ہے اسے برقرار ہی رہنا چاہیے۔ ورنہ اگر ہماری امیدوں کے برخلاف کوئی نتیجہ نکلا تو ہم میں تو جینے کی امنگ بھی مرجائے گی۔

زندگی کیا محض ایک امید سے دوسری امید تک کا سفر ایک صحرا سے دوسرے صحرا کی طرف آبلہ پائی ہے ہمیں زندگی کو اسی صورت میں قبول کر لینا چاہیے نا سمرہ۔"

"ہاں مگر اس قدر مایوسی کے ساتھ نہیں للی یہ زندگی امید ہے تو محبت بھی تو ہے یہ محبت جو تم ہو، پاپا ہیں، میں ہوں، زندگی یہ بھی تو ہے اپنی طرف کشش سے کھینچتی ہوئی ہے کہ نہیں۔"

"ہو سکتا ہے ہو، یہی اصل زندگی ہو مگر محبت کو میں نے تو صرف آنکھ کے آنسو، پیر کے چھالے سے پہچانا ہے سمرہ محبت ایسا دریچہ ہے جو ہم سب انسانوں کو اپنی کشش، اپنی طرف اپنے مدار میں محور کے گرد چکر لگانے پر مجبور تو کرتا ہے مگر ہمیں خود کو چھونے نہیں دیتا شاید وہ ڈرتا ہو کہ ہم نے اگر اسے چھو کر دیکھ لیا تو اس کا راز نہ کھل جائے لوگ دست سوال نہ ہو جائیں کہ تو محبت یہ تھی محض چند ہماری آرزو میں جذبوں کی راکھ اور ڈھیر سارا فریب۔"

"للی محبت فریب نہیں ہوتی، بلکہ محبت جب حقیقتاً فریب دیتی ہے تب بھی فریب نہیں ہوتی بلکہ ہمارے وجدان کی ایک بند کھڑکی کھول دینے والی ہوا ثابت ہوتی ہے ہماری سوچ میں پختگی پیدا کرتی ہے کھرے کھوٹے کی پہچان کرنا سکھاتی ہے ہمیں ہم سے ملاتی ہے اور ہمیں......" سمرہ کہے گئی للی خاموشی سے سنتی رہی پھر وہ ہالیڈے ان میں پہنچے تو سمرہ پہلے سے ریزرو کروائی میز کی جانب بڑھ گئی للی نے آرڈر پک کروایا تو سمرہ نے پوچھا۔

"اب سناؤ محترمہ روشن گوہر کے بارے میں کیا معلومات اکھٹی کیں۔" للی نے سر سہلایا۔

"اُفوہ سمرہ دراصل میں یہ مشن تو بھول ہی گئی تھی کہ مجھے تمہاری روشن آنٹی کے متعلق انوسٹی گیشن بھی کرنی تھی ہائی گاڈ میں تو صدق دل سے آرٹ کلب جا رہی تھی۔" اس نے مسکین سی صورت بنائی مگر سمرہ روٹھی رہی۔

"ایک موقعہ اور دے دو، کل جاتے کے ساتھ ہی محترمہ روشن گوہر کو بالا نہ لیا تو کہنا۔" چپ ہو کر وہ کھانے میں مگن ہو گئیں پھر بل پے کر کے اٹھنے ہی والی تھیں کہ ہیشم ولی ایک شخص کے ہمراہ ان کے سامنے ہی آ کھڑا ہوا۔

"کس قدر اتفاق کی بات ہے کہ ہم یونہی کوشش کے بنا ملتے رہتے ہیں۔" للی نے ترچھی نظروں سے ا—

دیکھا اور سمرہ اس کے موڈ خراب ہونے سے سہمتی۔

"آپ شاید آج بھی میرے متعلق غلط اندازے لگا رہی ہیں مس للی۔" للی کی خاموشی کو دیکھتے ہوئے وہ پھر سے کہنے لگا۔ للی کوئی جواب دینے ہی والی تھی کہ اس کے ہمراہ کھڑا شخص سنجیدہ انداز میں انہیں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"مس للی میرا بھائی دراصل کچھ امیزنگ موڈ رکھتا ہے یہ جو کہتا ہے ضروری نہیں اس کا کوئی مطلب بھی ہو اس لیے اگر آپ ناراض ہو رہی ہیں تو ہم پھر کبھی مل لیں گے، ملاقات تو دوستانہ ماحول میں ہو، تب ہی اچھی رہتی ہے ہاں۔" سمرہ نے سنا تو گلا کھنکارا پھر خوش اخلاقی سے بولی۔

"پلیز بھائی آپ بیٹھیے ہم کافی ایک ساتھ پئیں گے ہیثم انداز بے نیازی سے کرسی سنبھال کے بیٹھ گیا۔ وہ بالکل خاموش تھا جب کہ بارعب شخصیت والے جواد بھائی تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لیے باتوں کا آغاز کر چکے تھے اس لیے اب، سیاست، فلسفہ، بزنس سے بات جب آرٹ پر آ کر رکی تو للی کی زبان پھسلی، اور اس نے کہا۔

"ہیثم صاحب بلاشبہ ایک نیچرل آرٹسٹ ہیں مگر پھر بھی کہیں نہ کہیں ان میں کوئی کمی ہے ضرور، جو انہیں مکمل طور پر ابھارتی نہیں ہے کوئی گرد ہے جس نے ان کا آرٹ اور ان کے رنگوں کی تازگی کو جذب کر لیا ہے یہ رنگ بہت مہارت سے استعمال کرتے ہیں مگر پھر بھی لگتا ہے رنگ یا تو ان سے ناراض ہیں یا اپنی کمپوزیشن سائیڈ سے مطمئن نہیں ہیں، اور ایک اور خامی یہ کہ ان کی ہر تصویر میں بلیک کلر کا بہت زیادہ کنٹری بیوشن ہوتا ہے، جو دیکھنے والوں کو بھی قنوطیت میں مبتلا کرتا ہے اور اداسی ڈیولپ کرتا ہے جب کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے ہمیں پیار اور خوشیوں کا پیغام دینا چاہیے، اپنے فن سے، کیوں کہ مسلسل اداسی دکھا کر ان کا آرٹ یکسانیت کا شکار ہو جائے گا۔" وہ کہے گئی اور جواد بھائی تحسین سے اسے دیکھے گئے اور سمرہ تو حیرت سے کچھ کہہ نہ سکی کیوں کہ ہیثم ولی کی بھوری مونچھوں تلے ہونٹ اس قدر تنقید پر کھنچنے کی بجائے دل آویز انداز میں مسکرا رہے تھے اور آنکھوں میں دنیا جہاں کی محبت دیپ کی طرح جھلملا رہی تھی، وہ کہہ کر چپ ہوئی تو جواد بھائی نے اس کا شانہ تھپکا اور بولے۔

"کیوں ینگ مین کہو گے کچھ اپنے حق میں۔" ہیثم نے کندھے اچکائے پھر مخصوص مدھم لہجے میں بولا۔

"مجھے حیرت نہیں یقین تھا، بہت پہلے سے کہ مس للی اور میری سوچ کے زاویے کہیں نہ کہیں آپس میں ملتے ضرور ہیں یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنے خیال کو حتمی شکل دینے کے لیے حسن عمار کا سہارا لیا میں دراصل ان کی مکمل نیچر جاننا چاہتا تھا۔" وہ اعتراف کرنے لگا للی کو قطعاً حیرت نہ ہوئی اور وہ مسکراتا رہا۔

(حسن عمار نے مجھے تمہاری سوچ کے ایک ایک پہلو سے آگاہی دی اور میں اب برملا کہتا ہوں تم ہی میرے خوابوں خیالوں رنگوں کی اصل گرہ تھیں۔)

"میں جب کینوس پر کوئی شبیہہ اتارتا تو مجھے لگتا تھا وجدانی طور پر جیسے کوئی چیز میرے اختیار میں آ کر پھسل جاتی تھی میں رنگ لگاتا مہارت سے مگر جب بھی تنقید سے دیکھتا تو لگتا وہ نامحسوس حصار وہ اختیار آتے آتے بے اختیار ہو جانے والا خیال ان رنگوں کی گہرائی پر بھی مکمل طور پر حاوی ہے لوگ میری پینٹنگ دیکھتے اور کہتے۔ "ایکسیلنٹ" مگر میرا دل کہتا کوئی چیز ہے ضرور، جو میں اپنے کینوس پر ابھی تک اتار نہیں سکا۔

میری یہی سوچ مجھ میں جستجو بن جاتی مگر پھر بہت جلد وہ جستجو ایک نقطے پر ٹھہر جاتی تو مجھ پر قنوطیت طاری ہو

جاتی ہیں محبت کو بھی ایک دکھ کی طرح فیل کرتا اور رہا یہ معاملہ کہ ہمیں بہار اور خوشیوں کا پیغام دینا چاہیے اپنے فن سے، تو للی صاحبہ انسان ہمیشہ وہی کچھ دیتا ہے جو اس کے اندر پکتا ہے پروان چڑھتا رہتا ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے آپ روتے روتے یک دم قہقہہ لگا کر ہنسنے لگیں، ہنسنے کے لیے بہت تگ و دو کی ضرورت ہوتی ہے مس للی جب کہ رونے کے لیے تو دکھ خود بخود میلے سے بچھڑے بچے کی طرح ہم سے آ ملتے ہیں ہم میں دیا جلاتے ہیں سوچ کی گہرائی کا۔

آپ کہتی ہیں دکھ میں یکسانیت ہوتی ہے، جب کہ میں کہتا ہوں یکسانیت تو خوشی میں ہوتی ہے ایک ہی انجام ہنسی، مسکراہٹ، تالیاں، مس للی ہنسی دیوتاؤں کا خیال ہے، جب کہ میں ایک ناچیز سا انسان ہوں اس زمین کا ایک شخص مجھے دکھ خوشی کے مقابلے میں زیادہ اٹریکٹ کرتے ہیں کیونکہ یہ دکھ ہمیشہ اختتام پر ہمیں ایک نئی کسک سے روشناس کراتے ہیں۔

سچا دکھ انسان کی توانائی ہے للی، یہ انسان کو کبھی ہارنے نہیں دیتا جب کہ خوشی ہمارے اندر وسوسے بزدلی پروان چڑھاتی ہے ہم عمر بھر اس خوف میں گرفتار رہتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے مگر دکھ، وہ دولت ہے جسے کوئی چرانے کی ہمت نہیں کرتا وقت بھی نہیں، سمجھیں آپ۔‘‘ وہ چپ ہو گیا کہتے کہتے تو جواد بھائی نے اس کی پشت تھپتھپا کر داد دی سمرہ نے بھی سراہا اور للی نے کچھ کہا نہیں مگر اس کی سچائی پر اس بار اس کی آنکھوں میں خفگی نہیں تھی۔

‘‘آج مس للی کافی بنا دیجیے، مگر پلیز اس دن کی طرح نہیں کیونکہ آج بنا شکر کے کافی پیا میں برداشت نہیں کر سکوں گا۔’’

‘‘ہیشم بھائی، ونڈرفل۔’’ سمرہ مطلب سمجھ کر خوش ہونے لگی اور للی کے ہاتھ پہلی بار کپکپائے وہ جو تمام عمر مختلف نظر آنے میں اپنی فطرت سے جنگ لڑتی آ رہی تھی تو اس کا انجام یہیں تک تھا اس نے سوچا پھر بدقت جواد بھائی کے بعد ہیشم ولی کو کافی تھمائی اور پیشانی پر پسینے کے قطرات محسوس کر کے شرمندہ ہو گئی ہیشم نے اس کی کیفیت دیکھی تو حظ اٹھانے کو مزید بولا۔

‘‘میرے لیے یہ احساس فرحت بخش ہے مس للی، کہ آپ نے میرے رنگوں کو اپنی محبت مستعار دے کر مرنے سے بچا لیا۔’’

‘‘جی.....ای.....’’ وہ سر جھکا کر رہ گئی جواد بھائی نے اس کی جھجک دیکھی تو ہنس پڑے پھر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

‘‘تم واقعی مسیحا ہو للی بیٹا، بہت پیاری سی میرے ہیشم کے لیے بہترین انتخاب۔’’ للی ٹھنڈی پڑ گئی اور سمرہ للی کا نخ ہاتھ تھام کر مسکراتے ہوئے ہیشم کی طرف دیکھ بولی۔

‘‘پلیز سر آج کے لیے اتنا ہی خراج تحسین کافی ہے باقی پھر کسی دن۔’’

‘‘اوکے ایز یو لائک بھئی۔’’ ہیشم نے ہنستے ہوئے اس کی بات سمجھ کر کافی کا کپ رکھ کر خود کو سرنڈر کر دیا پھر ادھر ادھر کی باتوں میں کتنی ہی دیر گزر گئی تب اچانک بھائی کی نظر اپنی رسٹ واچ پر پڑی تو وہ بوکھلا گئے۔

‘‘افوہ بھئی، میری تو ایک بہت ضروری میٹنگ تھی لنچ کے بعد میں چلتا ہوں بھئی۔’’ وہ اٹھے تو ہیشم بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

‘‘ٹھہریے میں بھی آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں وہ چلنے لگے پھر کچھ سوچ کر واپس پلٹا تو دوستانہ لہجے میں بولا۔

”پھر کیا خیال ہے، مس للی آئندہ ہم دوست بن کر ملیں گے نا۔“ للی نے دھیرے سے سر ہلا دیا تو وہ خوش ہوتا آگے بڑھ گیا کار تک پہنچا تو جواد بھائی نے آہستگی سے کہا۔

”تمہاری چوائس سپر ہے ہیثم۔ لڑکی واقعی تمہارے ہی قابل ہے، اس کے لہجے میں گہرائی ہے جذبوں کی باریکی پر نظر رکھتی ہے مگر دیکھو ہیثم اگر یہ بھی تمہاری کوئی جسٹ فار انجوائمنٹ حرکت ہے، تو ابھی سے تم قدم روک لو کیونکہ یہ ان لڑکیوں میں سے نہیں جو نارسائی کو ایک دکھ کی طرح چند مہینے منا کر اور کسی کا گھر آباد کر بیٹھتی ہیں یہ شدت میں انتہا ہے اگر اسے تم سے کوئی دکھ ملا ناں تو مجھے یقین ہے یہ اپنے حواس کھو بیٹھے گی، جوگن بن جائے گی تمہاری۔“ ہیثم نے سنا مگر قہقہے میں اڑا دیا۔ جواد بھائی نے قدرے بے چینی سے اسے دیکھا مگر کچھ کہا نہیں اور کار اپنے مخصوص راستے پر سفر کرتی آگے بڑھتی چلی گئی۔

آج للی گھر لوٹی تو اس میں بے قراری نہیں تھی سو کمرے میں آئی تو پہلی بار ہنسی اتنی شدت سے، کہ آنکھوں میں آنسو بھر آئے محبت آج پہلی بار محسوس کی تو وہ جو اک اقرار انکار کی کیفیت تھی وہ ختم ہو گئی اطمینان ہی اطمینان اندر تک گھر کر گیا۔ وہ ہلکے سروں میں ایک کیسٹ لگا کر ایزل پر نیا کینوس لگا کے آج کی کلاس کا ہوم ورک مکمل کرنے لگی تصویر میں ایک کرسی بنائی کسی کسی قدر شکستہ سی جگہ جگہ سے کرسی کا پالش اتر چکا تھا اور اسے اپنے کام میں یہی مہارت ابھارنی تھی، سو اس کے ہاتھ تیزی سے اسے بنانے میں مصروف تھے۔

پھر جب وہ کام مکمل کر چکی تو بیڈ پر بیٹھ کر تصویر کو تنقیدی نگاہ سے، دیکھنے لگی بلاشبہ اس نے ہفتوں ہی میں مہینوں کا سلیبس مکمل کر لیا تھا تصویر اتنی نیچرل دکھائی دے رہی تھی کہ لگتا تھا دیوار سے لگی یہ کرسی محض تصویر نہیں حقیقت ہے۔

صبح دیکھنا ہوگا یہ تصویر میڈم روشن گوہر پر کیا تاثر چھوڑتی ہے۔“ اس نے رسٹ واچ دیکھی رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ گردن دائیں بائیں کر کے کتنی دیر تک خود کو ایزی کرتی رہی۔ پھر کاندھے دباتی کچن کی طرف بڑھی، کافی بنانے کے لیے پانی چولہے پر رکھ کر کافی کا ڈبہ نکالنے لگی پھر وہ کافی میں دودھ ڈال ہی رہی تھی جب کچن کا دروازہ کھلا۔

”تم ابھی تک سوئی نہیں للی۔“

”نہیں پاپا ذرا کافی کی طلب ہو رہی تھی، اس لیے میں نے سوچا۔“

”ٹھیک سوچا کافی کی مجھے بھی بہت طلب ہو رہی ہے۔“ پاپا اندر داخل ہو گئے کرسی کھسکا کر ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھ گئے تو للی نے اپنا کپ پاپا کے سامنے رکھ دیا پاپا نے پہلی بار للی کو غور سے دیکھا، کمزور، تھکی تھکی، للی کو دیکھ کر جانے پاپا کے دل کا کون سا گوشہ روشن ہوا کہ انہوں نے آواز دے کر اسے اپنے سامنے ہی بٹھا لیا، پھر شاید زندگی میں پہلی بار انہوں نے اس کے رخسار کو تھپتھپا کر محبت سے کہا۔

”اتنا مصروف کیوں رہتی ہو للی بیٹا، کہ اپنا خیال بھی نہیں رکھتیں، دیکھو تو کتنی کمزور ہو گئی ہو۔“ للی نے شاکڈ انداز میں پلکیں اٹھا کر انہیں، دیکھا تو پاپا جزبز ہو گئے۔

”یوں کیا دیکھ رہی ہو مائی چائلڈ۔“

”صرف یہ کہ..... آپ نے کبھی مجھے اس لہجے میں مخاطب نہیں کیا پاپا۔“ اس کا لہجہ بھرا گیا تو پاپا نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا پھر مدھم لہجے میں بولے۔

''ہم جو جذبے شیئر نہیں کرتے ضروری تو نہیں وہ جذبے ہمارے دلوں میں جنم بھی نہ لیتے ہوں تمہاری ماما کی ڈیتھ کے بعد میں صرف لایعنی سوچوں سے بچنے کے لیے بزنس میں لگا تھا مگر مجھے نہیں پتا تھا کہ میں اس طرح تم سے ہی نہیں اپنے آپ سے بھی زیادتی کر رہا ہوں۔'' للی نے دیکھا دن کی روشنی میں اس کے یہ پاپا کلف لگے کالر کے ساتھ کتنے اسٹف دکھائی دینے کی کوشش کرتے ہیں مگر آج رات کے بارہ بجے محبت پاپا پر الہام کی طرح کیوں اتر رہی تھی پاپا نے محبت سے اسے اپنی طرف دیکھتے پایا تو خود ہی بولے۔

''شاید تم میرے دن کے رویے اور اس وقت کے رویے پر حیران ہو تو میں یہی کہوں گا للی جان کہ دن روشنی کا پیامبر ہوتا ہے ہمیں دن کی روشنی توانائی دیتی ہے ہم سمجھتے ہیں ہم تمام دنیا فتح کر لیں گے۔ مگر جیسے دن شام کی طرف بڑھتا ہے رات کی طرح چھا جاتا ہے، تو ہمارے دل میں دن بھر کی کی گئی زیادتیاں غلطیاں ایک لمبی قطار میں لائن لگا کر حاضر ہو جاتی ہیں اور للی جو صاحب دل ہے وہ ہر رات اس کیفیت سے گزرتا ضرور ہے چاہے چند لمحوں کو ہی رات کا خوف اس پر غالب ضرور آتا ہے رات جو موت سے قریب ترین ہے۔'' پاپا خاموش ہوئے وہ حیرت سے انہیں دیکھتی رہی۔

''ایک مختلف بیٹی کے باپ کو تھوڑا بہت مختلف ہونے کا حق تو ہونا چاہیے نا للی بیٹا۔'' اس نے سن کر اپنی گردن ہلائی پھر بولی۔

''تھوڑا بہت کیوں پاپا، میری شخصیت آپ ہی کی شخصیت کا حصہ ہے میں خود کچھ بھی نہیں ہوں بلکہ میرا جو عکس ہے وہ آپ کی ہی شبیہ تو ہے۔''

''مجھے تم پر فخر ہوتا ہے للی بیٹا، تم واقعی میری بیٹی نہیں بیٹا ہو میرا ہاتھ اور میرا دکھ بٹانے والا بیٹا۔'' پاپا نے اس کی پیشانی چوم لی۔

پورے تین ماہ بعد للی آرٹ کلب گئی اس تصویر کے ساتھ روشن کو ہر اسی توجہ سے مصوری کے اسرار و رموز سکھاتی ہوئی ملیں۔

''ارے للی تم...... کہاں رہیں اتنے عرصے بھئی'' اور سب نے بھی سوالیہ انداز میں دیکھا تو وہ مسکرائی پھر بولی۔

''میں آج کل پاپا کے ساتھ مصروف تھی میں نے ان کے ساتھ رہ کر پچھلے تمام دنوں کا ازالہ کر لیا۔ اب پاپا مصروف ہو گئے اور میں نے پھر سے اپنے محور کے گرد دوڑ لگا دی۔'' میڈم نے سنا پھر اپنی روشن آنکھیں اس پر ٹکا دیں پھر آہستگی سے بولیں۔

''میں تم میں بہت اچھوتی تبدیلی محسوس کر رہی ہوں للی کیا واقعی انکار اقرار کی درمیانی کیفیت ختم ہو چکی ہے تمہارے دل سے۔'' اس نے سر ہلایا تو وہ ہنس پڑیں۔

''مجھے تم جیسی پیاری لڑکی سے یہی توقع تھی تم مجسم محبت ہو للی محبت کے لیے ہی تخلیق کی گئی ہو کتنے عرصے تک تم نے خود کو اپنے رنگوں کو اذیت میں رکھا مگر سنو گڈ گرل اب لوٹی ہو تو مجھے تم سے ویسا ہی کام چاہیے جیسا میرا تخیل چاہتا ہے۔''

''اُفوہ میڈم اتنی بڑی ذمہ داری۔''

''کوئی بڑی ذمہ داری نہیں، تم جیسی رنگوں اور لائنوں پر مکمل کنٹرول اور مہارت رکھنے والی لڑکی کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں اور ہاں یہ کیا رول کیا ہوا ہے بھئی۔'' انہوں نے اس کے بائیں ہاتھ کی طرف دیکھا پھر ہاتھ سے

لے کر تصویر کھول لی ایک رنگ سا آ کر گزر گیا ان کے چہرے پر انہوں نے سختی سے اس کی طرف دیکھا پھر بولیں۔

"للی میرے کمرے میں آئیے پلیز۔" للی آرام سے قدم اٹھاتی ان کے روم میں پہنچی تو وہ ریوالونگ چیئر پر بیٹھی گھوم رہی تھیں کس قدر خفا خفا سی۔

"یہ سب کیا تھا للی میں نے یہ تو نہیں دیا تھا تمہیں کرنے کو۔"

"آئی نو میڈم، مگر آپ نے جو اوبجیکٹ دیا تھا وہ ایک بے جان سی چیز تھی جب کہ مجھے بے جان کے مقابلے میں جاندار چیزوں کو پینٹ کرنے کا زیادہ شوق ہے۔"

"مگر یہ فیگر۔ آخر کیا تعلق ہے تمہارا ان سے۔"???

"میڈم یہ سوال میں بھی تو آپ سے پوچھ سکتی تھی، لیکن میں نے نہیں پوچھا اس لیے چھوڑ دیں، اور یہ بتایئے میری مہارت کیسی ہے اس تصویر میں۔" روشن گوہر نے تصویر پر نگاہ پھر سے جما دی۔

تصویر میں کرسی ویسی ہی تھی جیسی انہوں نے دی تھی فرق تھا تو صرف یہ کہ للی نے اس کرسی پر عمیر کو بٹھا دیا تھا اور پشت پر ڈوبتے سورج سے ٹکرا کر بکھرتے دل کے ٹکڑے تھے جو ان پر ذرات کی طرح برس رہے تھے مایوسی رائیگانی کا احساس ان کے چہرے پر ثبت تھا اداسی آنکھوں میں بال کھولے بیٹھی تھی بلاشبہ یہ مہارت کا اوج تھا۔

"میڈم بتایئے نا کیسی لگی میری پینٹنگ۔" وہ اور جھک آئی تو انہوں نے جو دل میں اعتراف کیا تھا برملا اس کے سامنے بھی کر دیا۔

"مختلف، سب سے الگ، مگر للی اٹ از ٹو مچ۔" انہوں نے تصویر کے پرزے کر دیئے للی چیونگم چباتی رہی روشن گوہر نے اس کے بے نیازی دیکھی تو آہستگی سے کہا۔

"للی اپنی کلاس میں جائیے میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔" للی نے انہیں دیکھا پھر کلاس میں آ کر ایزل پر نیا کینوس سیٹ کرنے لگی پوری کلاس کی نگاہ میں سوال ہی سوال تھے مگر اس نے کسی کی طرف دیکھنا ضروری نہیں سمجھا۔

پھر آدھے گھنٹے بعد جب وہ نئے اوبجیکٹ کی آؤٹ لائن کھینچ کر شیڈ دے رہی تھی تو میڈم گوہر اس کے قریب آ کر رکیں ان کی روشن آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ٹوٹ کر روئی ہیں آنکھوں کی سرخی، بینائی کے ساتھ اس کے چہرے پر آ ٹکی تھی وہ منتظر تھیں کہ شاید وہ مزید کچھ اور بھی کہیں گی مگر وہ مطمئن سی اس کی تصویر کی خامیوں، خوبیوں پر اس سے بحث کرنے پر آمادہ تھیں اور وہ سینئر اسٹوڈنٹ کی طرح ان کی باتوں سے اپنے لیے نئی راہ تلاش رہی تھی جو خامی تھی اسے کینوس پر ہی پوائنٹ آؤٹ کر رہی تھیں۔

"مجھے خوشی ہے للی کہ تم اس زاویے سے دیکھتی ہو جس زاویے سے میرے تخیل کی آنکھ دیکھتی ہے درحقیقت تمہارے رنگوں میں یہی سب کچھ تو ہے جو تمہیں منفرد بناتا ہے تم دیکھنا سیکھ چکی ہو دیکھ کے بنانا آتا ہے تمہیں تمہاری انگلیوں میں پرفیکشن بھی ہے، لیکن للی تمہیں اپنی انفرادیت کو مزید مستحکم کرنے اور چیزوں کو اون کرنے کے لیے مشق اسی طرح جاری رکھنی چاہیے تاکہ مستقبل میں لوگ تمہاری تصاویر دیکھیں تو بڑے بڑے مصوروں کی طرح تمہارا نام پڑھے بغیر جان جائیں کہ یہ کام صرف لیلیٰ ظفر کا ہو سکتا ہے میں چاہتی ہوں للی تم اس فن کے انتہا کو چھو لو اور......" وہ کہتی رہیں اور وہ مجسم سماعت بنی سنتی رہی۔

“پھر دوسرے دن وہ سمرہ کے گھر گئی تو سمرہ گھر پر نہیں تھی ملازم نے بتایا کہ گھر میں صرف صاحب ہیں تو وہ تیزی سے ان کی لائبریری کی طرف بڑھتی چلی گئی پھر دستک دی ہی تھی کہ آواز آئی۔

“آ جاؤ میری عظیم مصورہ تمہارا انکل تمہارا ہی انتظار کر رہا ہے۔” وہ ہنستی ہوئی اندر داخل ہوئی پھر بیٹھی بھی نہیں تھی کہ پاپا نے اس کی کلاس لے ڈالی۔

“بہت بری بات ہے للی، کسی کو یوں ڈس ہارٹ نہیں کرتے۔”

“مگر میں نے یہ گناہ کب کیا انکل۔” وہ جان گئی تھی مگر انجان بن رہی تھی سو پاپا نے کتاب بند کر دی پھر پوری توجہ سے اسے دیکھا اور بولے۔

“سویٹ گرل، تم نے اپنے بڑوں کو بالکل گاؤدی سمجھ رکھا ہے کیا؟” لمحہ بھر کو وہ رکے پھر کھڑے ہو کر اس کی کرسی کی پشت پر پہنچ گئے۔ دونوں ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھے پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولے۔

“سمرہ اور تم نے جو پروگرام آپس میں بنایا تھا، تمہارا کیا خیال تھا میں اس سے لاعلم تھا نو نو مائی چائلڈ میں سب جانتا تھا صرف سوچا تھا چلو تم انویسٹی گیشن کرنا چاہتی ہو تو کر لو دیکھیں گے کس حد تک کامیاب رہتی ہو مگر مائی ڈیئر تم ایک اچھی جاسوسہ ثابت نہیں ہوئیں۔” پھر اس کے بالکل سامنے آ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے۔

“یہ اچھی بات تو نہیں للی کہ کسی کے سامنے ہم اچانک جا کر دھماکا کر دیں اگر اس صورت پر کسی کا دل ہی رک جاتا تو تمہاری روشن آنٹی کا فون آیا تھا وہ پوچھ رہی تھیں للی کون ہے، میں نے اسے کہہ دیا میری شریر بچی کی۔ شریر سی دوست ہے۔” اس نے حیرت سے پاپا کو دیکھا پھر بولی۔

“آپ آج بالکل مختلف لگ رہے ہیں انکل اس دن تو روشن آنٹی کے ذکر پر آپ بہت سینٹی مینٹل ہو گئے تھے۔” پاپا ہنسے کچھ عجیب سے انداز میں، پھر بولے۔

“سینٹی مینٹل میں اب بھی ہوں، اس ذکر پر، مگر خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہوں ویسے للی میں تم سے کہنا چاہوں گا، سمرہ سے اس چہرے کو اتنی شدت سے روشناس مت کرواؤ کہ میرا چہرہ اس کی نگاہ میں دھندلا پڑ جائے تم جانتی ہو سمرہ مجھے کتنی عزیز ہے وہ میری زندگی ہے للی......” للی نے ان کی دیوانگی دیکھی تو کہا۔

“سمرہ اور آپ کا تعلق بہت اٹوٹ ہے انکل، روشن آنٹی تو صرف سایہ ہیں، آپ کے عکس کے سامنے اس سائے کی کیا حیثیت ہے، لیکن آپ پھر بھی خوفزدہ رہتے ہیں تجسس کو تو انکل، آپ خود پروموٹ کر رہے ہیں اگر روشن آنٹی کو آپ ایک ملاقاتی کی طرح سمرہ کے ساتھ قبول کر لیں تو سمرہ یہ جاسوسی واسوسی کے چکر میں پڑ کر اپنا ٹائم ضائع کیوں کرے۔” پاپا اسے دیکھتے رہے کتنے لمحے ہی پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گویا ہوئے۔

“للی تم نہیں جانتیں بیٹا بعض ملاقاتی مہمان بن کر آتے ہیں، مگر مالک بن جایا کرتے ہیں میں جانتا ہوں روشن گوہر میں بہت کشش ہے، اتنی کہ وہ اگر سمرہ سے ایک بار بھی مل بیٹھی تو میں اس کے سامنے مدھم سیارچہ بن جاؤں گا، میں ایسی اپائنٹمنٹ ڈائری ہو جاؤں گا للی جس میں سمرہ اور میری ایک بھی ملاقات نہیں لکھی ہو گی تم نہیں جانتیں للی، میں جانتا ہوں روشن گوہر کتنی بڑی ساحرہ ہے۔” للی نے پلکیں اٹھا کر انہیں دیکھا چہرہ پر ملال ہی ملال تھا۔ جیسے وہ اور روشن گوہر بہت عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے رہے تھے۔ پاپا نے براؤن، آنکھیں اپنے سامنے رکھی کتاب پر

ڈالیں پھر بولے۔

"تم سمرہ کے مقابلے میں بہت عقلمند ہو، سب کچھ پی جانے والی اور تم میں روشن گوہر کی طرح روک لینے تھام لینے والی ساحرانہ کشش بھی ہے اس لیے للی میں آج تمہیں اس محبت کی ادھوری نظم سے آگاہ کر دینا چاہتا ہوں، تا کہ تم میرے لیے سمرہ کو روک لو میں سمرہ کے بغیر کچھ بھی نہیں ہائی گاڈ للی۔" للی کرسی سے اٹھ کر پاپا کے قدموں میں بیٹھی پھر بولی۔

"آپ جو کہیں گے اس کمرے سے باہر نہیں جانے گا انکل کیسے میں سن رہی ہوں۔" پاپا کی دی ہوئی کتاب اس کے ہاتھ میں تھی اور پاپا کا دکھ بچ ان کے ہونٹوں سے ادا ہو کر اس کی سماعت میں جذب ہو رہا تھا۔

"میں اور روشن ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ہم بچپن سے ایک دوسرے سے منسوب تھے دوستوں کے ہمراہ پورے گاؤں میں گھومتے پھرتے، ہمارے کزن ہمارے درمیان اس رشتے سے آگاہ تھے اس لیے کوئی کھیل ہوتا سب کہتے عمیر روشن کے بغیر تو کوئی گیم کھیل ہی نہیں سکتا ہم دونوں ہی پھرتیلے شوخ و چالاک تھے اس لیے جس ٹیم جاتے، دوسری ٹیم ضرور واویلا کرتی۔

"سب اچھے کھلاڑی تو تم نے رکھ لیے اب ہم خاک کھیلیں گے۔" ٹیم کا مورال گر جاتا وہ ہار جاتی ہمیں افسوس ہوتا مگر ہم ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے اس لیے باقاعدہ ہمارے لیے شرطیں لگتیں بڑا مزا آتا۔ پھر یونہی وقت بیتا میں نے ایف۔ اے کر لیا روشن نے میٹرک کے بعد ایک آرٹ اسٹوڈیو جوائن کر لیا گھر میں سب اس بات کی مخالف تھے پھر ہمارے حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے اس لیے محض اس کے شوق کو بچانے کے لیے میں نے ٹیوشن کے بعد ایک دکان پر پارٹ ٹائم کے طور پر کھاتے دیکھنے کی نوکری کر لی تنخواہ اگرچہ چند سو تھی، مگر اتنی بہر حال تھی کہ میں روشن کو رنگوں کی دنیا میں قدم مستحکم کرتے دیکھ سکتا۔

روشن لکیروں میں بڑی گہرائی تھی، مگر ابھی اس نے زیادہ مہارت بھی حاصل نہیں کی تھی کہ بزرگوں نے مل کر ہمیں رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا۔۔

ہم نے زندگی کے اس نئے رنگ روپ اور خوبصورتی کو محسوس کیا مگر ایک تلخی کے ساتھ یہ تلخی صرف میری ذات تک تھی کیونکہ نکاح نامے میں میرے نام کے ساتھ اس دن پہلی بار عمیر ارسلان کی جگہ عمیر جمال تحریر کیا گیا اس دن مجھ پر کھلا میں کسی یتیم خانے سے آیا تھا، جمال فاروقی میرے مرحوم باپ کا نام تھا جو ایک اسکول ٹیچر تھے اور ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے والدہ تھیں نہیں سو مجھے وہاں چھ ماہ کی عمر میں کوئی رشتہ دار چھوڑ گیا جہاں سے روشن کے چچا جان اپنی پدرانہ شفقت کی تسکین کے لیے مجھے گود لے آئے ان کی شادی محبت کی تھی اس لیے بیوی کے مرنے کے بعد انہوں نے نئی شادی کی بجائے میری زندگی سنوارنے کا بیڑا اٹھا لیا۔

اس دن للی مجھے مجھے کے باوجود بہت زیادہ تنہائی کا احساس ہوا تھا روشن نے میری آنکھوں سے میری ذہنی اذیت کا اندازہ لگا لیا تھا اس لیے اس کی مسیحا آنکھوں کی بدولت میں نے دل میں سوچا۔

"میرے لیے روشن ہی سب کچھ ہے کیا ہوا جو میری ذات کا یہ خانہ خالی رہ گیا میں روشن کی محبت سے اس کو پر کر لوں گا۔" اور مطمئن ہو گیا اور پھر ہم نے زندگی اس طرح گزارنی شروع کر دی جس طرح ہم نے سوچا تھا مگر میں جب بھی روشن کو محنت کرتا دیکھتا تو مجھے عجیب سا محسوس ہوتا مجھے روشن سے رنگ کیوں چھوٹ جانے کا قلق ہونے لگتا میرا

دل چاہتا میں دنیا جہاں کی آسائشیں اس کے سامنے ڈھیر کر دوں اسے دنیا کے رنج والم سے بیگانہ کر دوں اس طرح کہ وہ محض اپنے رنگوں کے ساتھ خود بھی ایک خوبصورت رنگ بن جائے زندگی سے بھرپور رنگ تھی وہ اگر تم اسے اس روپ میں دیکھ لیتی ناں تو کئی برسوں تک محض اس خیال سے آنکھیں نہ جھپکاتیں کہ کہیں اس کا وہ زندہ عکس مٹ نہ جائے مجھے بھی یہی خوف رہتا اس لیے میں بھی بنا آنکھیں جھپکائے اسے دیکھتا رہتا وہ کہتی ۔

”آپ اور مردوں کی طرح کیوں غصہ نہیں کرتے اس بات پر کہ میں گھر کو اور رنگوں کو ٹائم دینے پر آپ کو کیوں اگنور کر دیتی ہوں۔“ شاید وہ یہ بات نہیں جانتی تھی کہ میں اس یقین سے اس کی پرستش کرتا تھا کہ وہ اس مصروفیت کے باوجود میری طرف ہی متوجہ رہتی ہے چاہے وہ کینوس پر رنگ بھر رہی ہوتی گھر کی کسی مصروفیت کا شکار ہوتی مجھے لگتا وہ میرے قریب ہی کہیں میرے لیے آنکھ اور دل جھکائے کھڑی ہے ۔

یہ اسکے جھکے رہنے کا اعجاز تھا لگی کہ میں میرا دل اس کیلیے تسخیر ہوتا چلا گیا اور میں نے اکثر سوچا مجھے اسے پہلے سے زیادہ اچھا مستقبل دینا چاہیے چار سال تک ہمارے ہاں کوئی اولاد بھی نہ ہوئی تھی اس لیے میں سنجیدگی سے اس بارے میں سوچ سکتا تھا ورنہ بچوں کے شور لاڈ پیار میں بھلا بندہ کچھ سوچ سکتا ہے نہیں سو میں بھی اس تنہائی سے فائدہ اٹھا کر جوڑ توڑ میں لگا رہتا ۔

ابو میرے آئیڈیل ازم سے واقف تھے کیونکہ میں نے انہیں کہہ دیا تھا کہ میں روشن کو اس وقت ہی گھر لاؤں گا جب میں اس کے شایان شان زندگی ، دے سکوں گا یہ کیا کہ بندہ بلکتی ایک زندگی سے نکلے اور دوسری چکی میں پسنے لگے میں اس کے خلاف تھا مگر ابو کی ضد کے آگے مجھے یہ شادی جلدی کرنی پڑی اس لیے جب انہوں نے سنا میں باہر جانے کی سوچ رہا ہوں تو انہوں نے اپنے حصے کی زمین بیچ کر مجھے رقم دے کر شہر اپنے ایک دوست کے پاس بھیج دیا ۔

میں نے ان کے دوست کے مشورے اور ان کی پارٹنرشپ میں ایک چھوٹی سی کپڑے کی دکان کر لی وہ کپڑے کے بہت بڑے بیوپاری تھے اور مجھے اس منزل تک پہنچنا تھا اس لیے میں ان کے بتائے ہر گر کو آزماتا رہا جو کماتا گاؤں بھیج دیتا روشن کے گاؤں سے خط آتے بے قراری تنہائی ادا ور بے چینی بکھرے اور میں اس کے ہر خط کے جواب میں خود کو اس سے کہیں زیادہ اذیتیں دیتا میں اس کے لیے مجبور تھا سو اس کی صدا پر لوٹا نہیں اپنے مقصد پر جتا رہا ۔

یہاں ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا تو میں ابو اور روشن کو شہر ہی لے آیا جتنی بے قراری اس کے خطوں میں تھی اس سے کہیں بڑھ کر اس کی آنکھوں میں موجزن تھی اس لیے میں نے کچھ دن مکمل طور پر صرف اسے دے دیے ابو ہماری محبت پر ہنستے کہتے ۔

”تم دونوں ایک دوسرے کے بغیر رہ بھی نہیں سکتے اور دور رہنا بھی مقسوم بنانے پر تلے ہو ارے عمیر بیٹا چھوڑ زیادہ کی طلب جتنی ہے اس پر گزارہ کر لو۔“

”ابو میں یہ محنت اپنے لیے نہیں آپ کی اس بیٹی کے لیے ہی کر رہا ہوں میں اسے شہزادی کی طرح شان سے رکھنا چاہتا ہوں۔“ ابو ہنستے اور ہنس کر چپ ہو جاتے ان کی آنکھیں دعا کی طرح ہم پر ہی مرکوز رہتیں پھر یک دم وہ حصار دعا ہم سے اچانک اٹھ گیا تو ہم دونوں دنیا کے بے رحم جنگل میں تنہا ہو گئے ۔

میں ابو کی جدائی میں اور بھی کام میں لگ گیا مگر جب بھی آفس سے لوٹتا ، روشن مجھے دروازے پر ہی ملتی ، میں

ساری تھکن بھول جاتا وہ دن بھر کی روداد سناتی اپنی تنہائی بتاتی اس نے کس کس لمحے مجھے مس کیا ایک ایک پل بیان کرتی اور میں ہنستا رہتا۔

میں کپڑے کی تجارت میں نام کمانے لگا، پھر گارمنٹ کا آئیڈیا سوجھا تو ساری توجہ اس طرف لگا دی۔ پہلے چھوٹے، بڑے پیمانے پر میں نے یہ کام شروع کر دیا اس زمانے میں یہ کام بہت نیا تھا مشکلات سے پر، مگر میرے لیے نہیں، میں نے اس کام میں بہت کمایا دولت بھی، شہرت بھی اور پیسہ بھی، شہر میں میرا بوتیک سب سے زیادہ اسٹیبلش تھا میرے پاس دونوں ہاتھوں سے دولت آ رہی تھی پھر میں کیوں نہ روشن کو اسی رنگ میں دیکھتا جس کی تمنا اور خواب میرا اپنا تھا۔

میں نے اپنے خوابوں کے مطابق روشن کے لیے ایک وسیع و عریض کوٹھی خریدی ہر اس چیز کا ڈھیر لگا دیا جس کا تصور ایک عورت کرتی ہے روشن اس ماحول میں خوش رہنے لگی۔ مگر جب میں مطمئن ہونے والا تھا یک دم اس کے اندر جیسے کوئی ابال اٹھا اور وہ بولی۔

یہ سب مجھے نہیں چاہیے مجھے صرف آپ کی ضرورت ہے عمیر، اس مصروفیت میں تو میں نے آپ کو کھو دیا۔" وہ مجھے اپنے خیال سناتی خواب بتاتی رہتی اور میں ہنستا رہتا میں سمجھتا یہ سب چند دنوں کی باتیں ہیں پھر وہ خود بخود اس ماحول میں رچ بس جائے گی مگر لئی وہ بہت مختلف روح تھی بالکل تمہاری جیسی شدت پسند محبت کا اس کا الگ فلسفہ تھا جسے میں مصروفیت میں سمجھ نہیں پایا یوں روشن اور مجھ میں پہلی بار سوچ کی خلیج پیدا ہوئی۔

پھر سمرہ ہماری زندگی میں آئی تو لمحہ بھر کو میری زندگی کی ڈگر بدلی میں نے بہت عرصے بعد اسے سنا اور وہ کہہ گئی۔

"آپ جب اپنی مرسڈیز سے اترتے ہیں عمیر تو آپ کے چہرے پر پسینے کا ایک قطرہ بھی نہیں ہوتا آپ کے چہرے سے اپنے آنچل میں آپ کی تھکن جذب کرنے میں کیا لذت ملتی تھی مجھے آپ کو نہیں پتا، میرا آنچل اس تھکن آلود پسینے سے قیمتی ہو جاتا تھا مگر اب میں سائل ہوتی جا رہی ہوں میری الماری ہر رنگ، ہر موسم کے لباس سے بھری ہوئی ہے لیکن عمیر میرے لیے ان میں کوئی کشش نہیں ہے۔"

"یعنی تم چاہتی ہو میں اب بھی بسوں کے دھکے کھاؤں روشن میں نے اور تم نے جتنی تکلیفیں دیکھنی تھی، دیکھ لیں مگر اب ہم صرف خوشیاں شیئر کریں گے۔"

میں جوابا سمجھانے لگتا مگر لئی روشن سمجھنے سوچنے کی ہر حد سے گزر چکی تھی وہ میری توجہ کے بنا خود کو ادھورا سمجھتی تھی۔ جب کہ میرے وجود کا آخری کونہ تک اس کی محبت سے ایسے بھرا ہوا تھا کہ مجھے اس کی طلب کی شدت کا اندازہ ہی نہ ہو پایا اور ہم یوں ایک شبنمی شام میں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔"

لئی جو غور سے سن رہی تھی حیرت سے پاپا کو تکنے لگی کہانی کا پھیلاؤ اس انجام کو تو نہیں پورٹریٹ کر رہا تھا، مگر پاپا کہہ رہے تھے یہاں ان کے جذبوں محبتوں کی کہانی اگر ختم ہو جاتی ہے، کس قدر امیزنگ اور کس قدر ادھورا سا ہے؛ انجام ادھوری محبت کی نظم کی طرح وہ بحث کرنا چاہتی تھی مگر اس نے ابھی سوالات مرتب بھی نہیں کیے تھے کہ پاپا نے آنکھیں بھینچ کر کہا۔

"یہی اختتام تھا لئی ہماری محبت کا، یہی اختتام تھا بس بیچ میں کچھ دکھ کے پربت اور آنسوؤں کے سمندر آ گئے، جنہیں پھر سے عبور کرنا میرے بس میں نہیں، بس کچھ ہے تو تم سے یہ التجا ہے کہ تم مجھے ایک بار پھر تہی دست ہونے

سے بچالو، سمرہ اپنی ماں کی طرح محبت میں شدت پسند ہے مگر للی روشن کے بعد مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ میں سمرہ کی جدائی بھی آنکھیں کھول کر دیکھوں اور سہہ جاؤں تم سمجھ رہی ہو نا للی۔"

للی نے اثبات میں سر ہلا دیا ادھورے سچ کو ہی تسلیم کر لیا اور پھر ان کے ہاتھ کو تھام کر نرمی سے کہا۔

''سمرہ اب روشن آنٹی کی طرف کبھی نہیں جائے گی انکل میں اسے روک لوں گی۔'' وہ کہتی رہی اور دور کھڑا وقت اس کے جملوں پر ہنستا رہا۔

للی آرام دہ حالت میں بیٹھی ڈرائنگ کاغذ کو سامنے رکھے اسکیچ کر رہی تھی جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو للی ظفر اسپیکنگ۔ جی فرمایئے آپ کون؟''

''آپ کا اسٹوڈنٹ حسن عمار۔'' شوخ آواز پر اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ بولی۔

''آپ کیسے کہہ سکتے ہیں میں نے آپ کو اپنا شاگرد بنا لیا ویسے ہمارے ہاں شاگرد بنانے کیلئے بھی ایک رسم ہوتی ہے جانتے ہیں آپ۔''

''جانتا ہوں، جس کے لیے مٹھائی کے ٹوکرے اور دس گز پگڑی کے ساتھ چلا آؤں گا، اور رہی یہ بات کہ ہم نے خود کو آپ کا شاگرد کب سمجھنا شروع کیا تو اس کا جواب پہلی ملاقات ہی ہو گا۔''

''تھینک گاڈ آپ نے کسی اداکار، گلوکار کی طرح یہ نہیں کہا جی مجھے یہ شوق بچپن سے تھا۔''

''دیکھ لیجیے آپ کی سکیریٹ آف ایج کا اس قدر خیال ہے۔''

''جی ہاں آپ کی فرمانبرداری کی تو میں شروع سے قائل ہوں ویسے بتایئے گا آج کس لیے یاد کیا۔''

''ہیشم آپ سے ملنا چاہتا ہے۔'' للی کے اندر کوئی راگ چھڑا اچانک ہی مگر اس نے لہجے کو قابو میں ہی رکھا پھر بولی۔

''یہ بات ہیشم نے خود کیوں نہیں کہی۔''

''صرف اس لیے کہ وہ تمہارے مختلف ہونے سے گھبراتا ہے۔''

''مگر میں اتنی خوفناک نہیں حسن صاحب، آپ نے میرے خیال میں انہیں بہت زیادہ ڈرایا ہے۔''

''ہوں اس لیے تو میں چاہتا ہوں اس ان ڈائریکٹ تعلق کو چھوڑ کر ڈائریکٹ ڈائلنگ اپنا لیجیے ہاٹ لائن مربوط کر لیجیے تاکہ نہ آپ کی کوئی بات ان کہی رہے نہ اس کی کوئی ان سنی۔'' وہ لمحہ بھر کو رکا پھر بولا۔ ''پھر بتایئے کیا جواب دوں ہیشم کو۔'' للی نے دائیں بائیں دیکھا پھر بولی۔

''محبت دنیا کا سب سے بڑا سچ اور نعمت ہے مسٹر حسن۔''

''یعنی آپ اس تعلق اس ملاقات پر خوش ہیں او کے پھر ہیشم خود ہی آپ سے رابطہ کرے گا ویسے آپ مجھے ہیشم کے بعد بھول تو نہیں جائیں گی مس للی۔'' للی کو اس کے لہجے پر ہنسی آ گئی مگر وہ اس کی شرارتی طبیعت سے واقف تھی اس لیے جواباً بولی۔

''میں آپ کو کیسے بھول سکتی ہوں مسٹر حسن، آپ کوئی بھولنے کی چیز ہیں، آپ تو زندگی کے ہر موڑ پر مجھے اچھے دوست کی طرح یاد رہیں گے۔''

"یعنی آپ کے خیالات میرے بارے میں برے نہیں۔"

"کیوں حسن صاحب آپ میں بھلا کیا خامی ہے جو میں آپ کی طرف سے بدگمان ہوں گی۔"

"افوہ وہ مارا۔" وہ نعرہ مارتا ہوا فون کریڈل پر رکھ گیا اور للی خالی ریسیور تھامے کھڑی رہی پھر بڑبڑائی۔

"عجیب خبطی بندہ ہے، نہ دعا نہ سلام، اور فون بند۔" وہ ریسیور رکھ کر پلٹی ہی تھی کہ پھر فون کی گھنٹی بجی للی نے ریسیور اٹھایا، دوسری طرف سے گنگناتی آواز گونجی۔

"I Love you" للی کے کان کی لویں سرخ ہوگئیں اور غصہ رگ رگ میں بھر گیا وہ خفگی سی بولی۔

"میرے خیال میں ٹیلی فون حکومت نے محبت کا پیغام عام کرنے کے لیے نہیں فراہم کیا۔"

"مگر جو صرف محبت کرنا جانتے ہوں، وہ کیا کریں۔" اس بار آواز پہلے سے قدرے صاف تھی مخمور بھاری اور للی یہ آواز لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔

"افوہ ہیثم صاحب آپ ہیں۔"

"آپ کے لیے تو میں صرف ہیثم ہوں یہ صاحب تو صرف حسن کو کہا کیجیے یہی بہت خوش ہوتا ہے اس طر مخاطب پر کہتا ہے بندہ "صاحب" سن کر خوامخواہ ہی کالر میں کلف لگی محسوس کرنے لگتا ہے، دل چاہتا ہے نیچے جھک دیکھا ہی نہیں جائے بس نظر آسمان پر رکھی جائے۔"

"مگر حسن صاحب سے کہیے یہ پاکستان ہے مصروف اور کرپٹ شہر ہے اس لیے نگاہ آسمان پر رکھی تو ذر کسی کھلے ہوئے مین ہول میں نہ جا گریں۔"

"غرور ہمیشہ انسان کو مین ہول میں ہی گراتا ہے لوگ عجز و انکسار کو بلاوجہ تو بہترین رویہ قرار نہیں دیے" جواباً ہیثم نے کہا تو کسی کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی اور اسے یقین ہوگیا یہ یقیناً حسن عمار ہے جس کو ہیثم و بزور طاقت چپ کروائے رکھنے پر کمر بستہ تھا مگر۔

"ہیثم پلیز حسن صاحب کو بزور طاقت مت چپ کروائیے انقلاب آجائے گا ورنہ۔"

"اور کیا سویٹ فرینڈ یہی تو میں کہہ رہا تھا اس سے کہ جمہوریت کا دور ہے بزور طاقت چپ کراؤ گے تو او تک کے ایوان ہل جائیں گے مگر یہ کہتا ہے نقار خانے میں طوطی کی آواز کبھی نہیں سنی گئی۔"

"ہوں یہ تو بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ہیثم" اس نے برملا تائید کی تو دوسری طرف قہقہہ گونجا۔

"ہاں جی آپ تائید نہ کریں گی تو کون حمایت کرے گا ان کی، ویسے اب میں واقعی جا رہا ہوں بقیہ با آپ اسی سے کیجیے شاید یہ آج کچھ کہہ ہی دیں آپ سے......سی ی......" ہیثم نے شاید چٹکی بھری تھی للی کو حسن عما درگت کا سوچ کر ہنسی آنے لگی۔

اور ہیثم مدہم لہجے میں اسے خواب دکھاتا رہا وہ سنتی رہی جانے یہ محبت کیا تھی کہ اس جیسی ہارڈ اسٹون کو مو کر گئی تھی شاید یہ جو پتھر ہوتے ہیں یا بنے رہنے کی کوشش کرتے ہیں وہ جب محبت کے قطرہ قطرہ ٹپکنے والی بوند سے زیر میں ڈھلتے ہیں تو ان میں محبت اسی طرح زورآور فریق بن کر ابھرتی ہے کہ اپنی سدھ بدھ اور بے نام انا کھو بیٹھتے ہیں۔

"ارے للی کیا سوچنے لگیں۔" ہیثم کی آواز کتنی بار گونجی تب اس کے دماغ کو جھنجھوڑنے میں کامیاب ہوئی

تو شاید وہ ریسیور تھامے ابھی اور بھی جانے کیا سوچنے بیٹھ جاتی۔

"کچھ نہیں دراصل میں سوچ رہی تھی کہ میں آپ کی اس محبت کو کیا سمجھوں؟" ہیثم نے بات کا مطلب سمجھا تو کہنے لگا۔

"محبت کوئی حساب کا سوال نہیں للی جسے سمجھا جائے یہ تو ایک جذبہ ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے، اس لیے جب کبھی اسے محسوس کرنا چاہو تو میری آنکھوں میں جھانک لینا یہ احساس اپنی تفسیر خود بن جائے گا میری آنکھوں میں کیا ہے صرف تمہارا چہرہ للی۔"

"مگر یہ جملے تو آپ پہلے بھی جانے کس کس سے کہہ چکے ہیں مسٹر ہیثم۔" وہ کہنے لگی۔

"محبت بہتا چشمہ ہے اس کا کوئی اختتام نہیں مگر للی عشق صرف ایک دفعہ اور ایک سے ہوتا ہے اور میری زندگی کی ایک وہ تم ہو للی ہیثم جب تم سے نہیں ملا تھا تب بھی تمہارا تھا اور جب مل گیا ہے تو سو جان سے تمہارا ہی رہے گا چاہے راکھ بن کر فضا میں بکھرے یا خاک بن کر زمین پر اس کی خوش قسمتی یہی ہو گی کہ تمہارے قدم اس خاک پر پڑیں، میں خواب سے خاک تک تمہارا ہوں للی بلیو می۔" آواز اور مخمور ہو گئی تو بے اختیار اسے خود پر رشک آنے لگا۔ وہ بھرے خوبصورت خیالوں میں کھونے لگی تھی کہ اسے قریب سے ہیثم کی آواز پھر سنائی دی۔

"للی..... للی" اور وہ اس کی صدا سے خود کو مخمور کرتی رہی دل کی ایک ایک چیز پر ہیثم ہی موجود تھا سو وہ اس خوش کن آوازوں اور اس کے قدموں کی چاپ سے خود کو سیراب کیے ریسیور تھامے کھڑی رہی۔

"کب ملو گی۔" اس نے پھر سے پکارا تو وہ ہنس پڑی۔

"جب موسم گل ہو گا جب آپ چاہیں گے تب ہی ملنے آ جاؤں گی۔"

"واؤ ڈیئر سرپرائزنگ فاری کل ہی ملو۔" ہیثم نے خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا وہ پھر بھی بے جان لائن سے اس کی جاندار سانسوں کو محسوس کرتی رہی اور جانے کب تک ایسے ہی کھڑی رہتی اگر جو سمرہ نہ آ جاتی۔ "اتنا مجسم سماعت ہو کر کسے سنا جا رہا ہے بھئی۔"

"اسے جسے محبت کرنے کا مشغلہ ہے، مگر سمرہ ڈیئر مجھے اس کے اس مشغلہ سے پیار ہو چلا ہے اب اس لیے کہ جب ہم کسی کو چاہتے ہیں تو ہماری نگاہ اس کی خامی کو بھی خوبی بنا لیتی ہے۔"

"بنا لیتی ہو گی مگر للی ڈیئر، اس کمزوری کو عرف عام میں نگاہ کی گردانا جاتا ہے ویسے تم نام بتاؤ ہو سکتا ہے موصوف کو کچھ مارجن مل ہی جائے کیونکہ آپ کو موم کرنا کچھ اتنا آسان بھی نہیں تھا۔" سمرہ نام سے تو آگاہ تھی مگر خود اس کے منہ سے سننا چاہتی تھی اور للی جھجک رہی تھی اس لیے جھٹ سے بولی۔

"تم میری دوست ہو نا آنکھوں میں دیکھو اور جان جاؤ نام۔" سمرہ نے سر ہلایا پھر پوری توجہ سے اس کی آنکھوں کو دیکھا پھر بولی۔

"تمہاری آنکھوں میں تو مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہاں کچھ سوزش بھی لگتی ہے یقیناً کل خوب دھوپ میں پھری ہو گی کہاں ہیں آئی ڈراپس۔" وہ شوخی چھپا کر پریشانی سے اس کی دراز میں آئی ڈراپس ڈھونڈنے لگی تو للی نے برا سا منہ بنایا پھر کہنے لگی۔

”جبران کہتا ہے اگر تم نے اپنے دوست کو اس کے ہر رنگ میں نہیں پہچانا تو تم اسے نہ آج سمجھے ہو نہ آئندہ سمجھ سکو گے۔“ سمرہ ہنستے ہوئے مڑی پھر بولی۔

”جبران کو کہہ دو دوستوں کے معاملات میں مداخلت مت کیا کرے رہی بات دوست کے ہر رنگ کی تو للی تمہارا ازل سے لے کر اب تک صرف ایک ہی رنگ ہے وہ ہے محبت میں نے تمہیں ہمیشہ محبت کے روپ میں ہی دیکھا ہے جب تم اس جذبے کو ماننے میں پس و پیش کرتی تھیں یا اب جب کہ یہ جذبہ تمہیں تسخیر کر چکا ہے اس لیے آئندہ والے جملے کی سوری کرو کیونکہ نہ محبت حساب کا سوال ہے نہ دوستی، سائنس کا کوئی مشکل فارمولا، یہ تو سب دل کی صورتیں ہیں محبت، دوستی، وفا، اعتبار مختلف روپ مگر معنی سب کے ایک ہی نکلتے ہیں ویسے ہاشم ولی پہلی نظر میں مجھے واقعی اچھے لگے تھے اب تمہاری نسبت سے تو اور اچھے لگنے لگے ہیں۔“ للی نے اسے کھینچ کر خود سے لگا لیا پھر بولی۔

”سمرہ اگر تم اور انکل نہ ہوتے تو جانے میں کہاں ہوتی کیسی ہوتی۔“ سمرہ نے اس کے آنسو پونچھے پھر بولی۔

”ہم نہ ہوتے تب بھی یہ طے ہے تم ظفر انکل ہی کی لاڈلی ہوتیں، اور آئی ایم شیور ایسی ہی خبطی اور ہوتی ہوتیں مختلف نظر آنے کے چکر میں۔“

”ہاں شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔“

”بندی کبھی غلط کہتی ہی نہیں۔“ ہنستے ہوئے لمحہ بھر کو وہ رکی پھر بولی۔ ”للی یار بہت دن ہوئے ایک کام کہا تھا تم سے اس کا کیا ہوا؟“ للی کے دماغ میں خطرے کا الارم بجنے لگا مگر وہ بظاہر مطمئن ہی رہی۔

”للی کچھ پوچھا ہے نا میں نے۔“ للی نے دیکھا پھر لاپرواہی سے بولی۔

”مجھ جیسے کام کے بندے کے پاس ہر وقت سینکڑوں آرڈر لسٹ پر رہتے ہیں، تم بتاؤ تم نے کون سا کام کہا تھا۔“ سمرہ نے گھور کے دیکھا پھر لمحہ بھر میں چہرے کا تاثر بدل کر دلار سے بولی۔

”للی تم میری دوست ہو نا پلیز، بتا دو روشن آنٹی کے متعلق تم نے کیا پتا لگایا۔“

”کوئی خاص نہیں روشن آنٹی فرینڈلی ہونے کے باوجود بہت ریزرو ہیں پھر میری استاد بھی ہیں اس لیے صرف اتنا ہی پتا چلا ہے کہ ان کی بھی ایک بیٹی تھی بالکل تمہاری طرح پھر وہ کہیں کھو گئی تو تمہارے چہرے میں انھیں اس کا عکس نظر آیا وہ تم سے مل بیٹھیں۔“

”للی سچ بات بتاؤں، تیری اس فلمی کہانی میں بہت جھول ہے۔“

”آج کل ایسی ہی فلمیں ہٹ ہو رہی ہیں کوئی بات نہیں۔“ وہ اثر لیے بغیر چپ ہو گئی تو سمرہ نے ٹھنڈی سانس بھری پھر بولی۔

”اس کو میں کیا سمجھوں کیا مجھے خود انویسٹی گیشن کرنی پڑے گی۔“

للی نے اس کی جانب دیکھا پھر جھلا کر بولی۔

”یہ کوئی خطرناک گروہ والا کیس تو ہے نہیں کہ تم انویسٹی گیشن کرتی پھرو، بھئی وہ بھی صاحب دل ہیں پھر ایک مصورہ ہونے کے ناتے کچھ حساس بھی، اس لیے اس مسئلہ میں کچھ بھی نہیں بچتا جس پر تم اپنا وقت برباد کرو۔“

سمرہ نے نگاہ کھڑکی سے باہر ٹکا دی پھر مدھم لہجے میں بولی۔

"بعض کام ہم صرف اپنی تسکین کے لیے کرتے ہیں، لٹی ڈیئر کچھ حاصل کرنے کی تھنکنگ انسان کی سوچ کو محدود کر دیتی ہے اس لیے مجھے اس سے غرض نہیں کہ مجھے کچھ ملے گا یا نہیں ملے گا میرے لیے یہی کافی ہے کہ میں اس سوال کو حل کر کے مطمئن ہو جاؤں گی۔"

"لیکن انکل اس بارے میں تم سے وعدہ لے چکے ہیں۔" نبیرہ پھر سے شروع ہوئی مگر وہ اس کے ہاتھ نہیں آئی بے پروائی سے ادھر ادھر دیکھتی رہی جیسے کمرے میں اس کے سوا کوئی موجود ہی نہیں اور وقت اس کے جواب کے لیے حالات ترتیب دے رہا تھا بالکل خاموشی اور سرعت سے۔

☆

ہیثم اپنے بیڈ روم میں بیٹھا اسکیچ بنا رہا تھا جب اچانک جنید بھائی دستک دیے بنا کمرے میں داخل ہوئے ہیثم نے کاغذ تکیے کے نیچے چھپا لینے کی ناکام کوشش کی، ناکام اس لیے کہ جنید بھائی نے آتے ہی اس پر ہی جھپٹا مارنے کی کوشش کی تھی ہیثم نے جسم کا سارا بوجھ تکیے پر ہی ڈال دیا تھا۔

"جنید بھائی یہ چیٹنگ ہے، پلیز مت بور کریں۔" مگر جنید بھائی کس کی سننے والے تھے زور بازو سے بالآخر تکیہ اٹھایا تو سیٹی کے سے انداز میں ان کا منہ کھل گیا۔

"ہے کوئی آپ کا کیا؟" "واؤ بیوٹی فل کون ہے یہ۔"

"اچھا بیٹا ہم سے اکڑو گے، ابھی یہ تصویر ممی کی سامنے جا رکھی نا تو۔"

"نہیں آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے۔" اس نے سختی سے کہا تو جنید بھائی ہنسنے لگے۔

"شی از ویری گڈ لُکنگ بٹ ہو از شی یار۔" ہیثم نے سوچا جان نہیں چھوٹ سکتی سو آہستگی سے لٹی کے متعلق سب کچھ انہیں بتا دیا جنید بھائی سنتے کے ساتھ ہی بیڈ پر اچھل کر بیٹھ گئے۔

"نہیں بھئی...... کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ آپ جو ہر ماہ محبت کرنے کی بیماری میں مبتلا ہیں ایک جگہ ٹھہر گئے یہ لڑکی واقعی ملنے کی چیز ہے یار، تم جیسے شیطان کو انسان بنا ڈالا آئی کانٹ بلیو اٹ ویسے کب ملوا رہے ہو۔" کہتے کہتے جنید بھائی نے سر اٹھایا تو ہیثم کو عجیب پراسرار انداز میں مسکراتے پایا۔

"خیریت یہ ولن والے اسٹائل میں کیوں بتیسی نکال رہے ہو۔"

"کچھ نہیں۔" اس نے چہرے کے تاثرات چھپا لیے مگر جنید بھائی ایک کائیاں تھے جھٹ سے بولے۔

"ہیثم بہت بری بات ہے، اگر تم اتنی پیاری لڑکی کے ساتھ بھی فلرٹ کر رہے ہو۔"

"کیوں بری بات کیا ہے، آپ کو پہلے تو کسی سے ہمدردی نہیں ہوئی تھی اس نے نگاہ ترچھی کر کے پوچھا تو جنید بھائی کے چہرے پر سنجیدگی پھیل گئی اور وہ بولے۔

"ہمدردی مجھے ہر ایک سے تھی مگر جب میں نے محسوس کیا تم سے بے وقوف بننے والی لڑکیاں خود بھی تمہیں بے وقوف بنانے پر آمادہ ہیں، اور یہ کہ ان کی محبت صرف تمہاری جاہ حشمت سے ہے تو میں نے خود ہی پیش قدمی نہ کی مگر ہیثم یہ لڑکی...... یہ لڑکی مجھے خود اپنے دفاع پر مجبور کر رہی ہے، اس میں کوئی مختلف سی بات ہے ضرور...... شاید اس کی آنکھیں، دفاع کرتی ہیں اس کا دیکھو ہیثم یہ آنکھیں ایسی نہیں لگتیں جیسے وہ دریچے ہوں جن سے محبت لپٹی کسی کا انتظار کر

رہی ہے اور یہ کہ......"

"اور یہ کہ آپ آج کل اردو ادب کی کتابیں بہت پڑھ رہے ہیں ورنہ کیا ہے ان آنکھوں میں عام سی تو ہیں ہاں کچھ بڑی ہیں اور بس۔"

"غور سے دیکھو تو پتا چلے نا تمہیں، اس وقت تم پر صرف بے وقوف بنانے کا بھوت سوار ہے لیکن ہیثم یہ یاد رکھنا یہی لڑکی سچے جذبات لیے منتظر ملے گی ہمیشہ اور اگر تم نے اسے دکھ دیا ناں تو بلیومی تم خوش بھی نہ رہ سکو گے۔"

"ہوں یہ بہت بعد کی باتیں ہیں، جنید بھائی ابھی تو میں مصروف ہوں محبت کرنے دیجیے اور پھر میں نے تو سنا ہے محبت نام ہی ذا جنگ لا کا ہے۔"

"ہاں مگر صرف ان کے لیے جو خود اس بری لت میں مبتلا ہوتے ہیں ورنہ محبت تو بے وفائی میں بھی بڑی جاندار لگتی ہے محبت کا دھوکا بعض اوقات زندگی سنوار دیتا ہے ایک سوچ کا دریچہ کھول دیتا ہے۔

مگر ضروری نہیں محبت سب کے لیے ایسی ہی ہو جیسی آپ کہتے ہیں یہ مستحکم لوگوں کی باتیں ہیں، جو محبت میں تو ٹوٹتے ہیں مگر بکھرتے نہیں مگر جنید بھائی ہم میں سے اکثر حساس تاروں سے مل کر بنائے گئے راگ کی طرح ہوتے ہیں ایک جھٹکا بھی تار توڑ سکتا ہے ایسے کہ زندگی کا مفہوم ہی دکھ حسرت بن جائے اور ایسی لوگ زیادہ جیا نہیں کرتے جنید بھائی۔" جنید بھائی نے غور سے اس کا دکھ بھرا لہجہ سنا تو حیرت سے دیکھا۔

"واٹ از یور پرابلم ہیثم، اتنے ڈھیر سارے لوگ تم سے محبت کرتے ہیں سب سے بڑھ کر ممی لیکن پھر بھی تمہارے لہجے میں محبت کی طرف سے اتنا تنفر اس قدر بے یقینی کیوں ہے۔"

"پتا نہیں بعض باتیں محسوس ہوتی ہیں، مگر سمجھ میں نہیں آتیں ہم انہیں کوئی نام دے ہی نہیں سکتے سوگ محسوس کرتے ہیں مگر اداسی بوریت کی وجہ نہیں جان سکتے انسان کا دل اور دماغ واقعی ایک لاینحل مسئلہ ہے، جنید بھائی جس دن سمجھ لیا گیا زندگی بڑی سہل ہو جائے گی۔"

"ہو جائے گی۔ مگر جنہیں سہل انداز میں جینے کی عادت نہیں وہ کیا کریں۔"

"وہ گرما گرم کافی پئیں، ممی آپ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے مگر اپنی روٹین نہیں بھولتیں۔" کافی کا کپ لاتی ممی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے محبت سے کہا جنید بھائی نے بھی پلٹ کر دیکھا۔

"کس قدر کمزور ہوتی جا رہی ہیں یہ ممی۔" ممی نے سنا تو لمحہ بھر کو رک گئیں ہیثم نے کافی کا کپ سینٹر ٹیبل پر رکھا جنید بھائی نے فوراً کپ اچک لیا۔

"اس وقت کافی پینے کی شدت سے طلب ہو رہی تھی تھینکس ہیثم میں کافی کی تاریخ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھو گا۔" وہ ہونٹوں تک کپ لے کر ہی گئے تھے کہ ممی نے سختی سے منع کر دیا۔

"یہ ہیثم کے لیے ہے تمہیں کافی چاہیے تو بیڈ روم میں چلو میں بھجوا دیتی ہوں۔" ہیثم نے مایوس سے جنید بھائی کو دیکھا تو دبے دبے لہجے میں بولا۔

"پینے دیں ناں ممی کیا ہوا ہیثم پئیں یا میں بات تو ایک ہی ہے۔"

"بات ایک نہیں ہے مجھے غلط حرکتیں کسی کی بھی ہوں بری لگتی ہیں۔"

''اف اب کافی پینے میں بھی اڑچن آ گیا۔'' جنید نے برا سا منہ بنایا تو ہیثم نے کپ واپس کھینچ لیا پھر چڑانے کو بولا۔

''آپ کی بدقسمتی پروار میں بے قصور ہوں۔'' جنید بھائی جلے بیٹھے رہے ممی اٹھ کر چل دیں اور ہیثم کافی کی چسکیاں لیتا رہا ساتھ ساتھ کافی کے ٹیسٹ پر بحث بھی کر رہا تھا۔

''کچھ ذائقہ مختلف سا ہے آج ہگرات ازسوناکس کافی۔'' جنید بھائی نے سر ہلا کر بوریت سے کہا۔

''اس وقت تم نہیں بکو گے تو کون بکے گا بیو مرد۔'' وہ اٹھ گئے اس کے تاؤ دلانے پر تو ہیثم نے انہیں روکا نہیں پھر کافی کا آخری گھونٹ بھی لے لیا، پھر دوبارہ للی کی تصویر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اس کے ہاتھ تیز رفتاری سے چل رہے تھے پھر آخری ٹچ دے کر وہ تکیے پر سر رکھ کے لیٹا تو بلاوجہ سارے جسم میں سنسنی دوڑتی محسوس کی وہ دوبارہ اٹھنا چاہتا تھا مگر اس سے اپنا جسم بھی اٹھایا نہیں جا رہا تھا ابھی تھوڑی دیر پہلے تو ٹھیک تھی طبیعت..... اس نے سوچا آواز دینے کو دل چاہا مگر وہ ممی کے آرام میں خلل کا سوچ کر چپ ہی ہو گیا پھر اس نے دھیرے سے آنکھیں بند کر لیں تو نیند خود بخود اس پر چھاتی چلی گئی اور دوسری صبح وہ جاگا تو حسب معمول نارمل تھا ہاں کچھ کمزوری سی محسوس کر رہا تھا۔

لیکن آج للی سے اس کی ملاقات طے تھی اس لیے وہ خود کو شام تک فٹ کرنے میں باآخر کامیاب ہو ہی گیا، للی آج گرین شرٹ بلیک جینز میں پہلے کی طرح حسین دکھائی دے رہی تھی اور ہیثم تمام توجہ اس پر صرف کرتا اسے شیشے میں اتار لینے کے پروگرام پر کاربند تھا للی اس کی محبت لٹاتی نگاہوں پر دل و جان سے مرکوز تھی اس لیے وہ اس کے دل کی بے ایمانی کو سمجھ نہ سکی عورت کے لیے محبت سب سے بڑا دھوکا ہے اس دھوکے میں رکھ کر آپ اس سے دنیا ٹھکرانے کو بھی کہہ دیں گے تو وہ اس پر بھی راضی ہو جائے گی کہیں نہ کہیں بلڈ کمپوزیشن میں کسی عنصر کی کمی یا زیادتی تھی ضرور جو یہ عورت جو خود کو دنیا کی سب سے زیرک اور عقلمند مخلوق سمجھتی ہے اس جذبے کے آگے پورے قد سے گر جاتی ہے۔

یہاں تک کہ مختلف نظر آنے والی للی ظفر جیسی لڑکیاں بھی کسی نہ کسی نام کے لیے دل کا در کھلا رکھتی ہیں عورت کی ذات میں محبت اور انتظار لازم و ملزوم ہیں اس لیے یہ لڑکیاں مجسم دریچہ رہتی ہیں کسی کے قدموں کی چاپ کسی کی صدا کی راہ تکتا ہوا دریچہ اور پھر جب دریچے سے جھانکتے ہوئے ہیثم ولی جیسا بندہ ٹکرا جائے تو دل کا دروازہ خود بخود کھل جاتا ہے بنا کسی دستک کے سو للی ظفر کے من کا در بھی پورا کا پورا کھلا ہوا تھا۔ محبت دل میں گھر کر جائے تو دل دل نہیں معبد بن جاتا ہے محبت کی پاکیزگی انسان کی ساری کثافت جذب کر کے اسے دھیرے دھیرے خوشبو بنا ڈالتی ہے بے غرض محبت گلاب کی طرح ہی تو ہوتی ہے ہاتھ میں چاہے کتنی ہی بار مسلو انگلی کی پور سے مشام جاں تک سب معطر کر دیتی ہے۔

''کیا سوچنے لگیں للی اتنی دیر سے خاموش بیٹھی ہو جب کہ میں تو آج صرف تمہیں ہی سننے آیا تھا پلیز للی آج تم دل کا ہر سکھ ہر دکھ مجھ سے شیئر کر سکتی ہوں اگر تمہیں مجھ پر میری وفا پر اعتبار آ گیا ہو۔'' للی نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا پھر آہستگی سے بولی۔

''مجھے لہجے جان لینے اور آنکھیں پڑھنے میں مہارت حاصل ہے مگر ہیثم جس شخص کو تمام عمر محبت جیسی نعمت نہ ملی ہو اسے یک دم کسی خزانے کی طرح یہ دولت ہاتھ لگ جائے تو وہ دھڑکے میں رہتا ہے تشکیک میں رہتا ہے کہ یہ خزانہ

اس کا ہے بھی یا نہیں بس میں اس لیے چپ سی تھی مجھے تم پر نہیں اس خوش نصیبی پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔“

”اعتبار آتا نہیں، کرنا پڑتا ہے للّی، دنیا میں کون سا جذبہ کون سا شخص ہے جو دوسرے کسی شخص کو اچھے دنوں اچھی اور سچی محبتوں کا بہلاوا دے کر چیٹ نہیں کر رہا ہے یہ معاشرہ ہے، اس دنیا میں لوگ اتنے سارے دھوکے کھا کر بھی زندہ ہیں محبت جیسے آفاقی جذبے کو مانتے ہیں درحقیقت للّی خامی اس دھڑ کے میں رہنے والی اپروچ میں ہے وگرنہ دیکھا جائے تو دھوکا دینے والا بھی مجرم نہیں ہوتا ہم اپنے اپنے حصے کی شکست کھاتے ہیں کوئی ہمیں دھوکا دے جاتا ہے تو کسی کو ہم، یہ تو پارٹ آف لائف ہے اسے تسلیم کرنا چاہیے کسی کو موردِ الزام نہیں ٹھہرانا چاہیے۔

یہ محبت کا مسلک نہیں ہے للّی کہ ہم تو محبت کی طرف سے ملنے والے زخموں کو بھی گلاب اور پتھر کو بھی سوغات سمجھتے ہیں محبت تو سمندروں ایسی گہری، آسمان ایسی وسیع ہے اور ہم تم ایسی ہی محبت کریں گے صلے کی تمنا کے بغیر کیا یہ کم ہے للّی کہ تم مجھے چاہتی ہو اور مجھ میں صرف تم بستی ہو۔“

”یہ تو بہت زیادہ ہے میری سوچ سے بھی بہت زیادہ ہے مگر ہشم میں ابھی محبت کی اس سیڑھی پر نہیں ہوں جہاں بچھڑ جانے والے کا سوگ نہیں منایا جاتا دھوکا دینے والے کو بھی موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاتا بلکہ اس کی محبت کو اچھی یاد کی طرح دل میں سجا لیا جاتا ہے ہشم مجھ سے بھی اپنا لہجہ اور یہ نگاہیں مت موڑنا میں بہت شدت پسند ہوں نا شاید یہ سب سہہ نہ سکوں۔“

”جب کہ میرا خیال ہے یہ سب کہنے کی باتیں ہیں وگرنہ ہم اپنے دکھ عمر بھر سہتے ہی آئے ہیں بلکہ جن کے بارے گمان ہوتا ہے کہ ان چہروں کے بغیر ہم زندگی کا بوجھ اٹھا ہی نہیں سکیں گے ہم ان کے جانے کے بعد بھی اسی رفتار سے زندگی کا بوجھ اٹھائے وقت کی بچھائی خارزار راہ پر چلتے چلے جاتے ہیں، ہنستے ہیں، اسی طرح بولتے ہیں، کھاتے ہیں، پیتے ہیں، ہم بس سوچتے ہیں للّی ورنہ زندگی کسی کے ہونے پر مکمل ہوتی ہے نہ کسی کے جانے پر ادھوری ہے......“ وہ کہہ کر چپ ہو گیا تو للّی نے غور سے اسے دیکھا پھر کہا۔

”اگر یہ سچ ہے تو لوگ ایک دوسرے کی آرزو کیوں کرتے ہیں محبت کیوں کرتے ہیں۔ آپ بھی تو ابھی کہہ رہے تھے آپ میرے بغیر اور میں آپ کے بغیر نامکمل ہوں۔“ للّی نے باقاعدہ بحث کی تو ہشم کے بھوری مونچھوں تلے ہونٹ مسکرائے پھر وہ بولا۔

”درحقیقت للّی میں ان لوگوں میں سے ہوں، جن پر محبت کبھی مکمل منکشف نہیں ہوتی ادھ کھلے دریچے کی طرح کھلتی ہے میں ایک پہلو سمجھ کے اس پہ بحث کرنے ہی لگتا ہوں کہ مجھ پر محبت کا دوسرا پہلو الہام کی طرح اترنے لگتا ہے اس کے بارے میں کچھ سوچتا ہوں تو کوئی اور سوال مجھے پکارنے لگتا ہے اور میں......درمیان ہی میں اٹک جاتا ہوں للّی شروع سے میں محبت کی کھینچی گئی سیدھی لکیر کے ایک طرف کھڑا ہوں مگر یہ گنجلک سوالات مجھے دیوار کے اس طرف نہیں دیکھنے دیتی اس طرف جانے کیا ہے، للّی جو کشش کی طرح کھینچتا ہے مجھے اور میں بے قرار ہو جاتا ہوں محبت اپیل بھی کرتی ہے اور کبھی محبت بوریت کی طرح بھی لگتی ہے جیسے میں بندھ گیا ہوں۔“ للّی نے اسے ہمدردی سے دیکھا پھر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دلاسے سے رکھا اور کہا۔

”میں بھی پہلے اس سے کچھ مختلف نہیں سوچتی تھی ہشم بلکہ محبت کے لیے جو زیادہ حساس ہوتا ہے جو مکمل محبت

کو بانا چاہتا ہے وہ اسی طرح سوچتا ہے۔"

"مکمل محبت آخر یہ مکمل محبت ہے کیا للی۔" ہیشم نے بے ساختگی سے اس کا نرم نازک ہاتھ تھام کے پوچھا تو للی میں جیسے عجیب سا ارتعاش پیدا ہوا چہار طرف اسے ہیشم کی نا، یدہ پکار سنائی دینے لگی جیسے وہ اپنے خدا سے اسے چپکے چپکے دعاؤں میں مانگنے لگا ہو۔

للی نے یقین سے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا پھر آنکھیں بند کر کے گہری سانس کھینچتی ہوئی ہیشم کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہنے لگی۔

"مکمل محبت! یہ مکمل محبت تو میں بھی ہوں تم بھی ہو، ہر دھڑکتا دل جو بے ریا پر خلوص ہے وہ مکمل محبت ہے یہ سرخوشی کی ایک کیفیت ہے جسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے سائنس کے فارمولے کی طرح اس کی کوئی تھیوری نہیں ہوتی۔" اور ہیشم ولی جو دل سمیت اس لڑکی کو شیشے میں اتارنے آیا تھا اس کی سچائی پر اس کے شیشہ دل میں بنا کسی مزاحمت اور پابندی کے قید ہوتا چلا گیا۔ واقعی بعض چہرے دھوکا دینے کے لیے نہیں ہوتے بلکہ خوشی آرزو کی طرح دل میں سینت کر رکھنے والے ہوتے ہیں اور جو ہمیں بظاہر آزاد رکھتے ہیں مگر درحقیقت ہم ان چہروں کی اس دریا دلی پر ہی ان کے سحر میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

ہیشم ولی نے بدقت سوچتے ہوئے نگاہ للی پہ گاڑ دی پھر آہستگی سے بولا۔

"دی مور آئی تھنک آئی ایم نوٹ باؤنڈ دی مور آئی فائنڈ مائی سیلف باؤنڈ۔"

للی نے توجہ سے سنا کچھ کہا نہیں اور ہوٹل کے مغربی حصے سے اٹھتی میوزک کی لہریں اس جملے میں مدغم ہو گئیں للی اور وہ کھانے کے بعد کافی کی چسکیاں بھر رہے تھے اور قریب کھڑا کیوپڈ بڑبڑا رہا تھا۔

"محبت قید نہیں کرتی مگر پھر بھی باندھ لیتی ہے تباہ نہیں کرتی مگر پھر بھی مٹا دیتی ہے۔" مگر دونوں میں سے شاید کوئی بھی کیوپڈ کے یہ جملے نہیں سن پایا تھا اس لیے محبت کے دیوتا نے ان کی معصومیت اور جذباتیت کو دیکھ کر انہیں دعائیں دیں اور آگے بڑھتا چلا گیا لامحدود وسعتوں کی طرف۔

پاپا بہت دنوں سے دیکھ رہے تھے کہ سمرہ کھوئی کھوئی رہنے لگی ہے بات بہت کم کرتی ہے اور اگر پاپا اسے زبردستی مخاطب کرتے بھی تو وہ ہمیشہ نگاہ فرش کی طرف ٹکا کر رکھتی ہے جیسے چپکے چپکے کوئی جرم کر رہی ہو اگر نگاہ اٹھائے تو پکڑی نہ جائے لیکن پاپا سے اب مزید برداشت نہیں ہو رہا تھا اس لیے انہوں نے للی کو فون کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی تہیہ کیا ہوا تھا کہ وہ سمرہ کی پرابلم پوچھ کر رہیں گے انہیں للی کا انتظار تھا اس لیے دو تین بار ملازم کے کہنے کے باوجود ابھی تک انہوں نے رات کا کھانا لگوانے کو نہیں کہا تھا۔

سمرہ ان کے قریب بیٹھی میگزین دیکھ رہی تھی اس لیے دوبارہ منع کرنے پر اس نے گردن اٹھا کر غور سے پاپا کو دیکھا پھر آہستگی سے پوچھا۔

"کس کا انتظار ہے پاپا۔"

"ہاں کسی کو بلایا ہے میں نے۔" پاپا نے جواباً کہا تو اسے تجسس کے ساتھ ساتھ بوکھلاہٹ بھی ہونے لگی۔

"آپ نے انوی ٹیشن دینے کے بعد بتا تو دیا ہوتا کہ شایان شان کچھ......"

"ہیلو مائی ڈیئر انکل۔" للی لمبا سا ہیلو کرتی پاپا کے گلے سے جھولی تو سمرہ کا جملہ ادھورا رہ گیا وہ للی کو غور سے دیکھنے لگی مہندی رنگ کے چکن کے کرتے مہندی کلر ہی کی شلوار پر بڑا سا جارجٹ کا دوپٹہ لیے یہ للی اس للی سے بہت مختلف لگ رہی تھی۔

"اسے سرپرائزنگ پنچ دینے کا کتنا شوق ہے مگر لگ پیاری رہی ہے۔" اس نے ناراضگی کے باوجود دل میں سوچا مگر کہا نہیں کہ وہ جان کر اس کی طرف سے بے نیاز دکھائی دینے کی خاص کوشش کر رہی تھی اور پاپا وہ پوری طرح اس کی طرف نگاہ کیے ہوئے تھے ان کی آنکھوں میں فخر تحسین شفقت سبھی کچھ تو تھا۔

"آج بہت پیاری لگ رہی ہو للی بیٹا۔"

"تھینکس انکل۔" وہ شگی کٹ بالوں کو جھلاتے ہوئے مکمل سمرہ کی طرف گھوم گئی پھر بولی۔

"کیوں یار تم کچھ نہیں کہو گی دیکھو بدل لی نا جون تمہاری یہی خواہش تھی ناں۔"

"ہاں مگر تم نے یہ جون میرے کہنے پر تو نہیں بدلی۔"

"پھر! کون ہے بھئی اس پردہ نگاری میں۔" پاپا نے جملہ سنا تو شوخ ہو گئے للی شرما گئی شفق کے ساتوں رنگ اس کے چہرے پر کھل گئے واقعی یہ محبت انسان کو سراپا اسی طرح بدل دیتی ہے پاپا نے سوچا، وہ پاپا کے قدموں میں بیٹھ گئی سمرہ نے پاپا کے دوبارہ اصرار کرنے پر خفگی بھرے لہجے میں ہیثم کا نام بتا دیا پاپا نے سنا تو خوب محظوظ ہوئے۔

"مان گئے اس کیوپڈ کو بھی، یعنی دو کافر ایک دوسرے کے ہاتھوں مسلمان ہو گئے ایکسیلینٹ مجھے بہت خوشی ہوئی تم دونوں کی محبت کے اس انجام پر۔" پاپا نے کھینچ کر للی کو سینے سے بھی لگا لیا مگر سمرہ وہیں تنی بیٹھی رہی پاپا نے دیکھا تو کہا۔

"مجھے حیرت ہے سمرہ تم بہن کی اس خوشی میں خوش کیوں نہیں لگ رہیں۔"

"اس لیے کہ خوشی دل سے پھوٹنے والے جذبے کا نام ہے جب کہ میں آج کل دل کے ہی بہت خلاف ہوں۔"

"بکو مت سمرہ اٹھو اور ادھر آؤ۔" پاپا نے ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے حکم دیا تو وہ بدقت اٹھ کر ان کے قریب آئی پاپا نے اس کی بے زاری محسوس کی تو اس کی ٹھوڑی اونچی کر کے محبت سے پکارا۔

"ایسی کیا بات ہے سمرہ جو تم نہ صرف اپنے آپ سے بے پروا ہو گئی ہو بلکہ للی سے بھی نہیں ملیں اتنے دنوں سے۔" للی نے پاپا کے لہجے کی مایوسی محسوس کی پھر تحکم سے سمرہ سے مخاطب ہوئی۔

"میرے لیے تمہاری لاپرواہی صحیح ہے مگر انکل کے لیے تمہاری بے رخی بالکل نہیں جچتی۔"

"ضروری تو نہیں میں ہمیشہ دوسروں کے کہنے ہی میں رہوں اور پھر میں فضول وقت تو نہیں برباد کرتی پھرتی تمہاری طرح، کام کرتی ہوں کام۔"

"بہت خوشی ہوئی کہ تم آج کل کام کرتی ہو، یہ بھی تسلیم کہ آج کل دنیا کے کام تمہارے ناتواں کاندھوں پر ہی دھرے ہیں مگر تمہارے لہجے میں کام کی تھکن سے زیادہ جھنجلاہٹ اور غصہ ہے آخر کیوں؟" اس نے کاندھے پر ہاتھ رکھا مگر وہ ویسے ہی غصے میں بھری رہی۔

للی نے پاپا کا خیال کیے بغیر بے تکلفانہ اس کے بازو میں چٹکی بھری تو اس نے اس کی طرف دیکھنے کی بجائے پاپا کو دیکھا پھر بنا کسی جھجک کے بولی۔

”روشن گوہر کون ہیں پاپا۔“ للّی کا سانس رکنے لگا اور اس کے موڈ سے پریشان پاپا کے چہرے پر پسینے کے قطرات نمودار ہونے لگے اور وہ بولے گئی۔

”آخر ایسا کون سا راز ہے جو یہ للّی اور آپ مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں کوئی کسی اجنبی کے لیے اتنا حساس نہیں ہوتا بتائیے پاپا روشن گوہر سے ہمارا کیا تعلق ہے، پاپا میری ماما کون تھیں آج تک میں نے ان کی کوئی تصویر نہیں دیکھی آپ کہتے تھے پرانی یادیں کریدنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا سوائے راکھ کے اور پاپا میں نے کسی آسمانی صحیفے کی طرح آپ کی یہ بات دل میں اتار لی، کبھی ماما کو دیکھنے کی ضد نہیں کی۔

لیکن آج جانے کیوں مجھ میں ابال اٹھ رہے ہیں پاپا بتائیے یہ روشن گوہر کون ہیں؟“ اس نے پاپا کو جھنجوڑ ڈالا، پاپا بس جینے مرنے کی درمیانی کیفیت میں ساکت سمرہ کو دیکھے گئے لفظ دل میں داغ کی طرح جم گئے کہیں اندر سے ٹیس اٹھنے لگی مگر وہ خاموش رہے۔

للّی سے ان کا ضبط دیکھا نہیں جا رہا تھا ان کی اذیت اس کی آنکھ میں آنسو کی طرح نکلنے کو بے قرار تھی۔ مگر سمرہ جو کبھی پاپا کو دکھ دینے کا سوچ نہیں سکتی تھی جس نے ہمیشہ پاپا کی محبت کا دم بھرا تھا آج بہت سرد مہری ہو گئی تھی۔ جذباتیت اور تجسس نے مل کر اسے صرف اپنے تک محدود کر دیا تھا اس وقت وہ صرف اپنے اور روشن گوہر کے تعلق کو سوچ رہی تھی اس لیے پاپا کی ذات اس کی نظر سے محو ہو گئی تھی۔

اور صوفے پر ساکت بیٹھے پاپا اس دکھ میں ڈوبے جا رہے تھے وہ جو سمجھتے رہے انہوں نے اپنی بیٹی کو ماں کا پیار بھی دے کر اس کے خلا کو بھی بھر دیا ہے تو حقیقتاً وہ کتنا غلط سمجھ رہے تھے وہ تو ابھی سمرہ کے دل کی دہلیز بھی نہیں چھو سکے تھے ماں واقعی ساحر رشتہ ہے اس کے سامنے ہیچ ہو جاتا ہے انسان کی تمام ریاضت اس نام کے سامنے مٹی میں مل جاتی ہے۔ ان کی محبتوں کا رنگ ماند پڑ گیا تھا سمرہ کی آنکھ میں صرف ماں کا لفظ گونج رہا تھا اور وہ باپ ہو کر کسی اجنبی کی طرح اس کے سامنے وٹنس باکس میں کھڑے مجرم کی طرح سر جھکائے ہوئے تھے۔

”بتائیے ناں پاپا روشن گوہر کون ہیں؟“

”آئی ڈونٹ نو۔“ پاپا نے جانے کیسے کہا اور لگا جیسے دل کا کوئی ٹانکا ادھڑ گیا ہو محبت سے منہ موڑ لینا کسی تعلق سے مکر جانا اتنا آسان تو نہیں ہوتا نا، سو پاپا کا روم روم بھی اس جھوٹ پر احتجاج کر رہا تھا وہ بدقت اٹھے تو للّی نے تیزی سے ان کے لرزیدہ وجود کو سہارا دیا اور پاپا نے اس کی بے رخی پر اتنے دکھ سے اسے دیکھا۔ پاپا کو دکھ میں بین کرنے کی عادت نہ تھی وہ تو چپکے چپکے جل جانے والے لوگوں میں سے، دھواں اڑائے بنا راکھ ہو جانے والوں میں سے تھے اس لیے للّی کے ہمراہ وہ اٹھ آئے مگر اپنے بیڈ روم میں پہنچے تو سارا ضبط آنسو بن گیا اور انہوں نے بے قراری سے پوچھا۔

”للّی محبتیں اتنی ناپائیدار چیز ہوتی ہیں کہ بس اک نئی محبت کے لیے اپنی آب و تاب کھو دیں سمرہ جو میرے ہر قدم پر بچھ بچھ جانے کی بات کرتی تھی آج محض روشن کی وجہ سے اس نے میرے ٹوٹتے بکھرتے وجود کو سنبھالا بھی نہیں وہ، للّی کیا یہی ہے، میری قسمت کہ میں مرنے سے پہلے اسطرح محبت کے دیس سے جلاوطن کر دیا جاؤں۔

للّی میں نے تو اپنا سب کچھ سمرہ پر نچھاور کر دیا، لیکن آج...... آج تم نے دیکھا وہ مجھ سے کس قدر متنفر دکھائی دے رہی تھی جیسے...... جیسے میں اس کی خوشیوں کی راہ میں دیوار ہوں کیا، للّی میں دیوار ہوں...... ہیں بولو......“ پاپا بیڈ پر

بیٹھ کر، وحشت زدہ انداز میں چلائے تو للّی کو ان کے انداز سے خوف آنے لگا۔

"انکل بی ایزی سمرہ کو میں سنبھال لوں گی یقین کریں میرا۔"

"یقین......! یقین تو ہار گیا ہے للّی گمان سے یقین ہار گیا ہے مگر اسے لکھ لو وہ مجھے گنوا کر بھی خوش نہیں رہے گی کیونکہ میں نے اپنی تمام تر محبت سے اسے تعمیر کیا ہے میرا دل صرف اس کی محبت سے دھڑکتا ہے، للّی اس لیے اب جب کہ میں اس کے دل اس کی آنکھوں، اس کی محبت میں کہیں بھی نہیں ہوں تو مجھے زندگی سے نفرت ہونے لگی ہے، آئی ہیٹ لائف ود آؤٹ سمرہ۔" انہوں نے تکیے پر سر رکھ کر پوری سچائی سے کہہ دیا اور للّی کو ان کا یہ سچ خوفزدہ کرنے لگا کہ وہ ان کی بیٹی نہ سہی بیٹی جیسی تو تھی اور اسے اپنے یہ انکل دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھے۔ اس لیے اس نے پھر سے ہمتیں مجتمع کیں اور بولی۔

"انکل پلیز ایسی باتیں مت کریں، وہ ناسمجھ ہے اسے اپنے اچھے برے کی تمیز نہیں مگر میں اسے سمجھاؤں گی وہ پھر سے پہلی والی سمرہ بن جائے گی بلیو می انکل۔" للّی نے آگے بھی کچھ کہنا چاہا مگر پاپا نے سننے کی بجائے آنکھیں بند کر لیں کہیں سے برسوں کے رکے وہ آنسو جو روشن کو ہر کی جدائی میں نہیں ٹپکے تھے آج بہہ گئے تھے۔

جانے کیوں ان کا دل پگھل پگھل کر بہہ جانا چاہتا تھا یک دم ہی سے ان میں زندگی کی خواہش کہیں اندر ہی اندر مر رہی تھی اور ان کے قریب بیٹھی للّی بار بار ان کے سر کو تکیے پر دائیں بائیں مارتے دیکھ کر حواس باختہ ہو رہی تھی۔

"انکل آپ کو کیا ہو رہا ہے انکل آپ ٹھیک ہیں نا؟" اس نے بے قراری سے پاپا کی پیشانی چھوئی تو لگا کسی برف کو چھو لیا ہو۔ اس نے پھر سے پکارا تو پاپا نے آنکھیں کھول کے دیکھا پھر بولے "تم پریشان مت ہو للّی بیٹا فی الحال مرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا ابھی سمرہ مجھ سے بالکل ہی تو جدا نہیں ہوئی نا، میں روشن سے اپنی بیٹی مانگ لوں گا اس کی محبتیں مانگ لوں گا للّی میں اپنی بیٹی کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔" للّی نے پاپا کی جذباتیت دیکھی تو ان کے ساتھ ہاں میں ہاں ملانے لگی پھر وہ پاپا کو ٹیبلٹ کھلا کر باہر نکلی تو ملازم سے پتا چلا سمرہ باہر گئی ہے اس نے دروازے پر رک کر پھر سے پاپا کو دیکھا پاپا سوتے میں بھی سسک رہے تھے۔

کس قدر کٹھور ہو رہی تھی سمرہ مگر جو محبت شدت سے کرتے ہیں اگر ان میں ٹوٹ پھوٹ ہو تو وہ دنیا اور محبت سے متنفر بھی تو اسی طرح سے ہو جاتے ہیں جیسے آج سمرہ خود، مگر ابھی ایک شک کا در کھلا تھا جب کہ سمرہ کا ردعمل تو یقین والا تھا۔ للّی نے سوچنے اور درد سے پھٹتے دماغ کو دونوں انگلیوں سے دبایا پھر نصیر سے چائے کا کہہ کر وہ باہر برآمدے میں آ بیٹھی باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن اس میں اپنے انکل کا دکھ جل رہا تھا اس لیے اس کا رواں رواں تپ رہا تھا اس آتشیں جانکاہ میں۔

"یہ لیجیے بی بی جی چائے۔" نصیر بابا نے چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں تھما دیا تو اس نے غور سے ان کی طرف دیکھا پھر بولی۔

"آپ یہاں کے سب سے پرانے ملازم ہیں نصیر بابا انکل آپ پر کتنا اعتبار کرتے ہیں؟"

"صاحب بہت اعتبار کرتے ہیں جی مجھ پر، میں نے بھی کبھی ان کے اعتبار کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔"

"اچھا پھر یہ بتائیں سمرہ بی بی نے آج کل میں کوئی غیر معمولی کام تو نہیں کیا تھا۔" نصیر بابا پریشان ہو گئے للّی

نے مزید کریدا تو وہ گھبرا گئے۔

"مجھے صاحب کا سختی سے حکم تھا جی کہ میں ان کے آرٹ اسٹوڈیو کی چابی کسی کو نہ دوں مگر چھوٹی بی بی بضد تھیں ایک ہفتہ پہلے انہوں نے ضد کر کے مجھ سے اسٹوڈیو کی چابی لے لی کہنے لگیں کسی کو بھی نہیں بتائیں گی مگر آپ کو کیسے پتا چل گیا جی۔"

"بس یونہی خیال آ گیا تھا آپ کی طرح میں بھی تو پرانی ہوں نا اس گھر میں، اچھا سنیں ذرا مجھے چابی دیں گے آرٹ اسٹوڈیو کی یقین کریں میں انکل سے بالکل نہیں کہوں گی کہ آپ نے سرہ کو چابی دی تھی۔" اس نے معصومیت سے ہلکی سی دھمکی بھی دے ڈالی نصیر بابا بوڑھے آدمی تھے بوکھلا گئے تیزی سے اندر گئے واپس لوٹے تو چابیوں کا پورا گچھا ان کے ہاتھ میں تھا۔

"یہ گولڈن والی چابی ہے صاحب کے آرٹ روم کی۔"

للی چابی لے کر آگے بڑھ گئی پھر کمرے کا دروازہ کھولا تو جا بجا تصویریں دیواروں پر لگی ہوئی تھیں دیواروں سے ایک مخصوص فاصلے پر پردے لگے ہوئے تھے۔

اس وقت ان کا ماضی بنا کسی رکاوٹ کے اس کے سامنے تھا بے اختیار اس نے ایک پردہ سرکایا سامنے گرین ماربل میں بڑا سا مجسمہ آویزاں تھا ہاتھوں میں گلاب کا گلدستہ لیے روشن گوہر جیسے مجسم کھڑی تھیں للی دھیرے، دھیرے سب پردے ہٹاتی چلی گئی کہیں قد آدم تصویر تھی کہیں روشن گوہر سنگی مجسمے میں ڈھلے اس کے انکل کی تنہا محبت سمیٹ رہی تھیں مگر انکل کو اتنی محبت کے بعد بھی کیا ملا آخر...... سسکی للی کے اندر دم توڑ گئی۔

وہ ایک سائیڈ پر رکھے اسٹیریو کی جانب بڑھ گئی بے شمار کیسٹ رکھے تھے اور ہر کیسٹ پر روشن گوہر تحریر تھا پاپا نے ان کے خدوخال ہی نہیں آواز بھی محفوظ کر رکھی تھی۔

"یہ انکل کیا ہیں؟" وہ بڑبڑائی کیسٹ لگا کر سننے لگی اور وہ کچھ سنتی گئی جو پاپا نے اسے نہیں بتایا تھا مگر ان کی کیسٹوں میں محفوظ تھا اس کی آنکھوں میں اپنے انکل کی رائیگانی پر آنسو بھر آئے وہ سر جھکائے آنسو بہاتی رہی پھر اٹھی تو کمرے سے باہر آتے ہوئے اس کی آنکھ ہی نہیں اس کی روح بھی آنسوؤں سے نم تھی ان آنسوؤں سے جو اس نے نہیں بہائے تھے مگر اس کمرے میں پھر بھی کسی دل نے چپ چاپ لٹا دیے تھے۔

"یہ محبت واقعی جنون ہوتی ہے، کبھی چین سے سانس نہیں لینے دیتی ہمیشہ مسافت میں بوجھل رکھتی ہے۔" وہ چابیاں نصیر بابا کو واپس کر کے پاپا کے کمرے میں لوٹی تو دیکھا پاپا پہلے کی سی پوزیشن میں لیٹے تھے اور قریب بیٹھی سرہ ان کا ہاتھ تھامے بری طرح سے رو رہی تھی۔

"سرہ۔" اس نے کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا تو وہ اور بری طرح سے بلکنے لگی۔

"میں بہت بری ہوں نا للی میں نے اپنے پاپا کو آج کتنا دکھ دیا نا، پاپا نے تو ہر ہر قدم پر میرے راستے سے کانٹے چنے مگر میں نے ان کے ساتھ کس قدر برا کیا، آج کس قدر ڈس ہارٹ ہوئے ہیں وہ صرف میری وجہ سے، للی میں واقعی پاپا کی محبت کے قابل ہی نہیں تھی، حیثیت سے بڑھ کر مل جائے تو بندہ ایسے ہی اپنے ذات کے فخر میں مبتلا ہو جاتا ہے جیسے میں۔" کہتے کہتے وہ لمحہ بھر کو چپ ہوئی تو للی نے اس سے اسٹوڈیو کے متعلق پوچھا اور اس نے بے قراری

سے آنکھیں رگڑ ڈالیں پھر مزید بولی۔

”تم ٹھیک سمجھتی ہو للی، میں واقعی پاپا کی زندگی کے اس تلخ سچ کو پا گئی ہوں پاپا نے پہلی بار کسی بات سے جانتے بوجھتے انکار کیا ہے اگر پاپا کہہ دیتے سمرہ روشن گوہر تمہاری ماں ہیں تو میں کچھ بھی نہ کہتی میں چپ چاپ پاپا کو دیکھے جاتی شاید ایک بار اپنی ماما سے ملنے جاتی اس لیے کہ مجھے پاپا کے علاوہ کوئی اور کبھی خوش رکھ ہی نہیں سکتا، پاپا مجھے جانتے ہیں للی وہ میری آنکھوں سے میری منشا جان لیتے ہیں، میرے پاپا میں اتنی طاقت ہے کہ وہ زبردستی میرا دل اپنی طرف موڑے رکھنے۔

ماں اولاد کی سب سے بڑی ضرورت ہے مگر میں پاپا کی محبت میں اس احتیاج سے بھی منہ موڑ لیتی اگر پاپا مجھے سچ کہہ دیتے للی لیکن پاپا کے اس طرح جھوٹ کہنے سے پتا نہیں میرا دل کیوں اور زیادہ اپنی ماما کے لیے ہمکنے لگا ہے۔ مجھے کیوں یہ لگنے لگا ہے کہ پاپا نے شاید کوئی زیادتی کی ضرور تھی جسے آج چھپانے کے لیے وہ ماما کے وجود سے مکر گئے۔ پاپا کے دل میں کوئی چور تھا جو وہ ساری عمر خوف میں رہے کہ ماما کہیں مجھے ان سے چھین نہ لیں مگر میری ماما کو دیکھو کس قدر صبر اور حوصلہ ہے ان میں، کہ وہ اپنی ممتا پر صبر کر سل رکھے خاموشی سے جئے چلی جا رہی ہیں، میں جب چھوٹی تھی اور ان سے ملنے کے لیے اسکول کے باہر ان کا انتظار کیا کرتی تھی۔

جب میرا ذہن ناپختہ تھا، اگر میری ماما خطا کار ہوتی تو وہ اس لمحے بہت آسانی سے میرا دل پاپا کی طرف سے برا کر کے اپنی طرف پھیر سکتی تھیں مجھے ایک ذرا بیٹی کہہ کر اپنے بارے میں بتا دیتیں تو، تو شاید پاپا ساری زندگی مجھے پکارتے رہتے مگر میں دل سے ماما کی ہی طرف مڑی رہتی پاپا نے ساری زندگی مجھ سے محبت کرنے میں لٹا دی مگر میں سوچتی ہوں ماما کیسی ہوں گی جنہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ مجھے چھوڑے بنا گزار دیا، اور شکوہ زبان پر نہیں لائیں۔

اگر ان کا جرم یہ تھا کہ وہ گاؤں کی فضا کو بیٹی اور شوہر کی محبت پر غالب رکھنا چاہتی تھیں وہ چاہتی تھیں پاپا شہر سے غریب ہو کر پہلے انہیں بلا شرکت غیرے مل جائیں تو للی میری ماما نے اپنی اس خواہش اس جرم کی سود سمیت سزا بھگت لی ہے۔ مگر پاپا انہوں نے کیا دیا کچھ نہیں۔

اس کی آنکھیں جو لمحہ بھر پہلے بھیگی شام ہو رہی تھیں شعلہ بن کر جل اٹھیں، للی کو اس پر رحم آرہا تھا وہ عجیب کیفیت میں لٹک رہی تھی آدھی آدھی بٹی ہوئی تھی کبھی وہ پاپا کے دکھ میں بلک رہی تھی کبھی اس کے اندر کی حساس لڑکی اپنی ماں کے غم میں پاگل ہوئی جا رہی تھی بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں آ کر ختم ہو رہی تھی اس لیے للی اسے سمجھانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ یک دم وہ پاپا کے بیڈ کے پاس سے اٹھ کھڑی ہوئی پھر بولی۔

”للی پاپا اب تمام عمر مجھے پا کر بھی پا نہیں سکیں گے کیونکہ میرے دل میں میری ماں کا چہرہ پاپا سے بھی زیادہ واضح ہے۔“

”تم...... آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو، تم کیا سوچ رہی ہو سمرہ۔“ للی اس کے لایعنی جملے سے گھبرا کر خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور وہ استہزائیہ ہنسی، پھر مڑی۔

”میں بزدل ہوں للی اس لیے بے فکر رہو خودکشی نہیں کروں گی بلکہ میں خود کو زندہ رکھ کر انہیں اذیت دینا چاہتی ہوں، کیوں کہ میں جانتی ہوں پاپا مجھے دل کہتے ہیں پھر اگر میں مر گئی تو پاپا تو ایک جھٹکے سے ہر دکھ سے نجات پا جائیں

گے جب کہ میں انہیں اتنی تو اذیت دینا ہی چاہتی ہوں کہ میرے دل کو قرار آ جائے۔"

للی نے بے یقینی سے اسے دیکھا ابھی ذرا دیر پہلے وہ اپنے پاپا کے لیے کیسی رو رہی تھی اور اب......

"تم ٹھیک نہیں ہو سمرہ اس لیے کوئی ڈھنگ کی بات تمہیں نہیں سوجھ رہی تم کچھ دن کے لیے گھر چلو یقین کرو ایک ہفتے بعد تم جب لوٹو گی تو تمہارا دماغ بہت ہلکا پھلکا ہوگا۔" اس نے سنا مگر جواب میں کچھ نہ بولی للی زبردستی اسے اس کے کمرے میں لے گئی پھر اسے سلا کر وہ واپس پاپا کے کمرے میں آئی پاپا نے ہلکی سی کروٹ بدلی تھی۔ چہرے پر دکھ ملال سوتے میں بھی بری طرح بکھرے چلے جا رہے تھے للی کا دل رکنے لگا ان کے دکھی چہرے کو دیکھ کر وہ وہیں بیٹھ گئی پاپا کو فون کر کے وہ پہلے ہی سمرہ کے ہاں رکنے کا کہہ چکی تھی اس لیے مطمئن تھی۔

پھر صبح وہ سو رہی تھی، جب اچانک۔ اس کے شیگی کٹ بالوں کو کسی نے شفقت سے چہرے سے ہٹائے ہڑبڑا کر اس نے آنکھیں کھولیں۔ سامنے پاپا کافی کا کپ لیے کھڑے تھے۔

"ارے انکل آپ، آپ کو تو آرام کرنا چاہیے تھا۔" وہ مکمل طور پر بیدار ہو گئی تھی پاپا کے چہرے پر اضمحلال اور دکھ ابھی تک بکھرا ہوا تھا مگر ان کے لہجے میں کل والی بے بسی نہیں تھی یا پھر پاپا نے محض اس کے لیے خود کو سنبھالا تھا بہرحال بات کچھ بھی رہی ہو للی کو اطمینان قلب کی دولت مل گئی تھی سو اس نے مطمئن انداز میں سمرہ اور پاپا کے ساتھ ناشتہ کیا سمرہ بالکل خاموش تھی پاپا کو وہ سرسری انداز میں بھی نہیں دیکھ رہی تھی پاپا کو یہ بات دل پر زخم لگاتی محسوس ہو رہی تھی للی پاپا کی کیفیت چہرے سے بھانپ رہی تھی اس لیے دھیان بٹانے کو شوخی سے بولی۔

"انکل میں نے سوچا ہے سمرہ کو کچھ دنوں کے لیے اپنے ہاں لے جاؤں آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔" پاپا نے بے بسی سے اسے دیکھا پھر مزید سوال کیے بغیر اجازت دے دی اور للی کو ان کی آنکھ کی وہ نمی دل بھگوتی محسوس ہوئی کیونکہ جو آنسو پلکوں تک نہ آئیں۔

وہ زیادہ دکھ دینے والے ہوتے ہیں اس لیے للی نے مزید کچھ نہ کہا تیزی سے سمرہ کے کپڑے منی سوٹ کیس میں رکھنے لگی، سمرہ گم سم سی بیڈ پر بیٹھی تھی، اس کے اندر ایک جنگ چھڑی ہوئی تھی کبھی دل پاپا کے لیے پریشان ہوتا، اور کبھی تمام واقعہ میں پاپا کو مجرم ٹھہرا دیتا، کہیں پاپا قریب سے پکارتے رہتے اور وہ پلٹ کے دیکھتی بھی نہیں ماما کی طرف بڑھ گئی، وہ تھک گئی تھی اس جنگ سے اس لیے وہ خود بھی کچھ دنوں کے لیے پاپا سے کہیں دور چلی جانا چاہتی تھی تاکہ کوئی فیصلہ کر پائی۔

"کیا سوچنے لگیں سمرہ۔" للی نے سوٹ کیس اس کے قدموں میں لا رکھا اور بالکل غیر متوقع بالکل غیر شعوری طور پر اس کی زبان سے نکلا۔

"میرے بعد پاپا کی دیکھ بھال کون کرے گا للی؟" للی نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا اور وہ پھر لوٹ کر رونے لگی۔

"میں بہت بری ہوں نا للی میں اپنے پاپا کو دکھ دے رہی ہوں نا لیکن للی پاپا نے بھی کتنا بڑا فاؤل کیا ہے نا مجھ سے میری ماما کو چھڑا لیا کیا ہوتا جو پاپا شہر چھوڑ کر کہیں گاؤں ہی میں بہت ساری زمینیں خرید لیتے فارم بنوا لیتے انہیں دولت امارت کی طلب تھی تو وہ گاؤں میں دولت کے بل پر کوئی جاگیر بنوا لیتے میری ماما کو یوں تو سزا نہ دیتے۔" سمرہ

کہتے کہتے رکی تو للی نے پریشان ہو کر سامنے دیکھا پاپا دروازے کی دہلیز پر جمے کھڑے تھے۔

''ہم چلیں انکل۔'' للی نے سوٹ کیس اٹھا لیا پاپا نے نظر سمرہ پر ہی ٹکائے رکھی پھر بدقت اثبات میں سر ہی ہلا سکے مگر پھر جب سمرہ للی کی طرح ہی خدا حافظ کہہ کر جانے لگی تو ان میں ابال آ گیا ان کا ضبط جواب دے انہوں نے اس کی ناراضگی بھلا کر اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ پھر بھرائے لہجے میں بولے۔

''تمہارے دل میں اب میں شاید کہیں نہیں ہوں مگر مائی چائلڈ تمہارا پاپا ہمیشہ تمہارا منتظر رہے گا، تمہیں پا کے لیے کچھ بھی کر ڈالے گا کسی کے سامنے بھی جھک جائے گا۔''

للی کا دل ان کے لہجے پر لرزا سمرہ نے بھی بے قراری سے دیکھا مگر پاپا تیزی سے آگے بڑھ گئے ان شاید سمرہ کی عارضی جدائی دیکھنے کی بھی ہمت نہیں تھی اس لیے وہ منظر سے ہٹ گئے تھے سو للی کی کار میں بیٹھ کر انجانے سفر اور فیصلوں کی طرف بڑھتی چلی گئی یقین کو ٹھوکر مار کر گماں کو پانے کے لیے۔

یہ سراسر جنوں تھا مگر محبت خرد کا نام بھی تو نہیں تھا۔

☆

''مجھے لگتا ہے حسن میں واقعی للی سے محبت کرنے لگا ہوں۔'' حسن عمار نے سنا تو اس نے زبردست قہ لگایا۔ وہ آج صبح ہی صبح ہیثم ولی کے کہنے پر اس کے ہمراہ بیچ پر چلا آیا۔ ہیثم بہت دیر سے خاموش تھا حسن عمار نے اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا تھا مگر اتنی طویل خاموشی کے بعد ہیثم ولی کے سینے سے راز بھی نکلا تو کتنا مگر جانے وا سا، ہیثم کی کالج لائف اور اس کے بعد یونیورسٹی لائف حسن عمار کے سامنے تھی اسے تو اٹھتے بیٹھتے ہر لڑکی سے پہلی نظ والا عشق ہو جاتا تھا مگر حسن عمار نے دیکھا تھا کہ وہ جتنی دیوانگی سے کسی کی محبت میں مبتلا ہوتا تھا اتنے ہی سرعت میں عشق کا باب بند کر دیتا تھا۔ وہ ہیثم ولی کو وہ چلتا پھرتا محبت کا البم کہتا تھا جس میں حسینوں کی تصاویر صرف آنکھ سیراب کرنے کے لیے وہ ہمیشہ ہی توجہ اور انہماک سے لگایا کرتا اور ایسے میں حسن عمار کو وہ شعر یاد آ جاتا۔

کتاب زیست کے اوراق پلٹ کے دیکھ ذرا
نہ جانے کون سا صفحہ مڑا ہوا نکلے

ہیثم تو شاعری میں کمزور تھا مگر حسن عمار...... اسے یہ شعر خاص طور پر سمجھانے کی کوشش کرتا اور پھر کہتا۔

''جس شاعر کا یہ شعر ہے اگر وہ تجھ سے مل لیتا ناں تو تمام عمر شرمندگی سے آنکھ نہ اٹھا سکتا، تیرے سامنے تو صرف ایک صفحے کی بات کرتا ہے مگر ہیثم ولی تیری زندگی کا تو ہر صفحہ کسی نہ کسی لیلیٰ کے لیے مڑا ہوا ہر غزل تازہ سچا، شٹ یار چھوڑ یہ چکر انسان بن انسان۔'' اور ہیثم ولی ہنسنے لگتا پتا نہیں دکھ سے یا لڑکیوں کی بے وقوفی پر۔

لیکن آج کچھ مختلف سی بات تھی تب ہی اس کی ضد زیادہ دیر تک قائم نہیں رہی ہیثم ولی آج اور دونوں بہت مختلف انداز میں اس کے سامنے تھا ہمیشہ اسے تاویلیں مثالیں دے دے کر ثابت کرتا کہ یہ عشق سچا ہے مگر آج صرف ایک جملے کے بعد خاموش کھڑا تھا مگر عشق اس کی آنکھ اس کے ہر موئے تن سے پکار رہا تھا۔

''میں ہوں مجھے مان لو میں سچا ہوں۔'' حسن عمار جانے کتنی ہی دیر تک دیکھتا رہا پھر اس نے زبردستی ایک پتھر پر بٹھایا اور آہستگی سے بولا۔

’’کیا للی واقعی تیرا آخری عشق ہے۔‘‘ ہیشم ولی نے نہ ہی حامی بھری اور نہ انکار کیا مگر تمام وجود اثبات میں ملنے لگا ’’للی ظفر‘‘ یہی صدا پورے جسم میں تال پر پائل کی طرح جھنجھنا رہی تھی۔ اور حسن اتنا پاگل نہیں تھا کہ اس صدا کو سن نہ پاتا۔

’’للی سے تم نے بات کی وہ کیا کہتی ہے؟‘‘ ہیشم نے پہلی بار اسے نگاہ اٹھا کر دیکھا پھر آہستگی سے بولا۔

’’للی اور میرے راستے ایک ہی تھے حسن ہمیں اس جہان میں ملنا ہی تھا آج نہ ملتے کل زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ضرور ٹکراتے وہ کل اگر ہماری زندگیوں میں لکھی نہ ہوتی تو ہم کسی اور جہان میں ایک دوسرے سے ضرور آشنا ہوتے کیوں کہ ہم تھے ہی ایک دوسرے کے لیے ہمیں ایک دوسرے کا ہی انتظار تھا۔‘‘

’’پھر انتظار اب تو ختم ہو گیا نا مسئلہ کیا ہے یہ بتاؤ۔‘‘ حسن عمار مطمئن ہو گیا اور ہیشم ولی اسے دیکھنے لگا پھر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ یکدم دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنا سر تھام لیا حسن عمار گھبرا گیا۔

’’ہیشم کیا ہوا؟‘‘

’’کوئی خاص بات نہیں، بس مجھے گھر ڈراپ کر دو مسئلہ پھر کبھی بتاؤں گا۔‘‘

’’اچھا اچھا تو اپنے آپ کو سنبھال مسئلہ گیا بھاڑ میں۔‘‘ حسن عمار نے اسے سہارا دیا وہ اس کے برابر بیٹھ گیا پھر راستے میں حسن عمار نے کہا بھی کسی کلینک میں چلتے ہیں مگر وہ ٹال گیا۔

’’کچھ نہیں ہوا مجھے معمولی سا چکر آ گیا تھا آج کل گرمی بھی تو بلا کی ہے نا۔‘‘ راستہ جس طرح سمٹ رہا تھا اس کی تکلیف بھی اسی طرح دور ہو رہی تھی اس لیے اس کا لہجہ پہلے سے زیادہ جاندار تھا حسن عمار کو مطمئن تو نہیں تھا مگر جب وہ کار سے اتر کر پہلے سے فریش انداز میں اس سے بغل گیر ہو گیا تو لحہ بھر کو اسے اپنی پریشانی کم محسوس ہوئی ہیشم نے چائے پینے کی آفر کی تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ نیچے اترا ہیشم ولی اس کے برابر چل رہا تھا اس سے باتیں کرتا ہوا کہ اچانک اس نے پورچ کی سیڑھی سے ٹھوکر کھائی۔

’’ہیشم کیا ہوا تمہیں ہیشم؟‘‘ اس نے بے قراری سے اسے جھنجھوڑ دیا پھر ذرا سی دیر میں شور مچ گیا حسن عمار اسے ہاسپٹل لے جانا چاہتا تھا مگر ممی کا خیال تھا یہ معمولی سن اسٹروک ہے اس لیے انہوں نے اپنے فیملی ڈاکٹر کو بلا لیا حسن عمار بے قراری سے ہیشم ولی کے بیڈ کے دائیں بائیں ہی چکرا رہا تھا اسے ہیشم کی یہ بے ہوشی خطرناک لگ رہی تھی لیکن یہاں سب مطمئن تھے سو وہ بھی ایک طرف بیٹھ گیا ڈاکٹر نے اس کا مکمل چیک اپ کر لیا تو جواد بھائی نے پوچھا۔

’’کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔‘‘ ڈاکٹر فاروق نے نفی میں سر ہلا دیا پھر بولے۔

’’بیگم ولی ٹھیک کہہ رہی تھیں یہ صرف سن اسٹروک ہے مگر پھر بھی پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے ہیشم ولی کا سارا سسٹم ٹھیک چل رہا ہے۔‘‘

’’مگر ڈاکٹر صاحب پچھلے دنوں سے اسے کچھ زیادہ ہی یہ شکایت نہیں رہنے لگی۔‘‘ جنید بھائی نے کہا تو حسن عمار نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور ڈاکٹر نے بے نیازی سے کہا۔

’’ہوتا ہے بعض اوقات دماغ کے خلیے کچھ کمزور پڑ جائیں تو ایسی صورت بھی پیش آ جاتی ہے جب کہ اپنے ہیشم میاں تو ویسے ہی کچھ بچپن سے بیمار چلے آ رہے ہیں کمزور ہیں اندرونی طور پر یہی بات ہے کہ تکلیف برداشت

نہیں کرتے اور بے ہوش ہو جاتے ہیں اچھی غذا اور دوا کھائیں تو یہ تکلیف رفع ہو سکتی ہے۔" ڈاکٹر فاروقی جھکے جھکے نسخہ لکھنے لگے اور حسن عمار بہ چشم ولی کو ہی تکتا رہا۔

"انہیں آرام کرنے دیں ویسے کوئی اور بات ہو تو کانٹیکٹ کر لیجیے گا۔" میڈیکل باکس لے کر وہ باہر نکل گئے جواد بھائی ان کے ہمراہ تھے جب کہ جنید بھائی ستارہ حسن عمار اور ممی کمرے ہی میں رک گئے تھے۔

للی اگرچہ سمرہ کو گھر تو لے آئی تھی لیکن اس کا دل اپنے انکل ہی میں اٹکا ہوا تھا آج کل وہ آرٹ کلب بھی نہیں جا رہی تھی۔ بس ہر وقت سمرہ کے گرد رہتی محبت پر اسے لیکچر دیتی اور سمرہ یک ٹک اسے دیکھے جاتی یہی لڑکی تھی پہلے جو ہر وقت محبت سے الرجک رہتی تھی مگر اب یہی ہے کہ محبت کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہے ایک میں تھی محبت کو سب کچھ ماننے والی مگر اب محبت میرے لیے کتنا بڑا لاینحل مسئلہ بن گئی ہے یا پھر شاید محبت تو اب بھی اتنی ہی واضح ہے مگر مجھ سے، لکھنے کی صلاحیت چھن گئی ہے۔

"سوچا مت کرو سمرہ لکھا کرو اپنے دل کے نام خط لکھو، دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا لو یہ کتاب پڑھو۔" اس نے کتاب اس کے سامنے ڈال دی سمرہ پڑھنا نہیں چاہتی تھی مگر پھر بھی پڑھنے لگی لکھا تھا۔

"خط ادھورے ہیں جو میں نے محبت کے نام لکھے محبت اور دکھ ایسی ہستیاں ہیں ایسی کائناتیں ہیں جن کے بارے میں جتنا سمیٹ لیں جتنا حاصل کر لیں ادھورا ہی ہوگا سو ان میں سے کچھ خط ایسے ہیں جو میں نے سب کو لکھے اور کچھ ایسے بھی ہیں جو کسی کو بھی نہیں لکھے اپنے آپ کو بھی نہیں لیکن لکھے ہیں، کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے ہم ہمارے دل، ہماری روحیں، ہمارے رشتے ناتے ہماری خوشیاں ہمارے غم ہمارے خواب و خیال اور خواہشیں سب خطوط ہیں وقت اور تقدیر کے لکھے ہوئے ہمارے نام ہم سب کے نام جن میں ہمارا اپنا اپنا جیون دفن ہے، ہماری ناراضگیاں اور رنجشیں، ہمارا ملنا، ہمارا بچھڑنا، ایک دوسرے کے نام لکھے ہوئے ایسے خطوط ہیں جو کچھ پوسٹ ہو گئے کچھ رہ گئے۔

سمرہ نے پیراگراف پڑھ کر دوبارہ سے للی کی طرف دیکھا تو وہ اس کی ہمت بندھانے لگی۔

"جس طرح کہہ دینے سے دکھ کم ہو جاتا ہے اس طرح اپنے آپ کو ایسے خط لکھ دینے سے روح کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا سمرہ تم لکھو پوسٹ کرو لکھو پھر پوسٹ کروا اپنے نام اپنے ہی خط، کبھی نہ کبھی تو تصدیق کی مہر والا لفافہ تم لوٹے گا ہو سکتا ہے تم نے جو سوچا، جو سمجھا ہو وہ ایک فیصد بھی درست نہ ہو مگر تم لکھو وہی جو تم درست سمجھتی ہو، پہلی سطر لایعنی، دوسری بامعنی اور تیسری یقین بن جائے گی تم سمجھ رہی ہو سمرہ میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں۔" سمرہ نے اثبات میں سر ہلایا، للی اٹھ کر کینوس کی طرف متوجہ ہو گئی

اور وہ کاغذ پر اپنے پاپا اور ماما کا جرم لکھنے بیٹھ گئی، لکھتی چلی گئی تھکن سے انگلیاں دکھ رہی تھیں مگر وہ رکنا نہیں چاہتی تھی۔ اسی دوران اس کے کمرے کا فون بج اٹھا۔

"ہیلو......" للی نے ریسیور اٹھایا پھر جو کچھ سنا وہ چلا پڑی۔

"تو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" سمرہ کی جان آنکھوں میں کھنچ آئی اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا وہ پاپا سے خفا تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ بالکل ہی پتھر بن جاتی کچھ بھی تھے وہ تھے تو اس کے پاپا مضبوط سائبان تحفظ اس کا مان بھرم۔

"سمرہ...... سمرہ" للی روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی تو سوچتے دماغ سمیت سمرہ کا سانس سینے میں اٹک

گاڑی چلا دی۔

"کیا ہوا میرے پاپا کو لتی بتاؤ مجھے۔" لتی چند لمحے ساکت اسے دیکھتی رہی پھر اس کی بات سمجھ میں آئی بولی۔

"پاپا ٹھیک ہیں مگر ہیشم"

"ہیشم...... کیا ہوا ہیشم بھائی کو۔" پاپا کی طرف سے اطمینان ہوا دل قابو میں آیا تو اس نے نیا سوال کیا لتی نے لاعلمی سے دیکھا پھر بولی۔

"حسن عمار کہہ رہا تھا ہیشم کو سن اسٹروک ہوا ہے مگر سمرہ مجھے اس کے لہجے میں پریشانی محسوس ہوئی پتا نہیں اب حقیقت کیا ہے تم چل رہی ہونا میرے ساتھ۔"

سمرہ نے اثبات میں سر ہلایا کاغذات کو وہ پیپر ویٹ کے نیچے دبا کر خود بھی شوز پہننے لگی۔

پھر دوپہر کا وقت تھا وہ ہیشم ولی کی کوٹھی پہنچیں ہیشم اس وقت آرام کر رہا تھا مگر حسن عمار کو لتی پر رحم آ گیا اس نے اسے ملنے کی اجازت دے دی لتی سمرہ کا ہاتھ تھام کر اندر داخل ہو گئی پھر اس کے قدموں کی مخصوص چاپ فرش پر گونجی ہی تھی کہ ہیشم ولی نے بے ساختہ آنکھیں کھول دیں۔

"آپ۔" اس نے حیرت سے دیکھا۔

"کیوں کیا مجھے آپ سے ملنے نہیں آنا چاہیے تھا۔" لتی نے اس کی حیرت کو دوسرا رنگ پہنا کر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ دلربائی سے ہنسا پھر بولا۔

"کیوں نہیں آسکتیں آپ ہی تو ہیں جس کا میں انتظار برسوں کر سکتا ہوں آپ ملنے نہیں آتیں ناں تو بائی گاڈ میں دوبارہ آنکھیں بھی نہیں کھولتا آپ کے آنے کی خوشی ہی تھی جو مجھے اس بے ہوشی سے بھی نکال لائی سچ یہ تو آپ کی خوشبو کی مسیحائی ہے جو میں پھر سے جی اٹھا۔" لتی نے سنا تو شرما سی گئی اور سمرہ نے مسکراتے ہوئے گلدان میں سے گلاب کی کلی اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"افراتفری اور گھبراہٹ میں یاد نہیں رہا مگر پکا وعدہ آپ کے لیے کل ضرور بڑا والا بکے لاؤں گی فی الحال اس سے کام چلایئے۔" ہیشم نے سنا تو ہنس کے کہا۔

"کوئی بات نہیں سسٹر آج نہیں تو پھر کسی دن بیمار پڑا ناتو بڑا سا بکے میری بیماری خود وصول کرلے گی۔" لتی نے اس کی بات پر اسے گھورا تو وہ سوری کرنے لگا۔

"ہوا کیا تھا آپ کو ڈاکٹر کیا بتاتے ہیں۔"

"پتا نہیں مجھے تو ہوش ہی ابھی آیا ہے ویسے ڈاکٹر بتائیں یا نہ بتائیں مجھے اس کا تو یقین ہے کہ یہ تمہارا رعب حسن ہی تھا جس نے مجھے بے ہوش کر دیا ویسے غالب ہوتے تو ان کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہ ہوتی۔"

"بس بس آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔"

"لیکن لتی کل ضرور آنا مجھے تمہارا انتظار رہے گا۔"

"اچھا لیکن سنیے آپ مجھے کل بالکل ٹھیک ملنے چاہئیں کیوں کہ بیمار لوگ مجھے قطعاً اچھے نہیں لگتے۔"

"اچھا یہ بات ہے پھر کل آنا دیکھنا ایک دم فٹ فاٹ ملوں گا تمہیں۔" وہ وعدہ کرنے لگا، ستارہ لتی کا

ہاتھ تھام کر بولی۔

"ہیثم بھائی کچھ نازک مزاج اور اپنی بات کے پکے ہیں آپ انہیں ضدی بھی کہہ سکتی ہیں اس لیے اگر وعدہ کر رہی ہیں تو کل ضرور آیئے گا ورنہ یہ آسمان سر پہ اٹھا لیں گے اور غصے میں کوئی انہیں سنبھال نہیں سکتا اسے بھی نوٹ کرلیں۔"

"اچھا سارا کچھ آج ہی نوٹ کراؤ گی کیا......؟" للی نے ہنس کر کہا تو وہ مسکرا دی پھر بولی۔

"روزانہ آتی رہیے تھوڑا تھوڑا بھائی کی ہر پسند و ناپسند سے آگاہ کر دوں گی۔" ہیثم پزل ہونے لگا للی کے سامنے اس طرح ظاہر ہونے پر تو للی ہنستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلتی ہوں پھر۔"

"جایئے میں روکوں گا نہیں لیکن کل ضرور آیئے گا۔" آنے کا وعدہ کر کے للی خدا حافظ کہہ کر کمرے سے سمرہ سمیت باہر نکل آئی۔

دونوں گھر میں داخل ہوئیں تو پاپا ان کے کمرے میں موجود تھے اور سمرہ کے وہی پیپر پڑھ رہے تھے جو اس نے پچھلے گھنٹوں میں عجیب بے ربط سے لکھے تھے۔

"ارے انکل آپ......آپ کب آئے۔"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے شریف نے کہا تم دونوں باہر گئی ہو کہاں قصد تھا۔" پاپا نے سمرہ کی طرف دیکھے بنا کاغذ واپس پیپر ویٹ کے نیچے دبا دیئے اور للی پاپا کو ہیثم ولی کے متعلق بتانے لگی۔

"اچھا...... مجھے اس سے ملنا چاہیے ٹھیک ہے پھر ملیں گے اب میں چلوں گا للی بائے سمرہ۔" پاپا نے چلتے چلتے اس کی پیشانی پر بوسہ لیا سمرہ نے بے قراری سے پاپا کی طرف دیکھا مگر وہ آگے بڑھتے چلے گئے مگر اس وقت ان کی چال میں بے بسی، تھکن نہیں تھی بلکہ ہلکی ہلکی امید ہلکورے لے رہی تھی شاید سمرہ کا یہ ادھورا خط پاپا کو پوری خوشی بخش گیا تھا مگر یہ سمرہ کے دل کا پورا سچ تو نہیں تھا اسے یقین تھا کہ جب پورا سچ پاپا کی آنکھیں پڑھیں گی تو ضرور بھیگیں گی آج کل اسے آنسوؤں سے کچھ انسیت سی ہو رہی تھی اس لیے وہ چاہے اس کی آنکھ کے ڈولتے آنسو ہوتے یا کسی اور کی آنکھ کے، اسے خوشی ملتی تھی۔

اس روٹین کو دو تین دن گزر گئے سمرہ سارا دن گھر میں اپنے نام خط لکھتی رہتی اور للی کبھی پاپا کے پاس ہوتی کبھی ہیثم ولی کو دیکھنے کوٹھی چلی جاتی لوٹتی تھکی ہوئی ہونے کے باوجود سمرہ کے ساتھ خوب ہلا گلہ کرتی سمرہ پہ پہلے روز والی قنوطیت کسی قدر ٹوٹ چکی تھی اب وہ نارمل تھی رونا آتا تھا تو روتی بھی تھی لیکن جب بھی للی باتوں باتوں میں پاپا کا ذکر کرتی تو وہ پھر نقطہ ابال پہ پہنچ جاتی۔ "میں نہیں جاؤں گی" کی گردان کرنے لگتی پاپا ہر روز بلکہ دن میں کتنی ہی بار فون کر کے سمرہ کا پوچھتے للی ان سے جھوٹ بولتی رہی۔

"تم جھوٹ کہتی ہو للی کیوں کہ اگر یوں ہوتا تو سمرہ واپس اپنے پاپا کے پاس لوٹ نہ آتی۔" ان کی بات سن کر للی سر سہلانے لگی صفائی دینے کے لیے لفظ ڈھونڈنے لگی

یہاں تک کہ مزید دو دن گزر گئے للی نے سمرہ کی لاپرواہی دیکھی تو بری طرح سے اسے ڈانٹا۔

"تم مان کیوں نہیں لیتیں کہ انکل عمیر ہی تمہاری زندگی کی اساس ہیں روشن آنٹی تمہاری زندگی میں زور آو

فریق نہیں جتنے انکل ہیں۔"

"کیسے کہہ سکتی ہو تم یہ۔" سمرہ نے گھورا تو للی اس کے قریب بیٹھ گئی پھر بولی۔

"میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر میں بھی رہی ہوں مگر تم کبھی اتنی بے چین نہیں رہیں جتنا یہاں آ کر ہو رہی ہو یاد ہے تمہیں میں تمہیں نیند کی ماتی کہا کرتی تھی نو بجے اور تمہیں نیند نے گھیرا مگر یہاں تم ساری ساری رات جاگے ہوئے ملتی ہو، تمہاری نظر میں اس کی کوئی وجہ ہے۔"

"کیوں نہیں سیدھی سی بات ہے نئے ماحول میں نیند جلدی آتی بھی نہیں ہے ہفتوں لگتے ہیں نئے ماحول میں ایڈجسٹ ہونے میں۔" اس نے جواباً یوں کہا جیسے للی کو مطمئن کر دیا مگر للی اتھے سے اکھڑ گئی۔

"تمہیں پتا ہے، انکل کی طرح مجھے جھوٹ سے کس قدر نفرت ہے۔"

"کوئی نئی بات کرو للی ڈیئر پہلے سب یونہی سچے پارسا ہمدرد وہ محبت میں مر جانے والوں کا پوز دیتے رہتے ہیں، تمام عمر انہی نقابوں میں گزر جاتی ہے۔ اس لیے تم مجھ سے ویسے ہی بولو جیسے تم ہو۔"

"یعنی تم مجھے سچا نہیں سمجھتیں۔"

"میں اب کسی کو کچھ بھی نہیں سمجھتی سب انسان ہیں ادھورے انسان تم کہو تم کیا کہہ رہی تھیں۔" اس نے توجہ کھڑکی سے باہر کر دی تو للی نے اس کا کاندھا چھوا۔

"سمرہ بائی گاڈ یہ سچ ہے یار کہ تم انکل کو ہر روز مس کرتی ہو سوتے میں انہیں پکارتی ہو اور......"

"میں تمہاری کوئی بات تسلیم نہیں کرتی۔"

"تم میرے ساتھ واپس چلو انکل تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" سمرہ نے تیکھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا مگر کہا کچھ نہیں پھر تیزی سے سوٹ کیس میں کپڑے رکھنے لگی للی نے ہاتھ تھام کر پوچھا۔

"اتنی رات گئے کہاں جا رہی ہو۔"

"ایک فیصلہ نہیں ہو رہا تھا مگر آج وہ فیصلہ کر لیا میں نے میں ماما کے پاس جا رہی ہوں۔"

"روشن آنٹی کے پاس مگر تمہاری ضرورت انکل کو زیادہ ہے ان کا سب سے زیادہ حق ہے تم پر۔"

سمرہ نے ایکسوت کا گولہ بنا کر سوت اس کی طرف اچھالا پھر چلائی۔

"میں پاپا کی پراپرٹی نہیں ہوں للی جس پر ان کا حق ہے پاپا کا جتنا حق تھا میں نے اتنے عرصے آنکھیں بند کر کے ان کی محبت میں گزار لیا مگر اب سوچتی ہوں میں کتنی غلط تھی، پاپا کے موقف بیان کرنے والے کتنے ہیں مگر ماما کی طرف سے کسی ایک نے بھی ان کی صفائی نہیں دی بلکہ خود ماما نے بھی کچھ نہ کہا سو میں آج ان کے پاس جا رہی ہوں تم پاپا کو کہہ دینا سمرہ نام کی جو ان کی ایک بیٹی تھی وہ ان کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل گئی۔" وہ سوٹ کیس اٹھا کر آگے بڑھی ہی تھی للی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"رکو میں تمہیں خود چھوڑ کر آؤں گی۔" اس کی ذہنی حالت سے گھبرا کر اس نے کی رنگ اٹھایا رات کے ڈھائی بج رہے تھے سڑکوں پر اکا دکا گاڑیاں چل رہی تھیں۔ اس لیے للی بڑے آرام سے روشن گوہر کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گئی سمرہ کار سے اتری تو للی کی نظر بے ساختہ پاپا کی کار پر پڑی۔

وہ سمرہ کو روکنا چاہتی تھی مگر سمرہ اس کیطرف دیکھے بنا آگے بڑھتی چلی گئی تھی اس کے پیچھے لپکی پھر ایک جگہ دونوں کے قدم رک گئے یوں لگا جیسے کوئی داسی دیوتا کی پوجا کر رہی ہو۔

"روشن پلیز میری بات سنو آج کتنے دنوں سے میں تمہیں اسی بات کے لیے کانٹیکٹ کر رہا ہوں مگر ہر بار جواب ملتا ہے کہ بیگم صاحب ابھی لوٹی ہی نہیں۔"

"ہاں دو ہفتے کا ٹور تھا۔ آپ کہیے آپ آج اچانک کیسے چلے آئے۔"

"ہم اچانک ...... تو نہیں ملے تھے روشن ہم تو ایک دوسرے کے بھاگ ایک دوسرے کی تقدیر میں ازل سے لکھے ہوئے تھے مگر جانے کیوں پھر بھی جدائی آ گئی ہمارے بیچ۔" پاپا کہنا کیا چاہتے تھے کہہ کیا رہے تھے سو انہیں جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا تو ادھورے جملے ہی میں چپ ہو گئے پھر بولے۔

"روشن میں نے جن سے عشق کیا یہ ظلم نہیں کہ وہ دونوں ہی میرے نہیں رہے آخر میرا کیا قصور تھا میں تو منصور بھی نہیں ہوں روشن مگر پھر بھی یہ سولی صرف مجھے کیوں پکارتی ہے کاش روشن تم میں محبت کے لیے اتنا جنون نہ ہوتا یہ جنون کسی بھی جگہ ہو برباد کر دیتا ہے۔ اس نے ہمیں بھی برباد کیا لمحاتی ابال نے کہ تمہیں کہیں کا رکھا نہ مجھے ہم دونوں الگ الگ ایک دوسرے کے لیے وحشت کرتے رہے مگر کتنے تنہا تنہا نہ جانے ہم نے زندگی گزاری بھی یا بس یونہی زندگی کے خاکے میں وقت بھرتے رہے روشن تم نے بچھڑتے لمحے کہا تھا نا۔ "میں جا رہی ہوں مگر آپ کی بیٹی اپنے پاس رکھیے ورنہ آپ جئیں گے کیسے۔" تو روشن تم نے میری آنکھوں میں جھانکا ہوتا تو تمہیں اس لمحے یقین ہو جاتا کہ میں اس وقت ہی آدھا مر چکا تھا لیکن اب ...... اب آدھا جو بچا ہوں تو تمہاری یہ بیٹی مجھے مار دینا چاہتی ہے۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں کہ سمرہ آپ سے ......" ان کے لہجے میں پاپا سے بھی زیادہ دکھ تھا اور پاپا خاموش تھے پھر آہستگی سے کتنی ساعتوں بعد بولے۔

"اسے تمہارے اور میرے تعلق کی خبر ہو گئی ہے روشن، جب تم سمرہ کو چھوڑ رہی تھیں تو مجھے نہیں پتا تھا وہ میری کمزوری بن جائے گی مگر جب میں نے اس کی پرورش کی اس کی محبتوں میں بھیگا تو میں نے سوچا اگر کسی دن تم اچانک آ گئیں اسے لینے اس پر حق جتانے تو میں کیسے جیوں گا میں نے اسی خوف سے پچھلا شہر بھی چھوڑ دیا پھر جب پہلی بار میں نے تمہیں سمرہ کے اسکول کے باہر اس کا انتظار کرتے پایا تو شاید زندگی میں، میں پہلی دفعہ تم سے بلند آواز میں ہم کلام ہوا سمرہ میری روح ہے روشن مجھے اس وقت اسی خوف نے اپنے مزاج کے برخلاف بولنے پر مجبور کیا تھا اور آج بھی اگر میں آیا ہوں تو اسی خوف میں، سمرہ مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہے روشن اس میں تم ہو کتنی گئی ہو پیاس بن کر اور وہ مجھے رو کر رہی ہے۔ روشن تم جانتی ہو ناں میں سمرہ کے بنا ایک پل نہیں چل سکتا۔"

"میں جانتی ہوں عمیر اس لیے میرا وعدہ ہے کہ سمرہ اگر مجھ تک آئے گی بھی تو میں اسے تمہاری ہی طرف لوٹا دوں گی جو غلطی بچھڑ کر میں نے تم سے کی میں سمرہ کو وہ غلطی کرنے نہیں دوں گی وہ صرف تمہاری بیٹی ہے عمیر صرف تمہاری۔"

کہتے کہتے آواز مدھم ہو گئی تو سمرہ لُبنیٰ کے روکنے کے باوجود اندر داخل ہو گئی روشن گو ہر پاپا کے قدموں میں بیٹھیں ان کے گھٹنے سے سر لگائے شاید رو رہی تھیں انہوں نے تیزی سے خود کو سنبھالا پاپا نے بے بسی سے سمرہ کو دیکھا تو وہ بولی۔

"آئی ہیٹ یو پاپا آپ کتنے خود غرض ہیں آپ سے، میری ایک خوشی نہیں دیکھی گئی میں آپ کی بیٹی ہوں مگر

آج مجھے اس سچ پر افسوس ہو رہا ہے میں آپ کو بہت بلند بہت اونچا سمجھتی تھی مگر آپ تو بہت مختلف نکلے تمام عمر میں آپ کی محبت میں جلتی رہی، میں نے کبھی ماں کی طلب نہ کی یہ بھی ماں تھیں مگر انہوں نے بھی صبر کی انتہا کر دی کبھی پلٹ کر مجھ پر حق نہیں جتایا مگر پاپا آپ، آپ کس قدر سیلفش ہیں کہ کسی کی عمر بھر کی ریاضت کا خیال کئے بغیر بھولے بھٹکے ملنے والی خوشی بھی چھیننے چلے آئے۔ آپ کو صرف اپنے قدموں میں نظر بچھانے والے لوگ درکار ہیں پاپا محبت نہیں اور مجھے امارت دولت کی خواہش رکھنے والوں سے تعلق رکھنے کا کبھی شوق نہیں رہا۔" کہہ کر وہ چپ ہوئی تو ایک ٹک وہ سمرہ کو دیکھتے رہے پھر ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے تو سمرہ کے غصے سے گنگ بیٹھی روشن گوہر کے جسم میں حرکت ہوئی اس طرح انہیں لٹے لٹے انداز میں اٹھتے دیکھا تو ان کا ہاتھ تھام لیا پھر بولیں۔

"آپ اس کی باتوں کو دل پر مت لگایئے گا میں اسے سمجھاؤں گی یہ خود آپ سے معافی مانگے گی اپنی بدکلامی کی۔" پاپا نے لمبا سانس کھینچا پھر آہستہ سے بولے۔

"رہنے دو روشن اب تم چاہو بھی تو کچھ نہیں ہو سکتا سمرہ کے دل سے میرا نام ڈھل گیا اب اس میں میری محبت، میرے لیے تشنگی، تڑپ نہیں اور تم جانتی ہو روشن میں نے کبھی زبردستی محبت حاصل نہیں کی، میری قسمت میں محبت ہے ہی نہیں تو پھر کسی کو الزام دینے سے فائدہ محبت اختیاری جذبہ نہیں، نا پھر تم کیسے اس کا دل موڑو گی میری طرف، کہتے ہیں جس طرح کچھ نام دل سے مٹائے نہیں جا سکتے اس طرح کچھ نام ہمیشہ لکھے نہیں رہتے کچھ لوگوں کی قسمت میں کچھ ناموں کا تقدیر میں مٹنا ناپید ہونا ہی لکھا ہوتا ہے سو روشن جان لو کہ تمہارا عبیر بھی انہیں کچھ لوگوں میں شامل ہے۔"

"نہیں عبیر ایسے مت کہیں آپ، آپ تو انسان کے روپ میں فرشتہ ہیں میرا بس چلتا تو ساری زندگی آپ کے قدموں میں بیٹھی رہتی مگر مجھ میں آپ کی طرح کا ظرف نہیں خود کو معاف کرنے کا میں آپ کے قابل ہی نہیں تھی عبیر ورنہ۔"

"ورنہ کاش شاید یہ تو لفظ ہیں روشن انکا حاصل صرف سراب تشنہ لبی کے کچھ نہیں ایک بار تم نے کہا تھا نا روشن کہ ہم محبت کے مارے بھی کیا ہے تو اس لمحہ میں خاموش رہ گیا تھا مگر آج جب کہ مجھ سے سب کچھ چھینا جا رہا ہے تو میں تم سے پوچھتا ہوں کہو ہم محبت کے مارے بھی کیا ہیں۔" روشن نے بھری بھری آنکھیں اٹھائیں پھر بولیں۔

"ہم محبت کے مارے محض آنسو ہوتے ہیں صحرائے زیست کے درمیان آبلہ پا دوڑنے والی آس ہوتے ہیں۔ خواب ہوتے ہیں یا شاید راکھ ہوتے ہیں۔" پاپا نے سنا پھر سر ہلا کر آگے کی طرف قدم بڑھا دیئے للی کو ان کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی اس لیے وہ تیزی سے ان کی طرف لپکی۔

"میں آپ کے ساتھ چل رہی ہوں انکل۔" کرسی پر بے سدھ بیٹھی رہی روشن گوہر دروازے سے مڑیں تو ان کی آنکھوں میں خفا خفا ماؤں والا جلال تھا۔

☆

للی پاپا کے ہمراہ جب کوٹھی آئی تو پاپا عجیب سے گم صم ہو رہے تھے جیسے سمندر میں کوئی طوفان آیا اور ارد گرد کی تمام زمین طوفانی لہروں سے اتھل پتھل ہو گئی ہو تو اس میں زمیں پر بسنے والوں کو نہ حادثے کا مطلب یاد رہا نہ بربادی کا بس بے بسی سے آسمان کی طرف نگاہیں ٹکا دیں پاپا نے گو آسمان کی طرف نگاہ نہیں ٹکائی تھی لیکن للی کو لگ رہا تھا جیسے پاپا اب بھی اپنی بیٹی کے لوٹنے کی دعا کر رہے ہوں۔

''انکل کیا سوچ رہے ہیں۔'' کتنی دیر تک انہیں خاموش دیکھتے دیکھتے لُلّی نے سوال داغا تو پاپا نے حسرت سے داہنا ہاتھ چہرے کے سامنے پھیلا لیا پھر لکیروں کو رقیبانہ انداز میں دیکھ کے بولے۔

''اب تو زندگی محبت کی طرح کوئی سوچ میرے دل پہ دستک نہیں دیتی۔ سمرہ کے بعد کچھ بچا ہی نہیں ہے کہ میں کچھ چاہوں کچھ مانگوں۔'' وہ کہہ کر پھر آنکھیں بند کر کے تکیے پہ لیٹ گئے کتنی دیر تک ایسے ہی بے سدھ پڑے رہے پھر جانے کیا ابال اٹھا کر ان کا تکیہ بھیگنے لگا تواتر سے آنسو ان کی کوروں سے بہے جا رہے تھے اور لُلّی بدحواس انہیں دیکھ رہی تھی۔

''انکل پلیز مت روئیں انکل دیکھیے میں لاؤں گی سمرہ کو آپ کی سمرہ آپ کو کال کر رہی ہے گی۔ لُلّی اس دن کی طرح پاپا کو پکارتی رہی مگر پاپا آج جواب دینے کی بجائے ہر طرف سے کیموفلاج کر گئے تھے بار بار سینے پہ ہاتھ رکھ کے کراہنے لگتے مگر آنکھیں کھول کر لُلّی سے کچھ بھی نہ کہتے سر تکیے پر دائیں بائیں مارتے ہوئے کسی بات سے انکار کرتے رہتے مگر لُلّی کو جواب نہ دیتے لُلّی انہیں دیکھ دیکھ کر گھبرا رہی تھی آخر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو وہ تیزی سے فون کی طرف بڑھی اس نے فون کر کے ڈاکٹر رشید کو بلا لیا۔

ڈاکٹر رشید بھاگے بھاگے فوراً ہی آئے چیک اپ کرنے لگے پھر کنڈیشن ٹھیک نہ تھی تو انہوں نے ایمبولینس کی طرف لے جایا جانے لگا۔ ڈاکٹر رشید اور دونوں ایک ہی کار میں ہاسپٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆

روشن گوہر نے پُرجلال انداز میں سمرہ کو دیکھا پھر بولیں۔

''سمرہ تم نے اچھا نہیں کیا تم اپنے پاپا کی اپنے لیے تڑپ جنوں سے واقف نہیں ہو وہ تمہارے بنا جی نہیں پائیں گے تم نے نہیں دیکھا مگر میں نے ان کی آنکھوں میں زندگی کی طلب کو مرتے دیکھا ہے وہ جتنی عزت کے توقیر کے قابل ہیں اتنی تو تم نے ان کی تکریم کی بھی نہیں۔

دن رات وہی چلتے رہے اپنی محبتوں کو ظاہر کرنے میں، انہوں نے دنیا کر ہر عیش تمہارے لیے فراہم کر دیا۔ شاید وہ ماضی کے تلخ تجربے سے خوفزدہ تھے کہ کہیں تم بھی محبت کی ہوک میں مبتلا ہو کر میری طرح کا کوئی قدم نہ اٹھاؤ مگر سمرہ تم تو میری ہی بیٹی نکلیں تم نے بالکل میری طرح ہی انہیں ڈس ہارٹ کیا، ان کی محبت ان کی شخصیت کی تو تم میں ایک بھی بات نہیں، ان کی پرورش کے باوجود بھی سمرہ کیوں نکلیں تم میری بیٹی، کیوں کیا تم نے وہی جو میں نے کیا۔'' روشن گوہر نے سمرہ کو جھنجھوڑ ڈالا اور سمرہ جو غصے میں بھری ہوئی تھی ہونق سی اپنی ماما کو تکنے لگی۔

''ماما آپ کہنا کیا چاہتی ہیں مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا۔''

''سمجھ نہیں آ رہا یا تم سمجھنا نہیں چاہتیں لیکن سمرہ تم نے فرشتہ صفت باپ کا دل دکھا کر اچھا نہیں کیا وہ تو اتنے عظیم ہیں اپنے حصے کی ہنسی دوسروں کی جھولی میں ڈال کر پھر بھی اس ساعت کا ذکر نہیں کرتے انہوں نے دونوں ہاتھوں سے لٹا دیا اپنا دل اپنی محبت، اپنی زندگی صرف کر دی مگر حرف شکایت زبان پر نہیں لائے۔'' لمحہ بھر کو وہ رکیں۔

''اگر وہ ایسے ہی تھے اتنے ہی جھک جانے والے تھے تو آپ کی خواہش پہ شہر چھوڑ کر گاؤں کیوں نہیں گئے آپ سے جدائی برداشت کر لی مگر اپنی امارت نہیں چھوڑ سکے نہیں ماما آپ کی باتوں میں نہیں آؤں گی۔'' روشن گوہر نے اس کا انداز دیکھا تو اس کا ہاتھ تھام کر ایک کمرے میں لے گئیں پھر بولیں۔

”شاید تم نے چھپ کر اپنے پاپا کا کیسٹ کلیکشن سن کر یہ سب اندازے لگائے ہیں مگر سمرہ وہ کلیکشن مکمل نہیں ہے کچھ کیسٹ میرے پاس بھی ہیں جو جانے سے پہلے تمہارے پاپا نے میرے سوٹ کیس میں رکھ دیے تھے کہتے تھے۔ ”انہیں ضائع کر دو یا جلا دو یا اپنے پاس رکھو یہ تمہاری امانت تھے روشن اس لیے میں نے سنبھال کر رکھے مگر اب تم جا رہی ہو تو تم یہ اپنی امانت بھی لے جاؤ۔“ اور میں نے حیرت سے انہیں دیکھا وہ اتنا کچھ جان کر مجھ سے محبت کرتے رہے تھے سمرہ تم اس لمحے کی کیفیت سوچو تو تمہارا دم رک جائے مگر تمہارے پاپا کتنے استقامت سے کھڑے رہے تھے تم سننا چاہتی ہو کہ ان کیسٹ میں کیا بند تھا تو سنو وہ کیسٹ میرا اصل جرم چھپائے ہوئے تھے تم بھی جان لو ان ادھوری کڑیوں کو تا کہ تم جان سکو کہ آدھا سچ جان کر کسی کو پوری سزا دے دینا کتنا بڑا جرم ہے۔“

روشن گوہر نے کیسٹ اسٹیریو میں لگائی ساتھ ساتھ خود بھی بولیں۔ ”تمہارے پاپا کو میری آواز ٹیپ کرنے کا جنون تھا ان کے پاس پاکٹ سائز ٹیپ ریکارڈر تھا وہ جہاں ہوتے ریکارڈ کا بٹن آن رکھتے گھر میں جو کہتی رہتی وہ ٹیپ ہوتا رہتا کتنی دفعہ تو مجھے بھی پتا نہیں چلتا مگر پھر وہ ہنستے ہوئے جب میری آواز مجھے سنواتے تو مجھے ان کے جنون پر ہنسی آتی ان کی دیوانگی سے خوف آتا مگر یہ اس وقت کی باتیں ہیں جب تمہارے پاپا کا صرف ایک بوتیک تھا پھر انہوں نے مزید دولت حاصل کرنی چاہی تو وہ کماتے چلے گئے وہ صرف میرے لیے تھے مگر مجھے ان کی مصروفیت کھلتی تھی وہ شروع سے میرے لیے نارمل نہیں تھے اس لیے جب مجھے ان کی محبت میں شدت کی عادت پڑ گئی تو ان کا کام میں لگا رہنا مجھے غصہ دلا دیتا توجہ نہ دیتے وہ کوئی شروع شروع میں مجھے خیال آیا کہ اگر ہم گاؤں چلے جائیں تو زندگی پھر سے پہلی ڈگر پر آ جائے گی سو میں تمہارے پاپا کے پیچھے پڑی رہی، ”چلیں گاؤں“ اور وہ کہتے۔

”کیا بات کرتی ہو یار بیوی بزنس میں اس طرح نہیں کرتے اس کے بھی ضابطے اصول ہوتے ہیں پراجیکٹ شروع ہونے معاہدے پر دستخط کے بعد یک دم میں کسی کام سے ہاتھ اٹھا لوں تو میرا تو نقصان ہوگا ہی مگر دوسرے فریق کا بھی کم نقصان نہیں ہوگا اور پھر یہ میری اصول پسندی کے بھی تو خلاف ہے اس لیے یہیں ایڈجسٹ ہونے کی کوشش کرو اپنے شوہر کی پرابلم سمجھو روشن۔“

”مگر سمرہ میں ان دنوں کچھ سمجھ نہیں پاتی بلکہ میں کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی مجھے لگتا جیسے اگر مجھ سے کسی نے محبت کی یا میں نے کسی سے محبت نہ کی تو میں مر جاؤں گی میں بہت تشنہ تھی سمرہ ان ہی دنوں تمہارے پاپا کے ایک پارٹنر علی کسی کام سے وطن لوٹے علی کو دوسروں کو سراہنے مبالغہ کی حد تک خوبصورت بتانے کی عادت تھی اور میں یہیں مار کھا گئی۔

”ماما آپ۔“ سمرہ نے آنکھیں بھینچ لیں مگر روشن گوہر کہتی رہیں۔

”میں جانتی ہوں اپنی بیٹی کے سامنے اپنی کسی خطا کا اقرار کرنا بہت مشکل ہے مگر سمرہ میں جھوٹ پر ڈٹ کر اسے سچ ثابت کرنے والوں میں سے ہرگز نہیں ہوں اس لیے سنتی رہو جو میں کہہ رہی ہوں پھر سمرہ وہ ہم ملتے رہتے وہ میرے کپڑوں کی میری تعریف کرتا رہتا اور تمہارے پاپا خود بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے وہ سمجھتے جیسے وہ خود سادہ بے ریا ہیں باقی سب بھی ویسے ہی ہوں گے مگر میں علی کی نگاہ کا مطلب سمجھتی تھی اس لیے خوفزدہ تھی۔

میری مایوسی کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا مجھے تمہارے پاپا حرص و ہوس کے پتلے لگے۔ علی بلندی پر دکھائی دیتا اور پھر عورت یوں بھی تو کمزور ہوتی ہے ہمارے مذہب میں جو صنف مخالف کے درمیان فاصلے ہیں انہیں ہر صورت قائم

رہنا چاہیے دگرنہ آدم حوا کی جنت میں شیطان گھس آتا ہے۔ میری جنت میں بھی علی گھس آیا میں تمہارے پاپا سے اتنی متنفر ہوئی کہ ان سے علیحدہ ہونے کی بات کر بیٹھی انہوں نے مجھے سمجھایا ہر طرح سے خوش رکھنے کا عہد کیا مگر میں اس وقت ان کی سننا ہی نہیں چاہتی تھی میرے سامنے محبت کا سمبل علی تھا اور یوں میں ان سے علیحدہ ہوگئی۔

تمہارے پاپا نے مجھے طلاق نہیں دی کہنے لگے دو چار مہینے الگ رہ کر دیکھو پھر جو فیصلہ کرو گی تو مجھے منظور ہوگا، میں جانے لگی تو انہوں نے یہ کیسٹ بھی میرے حوالے کر دیے اور مجھے تب پتا چلا وہ اپنی عادت کے مطابق میری آواز ٹیپ کرنے کے جنون میں کتنے بڑے دکھ سے آشنا ہوگئے تھے مگر انہوں نے ایک بار بھی مجھے اس لغزش کا طعنہ نہیں دیا تھا۔

مگر میں نے جو اپنے اور ان کے بیچ حصار قائم کر دیا تھا وہ اسے توڑ نہ سکے میں ان کے کہنے پر گاؤں چلی گئی۔

پرانے گھر لوٹی تو کسک کی طرح پرانی یاد دل میں کچوکے دینے لگی گاؤں کی فضا بہت پاکیزہ ہوتی ہے نا، تو میں بھی یہاں آ کر پہلے والی روشن بن گئی یہاں علی کا شائبہ بھی میرے دل میں نہیں رہا تھا میں جو سمجھتی تھی علی ہی میری آخری تمنا ہے تو مجھ پر یہ کھلا تھا علی محض میری لغزش تھی میری تمنا تو تنہا جبیر تھے مگر اب مجھ میں ہمت نہیں تھی ان کا سامنا کرنے کی، وہ آسماں تھے سمرہ میں تو ذرہ بھی نہیں رہی تھی پھر کیسے آسمان کے ساتھ سنجوگ نبھاتی وہ مجھے لینے آئے تھے مگر میرا ظرف ان کی طرح نہیں تھا اس لیے میں خود کو معاف نہیں کر سکی۔

تم سے جدائی تمہارے پاپا کی ظالم سوچ نہیں میرے اندر کی عورت کا فیصلہ تھا سمرہ وہ تو آخری فیصلے کے بعد بھی چاہتے تھے میں تمہیں رکھ لوں وہ جانتے تھے ان کی طرح تم میری بھی کمزوری ہو مگر میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتی تھی یا شاید مجھے لگتا تھا اگر میرے بعد تم بھی ان کی زندگی سے نکل گئیں تو وہ کیونکر جئیں گے بس اس لیے میں نے تمہیں ان کو سونپ دیا۔

وہ کہہ کر چپ ہوگئیں اور اسٹیریو میں ایک کے بعد ایک کیسٹ لگاتی چلی گئیں سمرہ سن رہی تھی رو رہی تھی اور روشن گوہر پچھتا رہی تھیں یہاں تک کہ بقیہ آدھا پچ بھی ختم ہو گیا تو انہوں نے سمرہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے پھر بولیں۔

"تم نے سنا سمرہ میں نے کیا کیا نہیں کہہ دیا تم سے اپنے وقار تکریم کو بھول کر، میں جانتی ہوں اب تمہاری نظر میں میری کوئی حیثیت نہیں ہے مگر سمرہ مجھے یہ دکھ بھی قبول ہے اگر تم اپنے پاپا کو منا لو جا کر میں تم سے ملنے کی تمنا نہیں کروں گی مگر پلیز سمرہ تم اپنے پاپا کا بہت خیال رکھنا وہ بہت تڑپے ہیں محبت کے لیے بہت برباد ہوئے ہیں سمرہ۔" وہ رو پڑیں تو سمرہ اپنے آنسو پونچھتی ہوئی اٹھی۔

"میں گھر جا رہی ہوں ماما۔"

"مجھے خوشی ہوگی بیٹا تمہارے پاپا ہی درحقیقت تمہاری آمد کی خوشی کے صحیح حقدار ہیں جاؤ میری دعائیں ہمیشہ کی طرح تمہارے لیے ہی رہیں گی دور رہ کر بھی میں تم دونوں کے لیے ہوں۔" انہوں نے اس کی پیشانی پر بوسہ لیا تو وہ سوٹ کیس کار کی پچھلی سیٹ پر رکھ کر کار ڈرائیو کرتی گھر کی طرف چلی گئی مگر گیٹ سے داخل ہوئی تھی کہ آنسو پونچھتے واچ مین کو دیکھ کر بدحواس ہوگئی۔

"کیا بات ہے خان تم رو کیوں رہے ہو؟"

"چھوٹی سرکار آپ، آپ کہاں تھیں جی وہ لی صاحبہ تو صاحب کو لے بھی گئیں جی۔"

"کہاں لے گئیں؟" اس نے سوٹ کیس باہر رکھ کر حیرت سے پوچھا تو دوسرا ملازم روتے ہوئے بتانے لگا۔

"کر ایمبولینس آئی تھی جی صاحب کو آکسیجن دے کر لے گئے، جی ڈاکٹر رشید بھی تھے ان کے ساتھ۔"

"ڈاکٹر رشید...... کارڈیو...... او مائی گاڈ۔" وہ کار بیک کرتی کارڈیو کی طرف اندھا دھند بھاگی، پھر ایمرجنسی ڈور پر ہی للی سے ٹکراؤ ہو گیا تو ضبط گریہ سے اس کی آواز پھٹ گئی للی اسے پرائیویٹ روم کا بتا رہی تھی اور پھر وہ اس کے ہمراہ چلتی ہوئی پاپا کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کا دل رکنے لگا پاپا مصنوعی تنفس کے زیر اثر لمبے لمبے سانس کھینچ رہے تھے اور ہارٹ بیٹ بتانے والا کمپیوٹر مسلسل ان کے دل کی دھڑکن گراتا جا رہا تھا کہ یک دم اس نے پاپا کے ہاتھ تھام لیے اسے لگا جیسے اس نے اس وقت پاپا کو نہیں تھاما تو وہ مٹھی سے زندگی کی خوشی کی طرح پھسل جائیں گے۔

"پاپا میں آ گئی سمرہ صرف آپ کی بیٹی پاپا۔" اس نے پاپا کے ہاتھ پر آنکھیں رگڑ ڈالیں للی قریب کھڑی خود بھی سسکتی رہی۔ ڈاکٹر رشید پندرہ منٹ بعد پاپا کو چیک کرتے رہے پھر دوسری صبح انہوں نے کہا۔

"اب یہ ڈینجر زون سے نکل چکا ہے یہ واقعی ٹھیک کہتا تھا کہ اسے اپنی بیٹی کی محبت مرنے نہیں دے گی تم بہت خوش قسمت ہو سمرہ یہ صرف تمہاری وجہ سے لوٹا ہے واپس ورنہ میری تو تمام محنت ضائع ہونے لگی تھی۔ واقعی لو از پاور سمرہ۔" انہوں نے اس کا شانہ تھپتھپایا للی روشن گوہر کو بھی بلا چکی تھی، اس لیے جب پاپا نے آنکھیں کھولیں تو حیرت زدہ رہ گئے سمرہ سوپ کا پیالہ لیے ان کی منتظر تھی۔

"کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔"

"نہیں پاپا یہ سچ ہے سمرہ آپ کی ہے، شروع سے آخر تک بس لمحہ بھر کو قدم ڈگمگائے تھے مگر اب مطلع بالکل صاف ہے۔"

"مگر کیسے ہوا یہ سب؟"

"ماما نے مجھے پورے سچ سے آگاہ کر دیا آپ نے آدھا سچ بول کر اپنے ساتھ ہی نہیں میرے ساتھ زیادتی کی تھی پاپا۔"

"روشن تم نے اچھا نہیں کیا۔" پاپا نے آزردگی سے روشن گوہر کو دیکھا تو وہ بولیں۔

"بعض کام ہم اچھے لگنے کے لیے کرتے ہیں نہ نام کمانے کے لیے اور نہ ذاتی تسکین کے لیے بلکہ بعض کام ہماری زندگی پر قرض ہوتے ہیں سو میں نے تو قرض اتارا ہے سود تو ابھی بھی باقی ہے۔"

"اپنی بیٹی مجھے سونپ دی پھر بھی سود کی بات کرتی ہو روشن۔" پاپا کے لہجے سے تشکر پھوٹ رہا تھا ڈاکٹر رشید مطمئن تھے۔ یہ محبتیں تھیں، سب کی کہ پاپا بہت جلد صحت یاب ہو گئے وہ گھر آ گئے تو ایک صبح روشن گوہر ان سے ملنے آئیں سمرہ کو گلے لگا کر خوب روئیں پھر بولیں۔

"گاؤں جا رہی ہوں لیکن جب بھی آؤں گی تمہیں میرے گھر کے دروازے کھلے ملیں گے۔" پاپا نے روکنا چاہا وہ رکی نہیں کہنے لگیں۔

"میں نے کہا تھا نا جبیر یہ محبت آبلہ ہوتی ہے پھرائے پھرتی ہے جنون بن کر، بس مجھ میں بھی بہت مسافت ہے جو امنڈی آتی ہے یقین کرو جبیر اگر میں ایک لمحہ کو بھی رک جاؤں نا تو مر جاؤں۔"

"مگر میں تو تمہیں طویل عمر جیتا دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"پھر جانے دو نا۔" پاپا نے اثبات میں سر ہلا دیا کوٹ کے کالر سے گلاب کی وہ تازہ کلی نکالی جو صبح ہی سمرہ نے لگائی تھی پھر بولے۔

"یہ محبت کی اس ادھوری نظم کے نام جسے ہماری زندگیاں مل کر بھی پورا نہ کر سکیں۔"

کچھ دن تو لِلی سمرہ سب ہی کو ان کی یاد ستائی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی یاد مدہم پڑ گئی سمرہ کے پاس پاپا کے بعد بچ جانے والے وقت کا حاصل لِلی اور ہیثم ولی کی خوبصورت محبت تھی وہ خوب مزے مزے لے لے کر یہ داستان سنتی حسن عمار اکثر فون کر کے کہتا۔

"کچھ اپنی دوست سے ہی احساس مانگ لیجیے ادھار کی خوشی میں خوش ہونا بھی کوئی بات ہے۔ ہمیں نگاہ بھر کر دیکھیے ہر طرف ہم ہی ہم دھڑکتے نظر آئیں گے۔" وہ سنتی اور ہنس دیتی مگر پھر ایک دن حسن عمار ایسا اس کے دل میں دھڑکا کہ ہر طرف اس کی صدا سنائی دینے لگی وہ بے قرار تھی لِلی کو اس نے تجربے سے آگاہ کرنے کے لیے کہ ایک دن لِلی اس کے کمرے میں آئی تو پھوٹ پھوٹ کر روئی بے قراری سے وہ پوچھتی رہ گئی مگر وہ کچھ کہہ ہی نہ پائی۔

☆

جواد بھائی ابھی دفتر میں آ کر بیٹھے ہی تھے کہ ان کے وکیل کا فون آ گیا۔ وہ جواد سے ملنا چاہتے تھے جواد بھائی فوراً اٹھ گئے جانے کیا معاملہ تھا ورنہ بیرسٹر حفیظ الرحمٰن اس ایمرجنسی میں تو نہ بلاتے جواد بھائی ان کے ایئر کنڈیشن دفتر میں پہنچے تو وہ ریوالونگ چیئر پر بیٹھے تفکر سے دائیں بائیں جھول رہے تھے جواد بھائی کو دیکھا تو بولے۔

"آؤ آؤ جواد مجھے تمہارا ہی انتظار تھا ایک معاملے میں تمہاری رہنمائی چاہیے مجھے۔" وہ بیٹھے ہی تھے کہ انہوں نے ایک پاور آف اٹارنی اس کے سامنے رکھ دیا پھر بولے۔

"کیا ہیثم پر پاور آف اٹارنی چینج کرنے کے لیے کوئی دباؤ ہے جواد۔"

"میں سمجھا نہیں انکل۔"

"سیدھی سی بات ہے جواد، ولی امام نے یہ تمام جائیداد ہیثم کے نام چھوڑی تھی نئی وصیت کے مطابق ہیثم ہی اس تمام دولت کا تنہا وارث تھا یہ اور بات کہ اس نے تمام معاملات تم پر اور بھابھی صاحبہ پر چھوڑے ہوئے تھے اور مجھے کہنے دو کہ تم نے ایک سگے بھائی والا رول پلے کیا ہے یہاں لیکن آج میں دیکھتا ہوں اس اچانک فیصلے میں مجھے ہیثم پر بے جا دباؤ دکھائی دیتا ہے۔ ورنہ پاور آف اٹارنی کے ساتھ یہ وصیت نامہ ابھی اس کی یہ عمر تو نہیں ہے وصیت نامے کی۔ یہ دیکھو اس نے تمام جائیداد بھابھی صاحبہ تمہارے، جنید، ستارہ کے نام کر دی ہے حالانکہ کامران ہمدانی کے لیے بھی تمام عمر کے لیے ہر ماہ تین ہزار رکھے ہیں اس نے، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا، یہ سب کچھ اس نے حسن عمار کے ذریعے بھجوایا ہے تم جا کر پوچھو اس سے اگر ہو سکے تو ساتھ ہی لے کر آنا۔"

جواد بھائی نے اثبات میں سر ہلایا پھر اٹھ کھڑے ہوئے واقعی یہ کوئی بات تو نہیں تھی جو ہیثم نے کرنے کی کوشش کی تھی وہ سیدھے دفتر سے گھر پہنچے پھر ہیثم کے کمرے کی طرف جا ہی رہے تھے کہ اس کی آواز انہیں لِلی کے کمرے سے آتی محسوس ہوئی وہ کہہ رہا تھا۔

"پھر ممی، ماموں جی نے جب مجھے یہ بتایا کہ آپ مجھے صرف اس وقت تک چاہیں گی جب تک دولت میرے نام ہے تو میرا دل بیٹھنے لگا محبت میرے لیے ہیڈک بن گئی میں کبھی محبت کا انکار کرتا کبھی اقرار اسی میں میری اصل شخصیت بھی چھن گئی میں محبت کو دھوکا دیتا خوش ہوتا مگر جب بھی آپ کی طرف پلٹتا آپ کو ستارہ کو دیکھتا تو مجھے خود پر شرم آتی میں انسان کی جون میں آنے کی کوشش کرتا مگر شک کا درندہ مجھ میں غراتا رہتا میں کچھ اور تھا، بن کچھ اور گیا تھا پھر ماموں جی بھی مجھے دیوانہ کرنے کے لیے کافی تھے وہ اٹھتے بیٹھتے میرے دل میں آپ سب کی طرف سے زہر اگلتے پھر خوشامد کر کے ایک خطیر رقم اینٹھتے رہتے۔

مجھے نہیں معلوم تھا ممی مجھے ان سے نفرت تھی تو میں پھر بھی تنہائی ملنے پر ان کا انتظار کیوں کرتا تھا کرید کرید کر آپ سب کے بارے میں کیوں پوچھتا تھا میں نہیں جانتا ممی لیکن یہ سچ ہے کہ اس تشکیک نے مجھے کہیں کا نہ رکھا میں جس بن کا شن تو تھا ممی خود سے بھی کچھ سوچ ہی نہیں پایا اور پھر مجھے شروع سے آپ کی محبت کی عادت بھی تو ہو گئی تھی مجھے آپ کی طلب تھی ممی اور اس کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا تھا میں کتنا پاگل تھا ممی کہ آپ پر یقین بھی نہیں کرتا تھا اور آپ کو خود سے جدا کرنے کی ہمت بھی نہیں رکھتا تھا۔ اس دوہری سوچ نے مجھے اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا میں دولت کا لالچی نہیں تھا مگر پھر بھی میں نے پاور آف اٹارنی کو اپنے نام رکھا مجھے اس لمحے سے ڈر لگتا تھا جب آپ مجھے خود سے دور کر دیتیں میں جب بھی کاغذات پر دستخط کرتا تو مجھے خود سے نفرت ہونے لگتی کہ میں آپ کو اپنے زیر نگیں رکھنا چاہتا ہوں مگر پھر سوچتا میں کون سا دولت کے لیے یہ سب کر رہا ہوں آپ کی محبت میری مطمح نظر ہے سو میں اپنے کام میں مگن رہا۔

مگر ممی جب سے مجھے یہ اسٹروک شروع ہوئے ہیں مجھے ڈر لگنے لگا ہے کہ اگر میں بھی پاپا کی طرح فیصلہ کیے بنا مر گیا تو جواد بھائی کو کس قدر قانونی دشواریاں ہوں گی نا بس اس لیے کل میں نے سب کچھ آپ کے نام لکھ دیا ماموں جی کے ہر شک کو کل میں نے ٹھوکر لگا دی۔ اس لیے پلیز ممی مجھ سے آپ اپنی محبت مت چھینیے گا میں آپ کے بغیر رہ نہیں پاؤں گا ممی۔"

"ایسے نہیں سوچتے ایسے نہیں کہتے بچے۔" ممی اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر چومتے ہوئے رونے لگیں اور جواد بھائی متحیر باہر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ یہ ہیثم کیا تھا کس قدر معصوم اور سادہ، ہیثم ولی جس سے ان کا خون کا کوئی رشتہ نہیں تھا مگر جس کی روح ان کی روح سے جڑی ہوئی تھی اور بعض دفعہ رشتوں ناتوں سے یہ روحوں کے بندھن زیادہ مضبوط ہوتے ہیں جواد بھائی اندر داخل ہوئے اسے کاندھوں سے تھام کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"تو میری سوچ سے بھی زیادہ پاگل ہے۔" اس نے سنا تو نم آنکھوں سمیت ہنسنے لگا پھر جواد بھائی بیرسٹر حفیظ الرحمٰن کی ملاقات کے بارے میں بتانے لگے تو انہیں یک دم یاد آیا تو بولے۔

"سب کا حصہ برابر کا ہے اس جائیداد میں تم نے اپنے لیے کچھ کیوں نہیں رکھا۔"

"اس لیے کہ مجھے ضرورت ہی نہیں پڑی تھی، میری ضرورتیں صرف رنگ برش تک محدود ہیں اور یہ ضرورت ممی پوری کرتی ہیں اس لیے میں نے اپنا حصہ بھی ممی کے نام لکھ دیا۔" ممی نے پشت موڑ لی آج اس کے سامنے وہ بلند ہونے کے باوجود کس قدر نچلے درجے پر کھڑی تھیں اور وہ عام سرسری سے انداز میں کہتا ہوا کتنی بلندی پر تھا اس پُرآشوب دور میں تو اپنے اپنوں کو کاٹتے ہیں مگر اس نے کس قدر اپنائیت کا ثبوت دیا تھا سب بھلا دیا تھا محض ایک محبت

کی خاطر......

ممی نے پھر اس کی پیشانی چوم لی تو جواد بھائی نے چلنے کو کہا وہ ممی کو سلام کرتا ان کے ہمراہ باہر نکل گیا پھر ان کے دفتر میں پہنچا تو نیا وصیت نامہ لکھوایا دستخط کیے دونوں چلنے لگے تو وہ بے ساختہ پکارے۔

''ابھی تو تم بہت جوان ہو پر جوش ہو ہیثم پھر یہ اچانک وصیت کا خیال کیسے آ گیا۔'' وہ مڑ کر مسکرایا دلربائی سے پھر بولا۔

''کہتے ہیں وقت مٹھیوں میں آنے والی شے نہیں، انکل اس لیے میں نے سوچا اس سے پہلے کہ وقت میرے ہاتھ سے نکل جائے میں پاپا والی غلطی کو کیوں نہ درست کر دوں زندگی موت کسی کے اختیار میں نہیں ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے مگر انکل ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ مقرر وقت ہمارا اگلا ہی لمحہ نہ ہو بس اس لیے تھوڑی سی پیش بندی کر دی۔'' بیرسٹر حفیظ الرحمٰن سن کر مطمئن ہوئے یا نہیں ہاں البتہ دروازے تک اسے چھوڑنے ضرور آئے وہ وہاں سے سیدھا جواد بھائی کے دفتر پہنچا تھک کر بہت چور تھا آج کل معمولی سا چل کر بھی اسے میلوں چلنے جیسی تھکن ہو جاتی تھی وہ ڈاکٹر کے کہنے پر دوا کا خاص خیال رکھتا تھا مگر طبیعت بہتر ہونے کی بجائے خرابی کی طرف مائل تھی سو اس وقت بھی وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

''پانی پیو ابھی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔'' اس نے جواد بھائی کے ہاتھ سے گلاس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر لمحوں میں سب کچھ دھندلا گیا گلاس چھوٹ کر زمین پر گر گیا وہ تکلیف سے دوہرا ہو رہا تھا کبھی سینے پر ہاتھ رکھتا کبھی سر تھام لیتا، جواد بھائی باحوصلہ تھے مگر اس وقت وہ بھی بوکھلا گئے تھے تیزی سے اسے سہارا دیتے اسے ہاسپٹل کی طرف لے کر دوڑے جہاں ہیثم دلی کا باقاعدہ علاج ہو رہا تھا۔

جواد بھائی کو اپنے فیملی ڈاکٹر پر اعتبار نہیں تھا اس لیے انہوں نے ایک پرائیویٹ ہاسپٹل سے رجوع کیا تھا۔ جواد بھائی اسے اسپتال میں لے کر داخل ہوئے تو ڈاکٹر محسن فوراً ہی چیک اپ کرنے لگے کچھ ٹیسٹ لیے رپورٹ دوسرے دن پر ٹل گئی۔ پھر دو ڈھائی بجے اس کی طبیعت سنبھلی تو وہ جواد بھائی کے ساتھ گھر میں داخل ہوا ستارہ بے وقت دونوں کو دیکھ کر حیران رہ گئی وہ ابھی ابھی یونیورسٹی سے لوٹی تھی ممی نے بھی پریشانی کا اظہار کیا تو ہیثم نے ہلکے پھلکے انداز میں طبیعت کی خرابی کا کہہ کر بات ختم کر دی ستارہ تو اس کے بیڈ سے لگ کر بیٹھ گئی اور ممی اس کے لیے دودھ میں اوٹین ڈال کر لے آئیں۔

''اسے پی لو ایک دم ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' اور ممی کی محبت میں اس نے ضرورت نہ ہونے کے باوجود گلاس تھام لیا ستارہ نے للی اور حسن عمار کو فون کر دیا تھا اس لیے حسن عمار للی سمرہ تینوں ہی اس کے سر پر سوار تھے۔

''یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ملک کے عظیم مصوریوں بار بار بیمار ہو کر آخر تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو۔''

''صرف ایک بات کی زندگی سے زیادہ ناپائیدار چیز اور کوئی نہیں صحت کی قدر کرو جب تک وہ تمہارے پاس ہے وہ لمحہ بھر کو رکا پھر بولا۔'' کتنے بہت سارے کام ہیں جو مجھے کرنے ہیں مگر یہ مہلت دیکھو کہاں جا کر تھے۔'' للی نے اس کے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے حسن عمار نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور سمرہ بولی۔

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو للی ہیثم بھائی جیسے لوگ واقعی باتوں کے بھوت نہیں۔'' پھر ہیثم کے ہاتھ تھام کے

بولی۔ "اتنے خوش قسمت ہیں آپ کہ لنی کی ڈھیر ساری محبت صرف آپ کی ہے لیکن پھر بھی آپ مرنے جینے کی باتیں کررہے ہیں محبت تو بہت بڑی قوت ہے موت کے فیصلے ٹال دیتی ہے۔" ہیشم نے سنا کچھ کہا نہیں اور ستارہ ان سب کے لیے چائے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی کمرے میں چلی آئی سب پھر سے باتوں میں مگن ہوگئے اور ہیشم کی نظر لنی پر جاکر پھسلتی رہی۔

اس کے ساتھ کتنا بڑا فاؤل تھا کہ جب وہ محبت کے ڈھونگ کررہا تھا تو صحت جذبے، جوانی، وقت سب کچھ اس کی مٹھی میں قید تھے مگر اب جب کہ وہ دل کی گہرائیوں سے کسی کو چاہنے لگا تھا تو ہر چیز زندگی سمیت اس کی مٹھیوں سے پھسلتی چلی جارہی تھی محبت طاقت ہے مگر محبت دھڑکا بھی تو ہے جو اس کے دل کو لگ گیا تھا اچانک ہی وہ لیٹا ہوا بس سوچے ہی چلا جارہا تھا دماغ جسم کا ایک ایک عضو تھک کر چور تھا مگر وہ پھر بھی بے شمار سوچوں کے درمیان تھا۔

پتہ نہیں کس کو سوچ رہا تھا خود کو لنی کو، یا محبت کو، کوئی نہیں جانتا تھا اس لیے وہ خود کو سمجھاتا رہا۔

اس دن وہ پھر برش سنبھالے کھڑا تھا لنی پاس ہی کھڑی اس کی بنائی تصویر پر تبصرہ کررہی تھی۔

"ہیشم محبت مان لینے کے بعد تمہارے رنگوں میں زیادہ نکھار اور جاذبیت آگئی لیکن میں دیکھتی ہوں تمہارے رنگ اب بھی قنوطیت اور اداسی کا آہنگ لیے ہوئے ہیں یوں لگتا ہے جیسے تم امید کو تھامنا بھی چاہتے ہو اور تمہیں ماضی کا دھڑکا بھی ہے کہ کہیں وہ پھر سے تمہاری زندگی کو اداس شام میں نہ ڈھال دے۔

"پہلے تم محبت اور نفرت کے درمیان کہیں اٹک رہے تھے، اب محبت اور زندگی کے درمیان تم کہیں بھٹک گئے ہو آخر ایسا کیوں ہے کیا میں تمہاری سوچوں کو سمجھنے کے قابل نہیں ہیشم جو تم مجھے اپنی ذات سے آگاہی دو۔"

ہیشم نے برش روک کر اسے دیکھا اور سوچا۔ "دنیا میں صرف تم ہی تو ہو لنی جو میری سوچوں تک پڑھ سکتی ہو مگر میں تمہیں اپنے نام کا کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا تم زندگی بھر پور جیو میرے لیے برباد ہونے سے تمہیں کچھ نہ ملے گا۔"

"میں نے کچھ پوچھا تھا ہیشم کیا سوچنے لگے تم۔"

لنی اس کے اور قریب آگئی تو اس کا دم گھٹنے لگا۔ پھر اچانک اس نے ایک فیصلہ کرلیا تو مطمئن سا ہوگیا اب وہ زیادہ سے زیادہ وقت پرانی محبتوں کو یاد کرنے میں گزارتا لنی فون کرتی تو کسی نہ کسی سے مصروف گفتگو ہوتا لنی پوچھتی تو ذکر اس کے تحکم کے مطابق اس کی کسی نہ کسی گرل فرینڈ کا نام لے دیتے کتنے دن تو لنی برداشت کرتی رہی مگر ایک دن لنی نے ہیشم کو ہوٹل میں ایک لڑکی کے ساتھ ڈنر کرتے عین موقع پر جا لیا لنی آگے بڑھی تو اس کا خیال تھا ہیشم بدحواس ہوجائے گا اس اچانک ملاقات پر مگر وہ ویسے ہی مطمئن بیٹھا رہا اس کی گرل فرینڈ نے سرگوشی میں پوچھا تو استہزائیہ بولا۔

"یہ بھی تمہاری طرح میرے اچھے وقتوں کی محبت ہیں اور ان کا خیال ہے ہیشم ولی ان کے پیار میں دیوانہ ہوکر ان سے شادی کرلے گا مگر ہیشم ولی کیا ہے شاید یہ پہچانتی نہیں ورنہ یوں امیدیں نہ باندھتیں۔" اس نے چہرہ اٹھا کر لنی کی طرف کیا پھر بولا۔

"ہیشم ولی تمہیں صرف جھکانا چاہتا تھا اپنے سامنے تم نے مجھے بہت اگنور کیا تھا نا تو دیکھ لو اب تم کب سے میرے آگے سرنگوں ہو۔"

لنی ضبط کرکے کچھ کہے بنا داخلی دروازے کی طرف دوڑتی چلی تو ساتھ بیٹھی لڑکی اک ادا سے ہنستے ہوئے

پھر سے ہیشم دلی سے کلوز ہونے کی کوشش کرنے لگی تو ہیشم نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے آہستگی سے ہٹا دیا۔ پھر بڑبڑایا۔

”انیلہ میں نے پڑھا تھا، ایک جگہ ”خواہش اندر سے خالی ہوتی ہے اور خالی شے بڑی خطرناک ہوتی ہے کیونکہ یہ اپنی کبھی نہ ختم ہونے والی پیاس کو بجھانے کے لیے دنیا جہان کو اپنے اندر انڈیل لینا چاہتی ہے، خواہش کیا ہے صرف دکھ اور محبت وہ اس دکھ کا دل ہے جب ہی تو اپنے خالی پن کو بھرنے کے لیے یہ ہماری زندگیاں ہماری خوشیاں خواب سب ہی کچھ اٹھا اٹھا کر اپنی جھولی میں انڈیلتی رہتی ہے۔ مگر انیلہ اس خواہش کا من کبھی نہیں بھرتا کبھی بھر ہی نہیں سکتا کہ وقت اس کا حواری اور تقدیر اس کی حمایتی ہے اور انسان وہ سدا سے بے بس چلا آتا ہے تم کچھ سمجھیں انیلہ۔“ سنجیدگی سے اس نے انیلہ سے پوچھا تو لپ اسٹک غازے کی تہوں میں چھپی انیلہ ناز نے احمقانہ انداز میں نفی میں سر ہلا دیا ہیشم نے دیکھا تو کہا۔

”میں بھی کتنا پاگل ہوں تم سے فلسفہ ہانکنے بیٹھ گیا تم سے تو صرف لپ اسٹک کے شیڈ، دنیا کے نئے نئے فیشن کے کیٹلاگ پر بحث کی جا سکتی ہے بھلا تمہیں کیا پتا محبت کے بارے میں خواہش کے اس فلسفہ کے بارے میں۔“ بل پے کر کے وہ اٹھ گیا انیلہ ناز حیرت سے منہ پھاڑے اسے دیکھتی رہ گئی مگر وہ پیچھے دیکھے بنا آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا منزل کا تعین کیے بغیر......

☆

سمرہ کتنی ہی دیر سے للّی سے اس کے رونے کا سبب پوچھے جا رہی تھی مگر اس کی ایک ہی رٹ تھی۔

”کچھ نہیں ہوا بس یونہی رونے کو دل چاہ رہا ہے۔“ مگر جس طرح ٹوٹ کر وہ رو رہی تھی وہ دل کا معاملہ ہو سکتا تھا محض دل کا شوق نہیں۔

”للّی بتا رہی ہو اب یا میں پاپا کو بلاؤں۔“ بالآخر اس نے پاپا کی دھمکی دی تو اس نے دبے دبے لفظوں میں ہیشم کی آج کی تمام باتیں گوش گزار کر دیں سمرہ چند لمحے تو سکتے میں رہی پھر ہنسی۔

”ارے یار ہیشم بھائی نے مذاق کیا ہوگا ورنہ بھلا تجھ سے منہ موڑ کے وہ کس کام کے رہیں گے ایمان سے ان تیری محبت کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔“

”مگر مجھے لگتا ہے کہ وہ میری محبت کے علاوہ سب کچھ ہیں۔“ وہ تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی تو سمرہ نے اسے تسلی دینے کے لیے اس کے سامنے ہی ہیشم دلی کا فون نمبر ڈائل کیا مگر معلوم ہوا وہ آج دیر تک گھر نہیں آئیں گے، سمرہ کو محسوس ہوا ملازم جھوٹ بول رہا ہے اس نے ہیشم کے کمرے کا نمبر ڈائل کیا فون ہیشم نے ہی اٹھایا سمرہ کی آواز پہچانی تو کچھ کہے بغیر فون رکھ دیا۔ سمرہ کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں للّی کا کہا ہوا ایک ایک حرف ٹھیک لگنے لگا مگر وہ پھر بھی جب مڑی تو مطمئن تھی۔

”وہ گھر میں نہیں ہیں اس وقت میں کل خود بات کروں گی ان سے دیکھ لینا کہ ان کا جوک ہی ہوگا کوئی۔“ للّی نے اچھا کہا نہ برا آنکھیں موند لیں اور سمرہ نے دوسرے دن ہی سے ہیشم کا ناطقہ بند کر دیا ستارہ کو پتا چلا تو سمرہ کے ساتھ وہ بھی ہیشم کے پیچھے پڑ گئی ہیشم نے پھر بھی جون نہ بدلی تو جنید بھائی کو بھی کہہ کر ہیشم کے پیچھے لگا دیا۔ وہ تنگ آ گیا جنید بھائی اٹھتے بیٹھتے اسے سخت سست کہتے باتیں سناتے فلرٹی کہہ کر دل کی بھڑاس نکالتے اور وہ ہنستا رہتا کچھ نہیں کہتا

اور للّی تو کچھ نہیں کہتی مگر سب کچھ ہی اس کی آنکھوں سے پڑھا جا سکتا تھا۔

للّی نے دکھ کے کئی زینے یکدم ہی چڑھ لیے تھے اس لیے اس کی سانس پھولی ہوئی تھی لیکن وہ پھر بھی آنکھیں موند کر بیٹھی ہوئی تھی۔

پہلے کی طرح سوتی جاگتی، چلتی پھرتی رہتی مگر سمرہ کو لگتا ان کے اندر کی للّی یا تو کہیں چلی گئی ہے یا مر گئی ہے وہ سب سے یوں ہی بی ہیو کرتی جیسے پہلی بار ملی ہو کبھی آشنائی سے کبھی مکمل اجنبیت سے ظفر انکل اس کی اس حالت سے پریشان تھے پریشان تو پاپا بھی تھے مگر کسی کو حقیقت کا نہیں پتا تھا اس لیے سب مختلف زاویوں سے اس سے پوچھتے۔

"للّی کیا مس کر دیا کس کی تلاش ہے تمہیں، کیوں روح بنتی جا رہی ہو۔" حسن عمار سمرہ سے پوچھتے جاتے اور وہ کبھی مٹھیاں بھینچ لیتی، کبھی ہتھیلی سامنے پھیلا کر یشم کا نام ڈھونڈنے لگتی سمرہ اس کی بے بسی دیکھتی تو حسن عمار پر الٹ پڑتی۔

"دیکھ لیا نا اپنے یشم یار دلدار کو کس قدر چیٹ کیا ہے اس نے میری فرینڈ کو۔"

سمرہ پاپا سے اس کی حالت کہتی تو وہ کہتے۔

"للّی سر تا پا دل تھی مگر وہ تنہا ہو رہی ہے مجھے ڈر ہے کہیں ہم اسے کھو نہ دیں تم پوچھو تو ایسی کیوں ہو رہی ہے۔" سمرہ کو دیکھتی تو جسم سے روشن گوہر نام کی ایک اور روح اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی مگر کس قدر مختلف تھی یہ کہانی پہلی کہانی میں ایک مرد تپسیا کر کے روح بن گیا اور اس کہانی میں ایک مرد نے سر تا پا دل بنی ایک عورت کو کچل دیا تھا اس برے طریقے سے کہ اسے روح اور جسم کا رشتہ بحال رکھنا کار دشوار لگنے لگا تھا سمرہ کہیں دھڑکے میں رہتی۔

ایک دن پاپا ایک بزرگ کے مزار پر گئے اس نے للّی کو زبردستی ساتھ لے لیا پاپا آگے بڑھ گئے، اور للّی ایک کونے میں خود بھی ادب سے بیٹھ گئے۔

جو ولی اللہ کی محبت سے روشن رہتے ہیں ان کے لیے ہر پستی بلندی اور ہر اندھیری راہ سورج کے مثل چمکتی منور بنی چلی جاتی ہے اور پاپا اسی کارواں کے مسافر تھے للّی حیرت سے پاپا کا انہماک استغراق دیکھ رہی تھی اور سمرہ للّی کے دل کا حال جاننے کے لیے اس کی سمت متوجہ تھی۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتی ایک مجذوب نے اس کے سامنے آ کے حق اللہ کا نعرہ مارا سمرہ سہم گئی مگر للّی اس مجذوب کو دیکھے گئی لمحہ بھر آنکھوں کے ٹکرانے کا یہ سلسلہ چلا مگر پھر سرسراتے لہجے میں وہ بولا تو لگا ساری فضا اس کی بات سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو۔

"جہاں تو نے دل کھویا وہیں سے ڈھونڈ اسے، دل میں بے شمار راہیں ہیں ٹھیک راہ کو چن لے اب بھی وقت ہے مت بھاگ دنیا کی فانی محبت کے پیچھے، یہ رشتے ناتے کچھ نہیں دیتے کسی نہ کسی موڑ پر چھوڑ دیں گے تجھے، باقی نام اللہ کا ہے تھام لیا اسے تو پھر کبھی نہ تنہائی تنگ کرے گی نہ کوئی دکھ تجھے دکھی کرے گا حق حق......" مجذوب آگے بڑھ گیا اور للّی روئی روئی آنکھوں سے اس مجذوب کے عکس کو تکتی رہی۔ سمرہ نے پکارا تو صرف ہوں کر کے رہ گئی پاپا لوٹ آئے تو دونوں مزار سے باہر آ گئیں۔

زندگی اسی رفتار سے گزرنے لگی اب نہ سمرہ، حسن عمار سے یشم ولی کا پوچھتی نہ للّی سمرہ سے، سب محدود دائروں میں تیر رہے تھے لیکن للّی کے دائرے میں کہیں کشش کے حاصل ضرب میں کچھ ہوا ضرور تھا کہ وہ ہر وقت وضو

بے وضو اللہ کو یاد کرتی رہتی سمرہ نے کتنے دن تو دیکھا پھر ضبط نہ ہوا تو پوچھ بیٹھی للی کچھ ساعتوں تو چپ رہی پھر نرمی سے مسکرائی اور بولی۔

”جس راہ کو میں نے چن لیا ہے نا اب وہاں کوئی دھڑکا نہیں ہے انسان اپنے جیسے انسان سے محبت کرتا ہے، جدا ہونے بچھڑ جانے کا خدشہ کے ہزار ہا دھڑکوں میں بٹ جاتا ہے یہاں تک کہ وہ دل نہیں صرف خوف رہ جاتا ہے مگر اس رب کی محبت میں نفع نقصان کا کوئی ڈر کوئی دھڑکا نہیں، یہ محبت مات میں بھی جیت جیسا مزا رکھتی ہے سمرہ بائی گاڈ۔“

سمرہ اس کی لایعنی باتیں سنتی تو پریشان ہوتی پاپا کو بتایا تو وہ بولے۔

”گھبرانے کی کیا بات ہے اس میں بٹی از پرفیکٹلی رائٹ جو باتیں تمہیں سمجھ نہیں آتیں سمرہ اس کا مطلب یہ تو نہیں ناں کہ کوئی مطلب بھی نہیں ہوگا۔ اس کی سمت بالکل درست ہے اس نے محبت کی سب سے افضل شکل کا انتخاب کیا ہے۔ ہم محبت سے صرف وہی گھسی پٹی محبت مراد لیتے ہیں لیکن محبت کی ایک شکل یہ بھی تو ہو سکتی تھی کہ وہ اس حادثے کے بعد محبت سے متنفر ہو جاتی پہلی جیسی محبت سے الرجک رہنے والی للی بن جاتی مگر اللہ نے اسے گم کردہ منزل نہیں کیا وہ منزل کی تلاش میں دکھائی دیتی ہے مگر سمرہ منزل تو اس کے قدم قدم پر ہے عشق محبت کا آخری درجہ ہے اور محبت عشق کا پہلا مرحلہ ہے اور وہ سب مرحلے ایک ہی جست میں طے کر گئی ہے۔“

سمرہ پاپا کو ٹک ٹک دیکھے جاتی یہ جمع تفریق کے چکر میں پڑے رہنے والے پاپا اندر سے کس قدر مختلف نکلے وہ حیرت زدہ رہ جاتی۔

مگر للی کو حیرت مسرت سے کچھ لگاؤ نہ تھا وہ بس کاسہ عشق گلے میں ڈالے آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی ظفر انکل اس کی خوش الحانی سے کی گئی تلاوت کو سنتے تو سبحان اللہ بھی کہتے مگر جب وہ سر سجدے ہی میں ٹکائے رکھتی سامنے رحل پر قرآن رکھے پڑھتی چلی جاتی تو وہ پاپا کو فون کھڑکا دیتے۔

”عمیر میری بیٹی کا کچھ کرو یار، یہ تو دیوانی ہوگئی ہے ایک سانس میں سمندر پی جانا چاہتی ہے۔“

پاپا اس کا کیا جواب دیتے ہاں جب للی کے قریب بیٹھتے اس سے باتیں کرتے تو ظفر انکل کہتے۔

”ظفر گھبرانے سے کچھ نہ ہوگا للی جتنی پیاسی ہے اس کے لیے سمندر بھی تھوڑا ہے، مگر جس کے ساتھ رب کی خوشنودی اور کرم ہو اس کی روح خود بخود جذب کرتی جائے گی سمرہ واقعی انسان کتنے خسارے کا سودا کرتا ہے کہ اس کی نعمتوں کو حاصل کرتا چلا جاتا ہے مگر پھر اسے اپنی قوت بازو اپنے دل پا در کا ثمر سمجھنے لگتا ہے نعمتوں کو جھٹلانے کا گناہ کرتا ہے ربا کار بن جاتا ہے کچھ فیض مل جائے اسے اپنی ریاضت سے، تو اسے اپنے فخر اپنی تکریم میں استعمال کر ڈالتا ہے جس نے دیا ہے اسے بھول کر کہتا ہے میں ہوں نا اس راہ میں حرف آخر مجھے تسلیم کر لو یہ مت پوچھو کہاں سے آیا یا کس نے دیا۔“ حسن عمار کو اس کی باتیں بتائیں تو اس نے تاسف سے ہاتھ ملے۔

”للی شروع سے مختلف ہے سمرہ، وہ جب محبت نہیں کرتی تھی تب بھی لگتا تھا ہر وقت محبت میں ہی دھڑک رہی ہے محبت اور نفرت کے درمیان کہیں اٹک رہی ہے مگر ہیشم سے ملنے اور بچھڑنے نے تو اسے اچانک ہی محبتوں کے عظمتوں پر جا کھڑا کیا اس لیے کہ وہ اندر سے پانی کی طرح سادہ تھی، محبت نے جس رنگ میں چاہا ڈھال لیا جیسے سفید ململ کا دوپٹہ کسی رنگ میں رنگو وہ وہی رنگ اپنا لیتا ہے اپنا رنگ فنا کر لیتا ہے باقی دوسرے اپنا کہیں نہ کہیں دکھا ہی

دیتے ہیں، کسی نہ کسی چیز کی تو ان کے اندر کمی ہوتی ہے۔

مگر سمرہ تمہاری یہ دوست تو پوری کی پوری عبادت ہوگئی ہے کاش ہیثم عقل سے کام لے لیتا تو للّی جیسی لڑکی اس کی زندگی میں روشنی کی طرح بکھر کر اس کی ہر کمی تشنگی کو دور کر دیتی مگر وائے افسوس کہ ہیثم نے اس ہیرا جیسی لڑکی کی قدر نہ کی۔" حسن عمار نے چپ ہو کر سمرہ کو دیکھا تو بولی۔

"للّی پہلے ہیثم کے لیے دیوانی تھی مگر وہ اللہ کی طرف جب سے رجوع ہوئی ہے ہیثم کہیں بالکل پس منظر میں چلا گیا ہے بلکہ اس میں کہیں بھی نہیں ہے۔"

"ہوتا ہے ایسا ہوتا ہے جب کوئی انتہا سے بھی زیادہ چاہے تو اس کی شدت کی انتہا بھی بہت بے معنی سے نقطہ پر ہوتی ہے گو وہ بے معنی سا نقطہ ہوتا ہے مگر سمرہ یہی درحقیقت اس کی ذات کے عرفان کی سمت راستہ دکھانے والا پیمانہ ہوتا ہے پھر راہیں خود بخود روشن ہوتی چلی جاتی ہیں۔"

"ہوں تم ٹھیک کہتے ہو مگر حسن تم تو للّی سے ملے بھی نہیں اتنے ڈھیر سارے دنوں سے مگر میں دیکھتی ہوں تم بالکل للّی کی طرح مختلف باتیں کر رہے ہو کہاں سے حاصل کر لیا اتنا گیان۔" وہ ہنسا پھر بولا، کہیں لکھا تھا۔" یہ سنئے دور کا گیان تھا اگلے وقتوں کے گوتم نے اپنے گیان کے لیے ضروری سمجھا کہ وہ آبادیوں اور بستیوں سے دور جا کر برگد کے پیڑ تلے بیٹھے اور انسان سے دور رہ کر انسان کے المیے اس کے تعلق پر غور کرے مگر آج کے گوتم کو بدھی یعنی اپنے اندر کی روشنی کے لیے برگد کی ضرورت نہیں کہ اس کا ہر برگد اس کے اندر موجود ہوتا ہے تناور اور صدیوں پرانا برگد، ضرورت فقط تلاش اور باطن کی آنکھ کی ہے جو آج بھی کمیاب ہے اس وقت بھی نایاب تھی۔"

یہ جو اس ظاہری خول کے اندر ہماری روح ہے یہ ہمارا دل جہاں صاف شفاف سچ ہو تو سب کچھ آئینے کی طرح سے دکھائی دیتا ہے مگر یار یہ باطن کی آنکھ واقعی کامیاب ہے۔"

"واؤ تم تو مجھے للّی کا انلارجمنٹ لگنے لگے ہو حسن کہیں تم بھی تو چوٹ نہیں کھائے ہوئے۔" سمرہ نے شوخی سے دیکھا تو حسن عمار کی براؤن آنکھیں اس پر جم گئیں اور کہنے لگا۔

"میں ابھی اتنا بلند نہیں سمرہ کہ للّی جیسی باتیں سوچوں وہ تو محبت میں فنا ہوگئی ہے میں تو ایک عام سا انسان ہوں کچھ دنیادار اور تھوڑا دین دار رہی چوٹ کھانے والی بات تو اسٹوپڈ گرل تم سے مل کر کس کم بخت کا دل ہوگا جو سلامت رہے گا۔"

"اتر آئے نا انہی عام سی باتوں پر جو سطحی محبت میں ہر کوئی کہتا ہے اتنی ہی دردمندی اخلاص سے۔" سمرہ جل کر بولی، حسن عمار ہنس دیا اس کے غصے پر۔

جنید بھائی ہمیشہ کی طرح ہیثم پر غصہ اتار رہے تھے جب سے للّی والا واقعہ ہوا تھا کوئی بھی اس سے صحیح بات نہیں کر رہا تھا سوائے کامران ہمدانی کے، آج کل ممی بھی اس سے خفا تھیں للّی انہیں بھی بہت پسند آئی تھی مگر ہیثم نے وہی پرانی ڈگر چن لی تو سب طرف سے ناراضگیوں کے در کھل گئے ایک ہفتہ پیشتر پاپا نے بھی اس کو دفتر میں بلا کر خوب ڈانٹا تھا وہ وہاں بھی چپ رہا تھا وہ اپنے دفاع میں کچھ بھی نہ کہتا تھا اس لیے سب کا غصہ سوا ہوتا جاتا تھا

سو آج بھی بات ایک پینٹنگ سے شروع ہوئی تھی ہیثم نے محبت کے سمبل کے طور پر ایک دل پورٹریٹ کیا تھا

اور اس دل سے جھانکتا چہرہ لگی سے کچھ نہ کچھ مشابہہ تھا بس جنید بھائی اسی بات پر ہتھے سے اکھڑ گئے، کتنی دیر تک غصہ ضبط کرتے رہے پھر بولے تو ہیثم کا سر جھک گیا۔

"تم ہیثم درحقیقت تمہیں یہ آرٹ کی فیلڈ کہیں سے بھی سوٹ نہیں کرتی یہ تو بڑے حساس اور محبت والے لوگوں کے کام ہیں مجسمے بنانا شاعری کرنا پورٹریٹ بنانا مگر تم محبت کے علاوہ سب کچھ بہت آسانی سے کر سکتے ہو تمہیں تو تاجر ہونا چاہیے تھا دو دو چار ضرب دے کر ہمیشہ اپنے مطلب اور پسند کا ہندسہ نکالنے والوں میں سے، محبت جیسا گھاٹے کا سودا تمہارے مزاج سے کہیں میل نہیں کھاتا مگر تم نے محبت کر دکھائی۔

لیکن مجھے خوشی ہے تم نے ہماری یہ بے یقینی زیادہ عرصے قائم نہیں رہنے دی۔ ہیثم۔" جنید بھائی کا بس نہیں چل رہا تھا وہ ہیثم کو اس فعل پر کیا سمجھاتے، مجبور تھے وہ اپنی محبت کے ہاتھوں اس لیے ہیثم نے بھی صوفے پر بیٹھ کر آنکھیں موند لیں جنید بھائی کچھ دیر تو اسے دیکھتے رہے مزید کچھ کہنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ کامران ہمدانی کافی کا کپ لیے اندر داخل ہوئے۔

"یہ لو ہیثم بیٹا تمہاری ممی نے تمہارے لیے کافی بھجوائی ہے۔" ہیثم نے آنکھیں کھول کے دیکھا پھر بنا حجت کے کافی کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ حسن عمار اندر گھستا چلا آیا۔

"ویری گڈ مجھے اس وقت کافی کی شدت سے طلب ہو رہی تھی تھینکس ماموں جی۔" حسن عمار نے کپ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا ہیثم نے تیزی سے کپ کامران ہمدانی سے اچک لیا۔

"یہ کافی ممی نے صرف میرے لیے بنائی ہے۔"

"ارے واہ تمہاری ممی کوئی نرالی ہیں وہ وہ میری آنٹی بھی ہیں لاؤ ادھر یہ کافی۔" وہ چیخا ہیثم نے تیزی سے کافی لمبے گھونٹ میں حلق سے اتار لی تھی اس لیے حسن عمار اس سے سخت خفا ہو رہا تھا۔

"ایسے ہوتے ہیں دوست ارے ہم نے تو تاریخ میں پڑھا تھا کہ اچھے وقتوں کے دوست اپنے آگے کی چیز اٹھا کر اپنے دوست کی طرف بڑھا دیتے تھے خود بھوکے رہتے مگر دوست کو گرم دسرد ہوا بھی نہیں لگنے دیتے، دل جان سے کچھ لٹا دیتے مگر ہیثم ولی تم نے ایک کافی کے کپ کے لیے اگنور کیا اپنے دوست کو۔" وہ فلمی ہیرو کی طرح غمگین صورت بنا کر اس کے قریب بیٹھ گیا جنید بھائی اکی آمد کے فوراً بعد ہی جا چکے تھے اس لیے حسن عمار اور وہ دونوں ہی تنہا تھا بلکہ صرف کمرہ میں حسن عمار ہی تھا کیونکہ ہیثم تو ہونے کے باوجود ناموجود تھا۔

حسن عمار اس سے باتیں کیے جا رہا تھا اتنے ڈھیر سارے دن ناراض رہنے کی سوری کر رہا تھا بتا رہا تھا کہ لگی کی شخصیت اسپر اتنی حاوی ہو گئی تھی کہ اس کا دل اسے کسی طرح معاف ہی نہیں کر رہا تھا لیکن پتہ نہیں کل سے کیوں اسے اس کی طرف سے بے چینی ہو رہی تھی جیسے اسے اس کی ضرورت ہو سو وہ ہر خفگی بھلا کر چلا آیا ہیثم حسن عمار کی ایک ایک بات سن رہا تھا مگر کافی کے بعد اس کا جسم کچھ دیر کے لیے پھر یکدم بے جان ہو رہا تھا بولنے جواب دینے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا اور حسن عمار سمجھ رہا تھا جیسے وہ ابھی تک اس سے ناراض ہے سو وہ اس کے قدموں میں آ بیٹھا۔

"پلیز یار غار سوری آئندہ میں کسی کی طرف سے شریک نہیں ہوں گا میں تو صرف تیرا دوست ہوں نا۔" ہیثم نے آہستگی سے صرف سر ہلایا پھر کمزور سی آواز میں بولا۔

"حسن بیڈ پر لیٹنے میں میری مدد کرو۔"

"کیا مطلب تمہاری طبیعت۔" وہ بوکھلا گیا اس کے چہرے کی پیلاہٹ سے، اور وہ اسی طرح مطمئن اسے دیکھتا رہا۔

"میں ٹھیک ہوں بس چند گھنٹوں بعد خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گا تم صرف مجھے لٹا دو۔" حسن عمار نے اسے سہارا دے کر اسے بیڈ پر لیٹنے میں مدد دی اس نے آنکھیں موند لیں ہولے ہولے کراہنے لگا حسن عمار اس کے کراہنے سے گھبرائے جا رہا تھا مگر کب تک آخر اٹھا سیدھا ممی کے کمرے میں جا پہنچا ممی میگزین دیکھ رہی تھیں بظاہر ورنہ آنکھیں اور دماغ تو شاید ان کا کہیں اور ہی مرکوز تھا اس لیے اس کی چونکتی آواز پر چونکیں۔

"ارے حسن آیا ہے کب آئے بیٹا۔"

"تھوڑی دیر پہلے آنٹی، آپ میرے ساتھ ہیشم کے کمرے میں چلیں گی۔" وہ ہولے سے بولی ممی نے نفی میں سر ہلا دیا تو حسن عمار نے گھبرا کے ممی کو دیکھا پھر تیزی سے بولا۔

"وہ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہا ممی، یوں لگ رہا ہے ممی، یوں لگ رہا جیسے اس کی پھر طبیعت خراب ہو رہی ہے۔"

"کیا مطلب......" ممی بے قراری سے اٹھ کھڑی ہوئیں اس کے کمرے میں پہنچیں تو وہ تکیے پر اوندھا لیٹا سینے کو دبا رہا تھا سسکیاں بھینچ رہا تھا کہ کسی کو خبر نہ ہو۔

"ہیشم کیا ہوا میری جان۔" ممی نے بے تابانہ اسے سیدھا کیا وہ دھندلی آنکھوں سے انہیں دیکھتا رہا پھر جیسے نیند میں بولا۔

"ممی یہ تو فاؤل ہے نا جب میں خود مر جانے کو تیار تھا تو اتنی جلدی کیوں کی آپ نے، ممی کچھ دن اور تو اپنے آنچل کی ہوا میں رہنے دیا ہوتا کچھ اور دن تو اپنی ممتا سے سیراب کیا ہوتا ممی یوں نہیں کیا ہوتا آپ نے، میں تو بہت تشنہ رہا ہوں نا ممی آپ کی محبت کا بائی گاڈ اسی طرح چنگی چنگی سم پلاتی رہتیں ایک دم سے کیوں ممی آپ نے یہ کیوں کیا میں آپ کے لیے جیتا تھا ممی آپ کے لیے مر بھی جاتا مگر اتنی جلدی تو نہ ہوتا یہ سب ممی۔" وہ بلک پڑا ممی نے اسے بازوؤں میں بھر کر سینے سے بھینچ لیا پھر چلائیں۔

"حسن ایمبولینس کو بلاؤ۔" حسن دوڑتا ہوا باہر نکل گیا اور وہ ممی کے سینے سے آنکھیں رگڑتا رہا کبھی ہلکی سسکی لیتا کبھی چیخ کر ممی میں اور جذب ہونے لگتا۔

"میں آپ سے نہیں بچھڑنا چاہتا ممی ابھی تو بالکل بھی نہیں پلیز مجھے روک لیں نا، آپ کہیں اللہ سے وہ مجھے کچھ دن اور آپ کے پاس رہنے دے، ممی وہ تو ماؤں کی بہت سنتا ہے نا۔ پلیز ممی۔" روتی روتی آنکھوں سے اس نے ممی کو اور بھینچ لیا اور ممی دیوانوں کی طرح چلائیں۔

"کیا لیا تھا تو نے ابھی۔"

"کافی، آپ نے ماسوں جی کے ہاتھ کافی بھجوائی تھی نا۔"

"میں نے نہیں میں نے تو تجھے کب سے......" ممی جملہ ادھورا چھوڑ کر بے قراری سے رونے لگیں حسن عمار واپس لوٹ آیا ہونق سا۔

"میں نے فون کر دیا ہے آنٹی، یشم اب کیسا محسوس کر رہے ہو تم۔" حسن عمار نے اس کے چہرے سے بال ہٹا کر بے قراری سے پوچھا، یشم نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا پھر بولا۔

"للی سے میری طرف سے معافی مانگ لینا کہنا یشم اسی کا تھا اسی کا رہا۔"

"پاگل ہو گئے ہو تم ایسی باتوں سے فائدہ جو کہنا ہے خود ہی کہہ دینا تمہارے کہنے میں کچھ اور بات ہو گی۔"

امید سے اسے دیکھا کچھ کہا نہیں اور حسن عمار کو تو اس کی ناامیدی ہو رہی تھی اور ممی تو بس اسے بھینچے روئے جا رہی تھیں کبھی کوئی سورت پڑھ کر پھونکتیں کبھی کوئی اور وہ تڑپ سے چلاتا۔

"کچھ اور پڑھو ممی مجھے بہت تکلیف ہے جیسے کوئی رگوں کو کاٹتا چلا جا رہا ہے ممی کچھ اور پڑھو نا۔" حسن عمار جلے جیر کی بلی بنا بار بار بالکونی سے باہر گیٹ کی طرف جھانکتا پھر یکدم ایمبولینس کی شکل دکھائی دی تو وہ تیزی سے باہر کی طرف دوڑا منٹوں میں یشم ولی کو پہلے تو گھر ہی میں طبی امداد دینے کی کوشش کی گئی اور پھر فوراً ہاسپٹل کے لیے روانہ کر دیا گیا حسن عمار ساتھ گیا تھا یشم نیم غنودہ سا ہو رہا تھا اس لیے ممی کے لیے اس نے ضد نہیں کی اور ممی اس کے کمرے میں بے حال لٹے لٹے انداز میں بیٹھی رہ گئیں۔

کتنی دیر تک یشم کی سسکیاں ان کے نالے ان میں موجود تڑپ گونجتی رہی پھر انہوں نے اپنی آنکھیں رگڑیں کسی زخمی ناگن کی طرح اٹھیں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں بیڈ پر کوئی بے سدھ پڑا ہوا تھا سگریٹ کے دھوئیں سے سارا ماحول مکدر ہو رہا تھا ممی اسی جلال سے آگے بڑھیں پھر چلائیں۔

"کامران۔" کامران ہمدانی نے آنکھیں کھولیں سرخ انگارہ سی آنکھیں پھر وہ سرور میں بولا۔

"آج آپا تمہیں میرا خیال کیسے آ گیا۔" ممی نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے اٹھایا پھر گریبان پکڑ کر چلائیں۔

"یہ تو نے کیا کیا......" "میں نے کیا کیا آپا۔ اس نے خالی الذہنی سے دیکھا پھر کچھ یاد آیا تو پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کر کے شیطانیت سے ہنسا پھر بولا۔

"میں نے جو کیا وہ ٹھیک کیا آپا، تم تو برسوں سے بس چٹکی چٹکی بھر دے کر اسے مار رہی تھیں نہ اسے فائدہ تھا نہ ہمیں، اس لیے میں آج سوچا کیوں نہ میں ایک ہی دفعہ۔"

"کامران وحشی بے درد تو، تو انسان نہیں درندہ ہے، درندہ۔" ممی نے کامران ہمدانی کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی اور وہ یوں سر کھجاتا رہا جیسے تختہ مشق کوئی اور ہو پھر کافی دیر بعد بولا۔

"آپا تم زیادتی کر رہی ہو مجھ سے، تم مجھے برا کہہ رہی ہو تو تم کون سی پارسا ہو تم بھی تو یہی کر رہی تھیں اتنے عرصے سے تھوڑا تھوڑا چٹکی چٹکی دے کر اس کی قبر بنا رہی تھیں۔"

"ہاں ہاں میں نے بھی یہ کیا مگر مجھے اس ذلیل کام میں لگایا بھی تو تو نے تھا، اچھا بھلا تھا میرا گھر تو نے میرے گھر میں شک نفرت کا بیج بویا محبت میں سیندھ لگائی کاش میں عورت بن کر نہیں ماں بن کر سوچتی تو آج یہ نہ ہوتا کامران تو نے میرے ہیرے جیسے بیٹے کو میرے ہی ہاتھوں چٹکی چٹکی زہر دلا کر مجھے دنیا کی اور اپنے رب کی نگاہ میں ذلیل و خوار کر دیا کتنا سادہ، کتنا معصوم تھا میرا بچہ کہ میرے ہاتھ سے زہر خود میں اتارتا رہا، آج تک شکوہ نہیں کیا۔

مجھے پتہ ہے وہ جانتا تھا کہ کافی میں کیا ہوتا ہے مگر وہ پھر بھی پی لیتا تھا جس دن میں بھول جاتی خود مانگتا

میرے ہاتھ کانپ جاتے مگر میرے اندر کی لالچی دولت کی طمع میں گرفتار عورت مجھے پتھر بنائے رکھتی مگر میں نے جب لبنیٰ کو دیکھا تھا تب سے میرا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی جنید جواد کی طرح خوش رہے مگر تجھ سے میری یہ چھوٹی سی اچھائی برداشت نہ ہوئی تو کافی، بیتے وقت میرا نام استعمال کرتا رہا کامران تو تو واجب القتل ہے۔

میں واجب القتل ہوں ہم کہ جو رشتوں کو بھوکے کتوں کی طرح بھنبھوڑتے رہے ایک کتا بھی دوسرے کتے کا گوشت نہیں کھاتا مگر ہم انسان ہم تو ان سے بھی گئے گزرے ہیں کامران میں کیا کروں میں ہاسپٹل جانا چاہتی ہوں مگر مجھ میں ہمت نہیں ہے اس کے سوالوں کے جوابات دینے کی اس کی حسرت زدہ آنکھوں کے دیکھنے کی تو نے تو نے کہیں کا بھی نہ رکھا کامران کہیں کا بھی۔"

ممی نے زور سے کامران ہمدانی کو اس کے بیڈ پر دھکا دیا تو وہ پھر الجھے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر ہنسنے لگا ممی نفرت سے اسے دیکھتے ہوئے باہر نکلیں تو چکی پڑ گئیں باہر جنید ستارہ ایک ساتھ سنگی مجسمے کی طرح کھڑے تھے۔

کتنا بڑا امتحان تھا یہ کہ وہ ہر ایک کی نظر میں مجرم تھیں مگر ان کے پاس اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے نہ کوئی دلیل تھی نہ جواز سو ممی نے نم آنکھیں اوپر اٹھائیں پھر بولیں۔

"مجھ سے نفرت کرنا تمہارا حق ہے تم حق بجانب مجھے اپنے اس جرم سے انکار نہیں اب صرف تم ہی نہیں میں خود بھی اپنے آپ سے نفرت کروں گی۔" ساڑھی سنبھالتی ہوئی ممی آگے بڑھ گئیں وہ دونوں بھی ایک ساتھ ہاسپٹل پہنچے حسن عمار کے ساتھ بھائی کا دوست ڈی ایس پی حماد جعفر بھی کھڑا تھا اور ممی مجرموں کی طرح سر جھکائے ہوئے تھیں ایمرجنسی روم کا دروازہ بند تھا جنید بھائی نے آگے بڑھ کر صورت حال پوچھی تو جواد بھائی کی آواز بھر آئی۔

"ڈاکٹر محسن کا خیال ہے کسی نے انہیں سنکھیا کی ایک بڑی مقدار کسی لیکوڈ چیز میں پلائی ہے وہ کہہ رہے تھے کہ ان کے خون کے اور دیگر ٹیسٹ میں اس سے پہلے بھی اس قسم کے اجزا دریافت ہوئے تھے ڈاکٹر محسن نے ان سے کمپلیٹ علاج کا کہہ کر یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے اردگرد سے ہشیار رہیں کوئی ان کی جان کا دشمن ہے لیکن وہ اس دن کے بعد ڈاکٹر محسن کے پاس چیک اپ کے لیے آئے ہی نہیں اور اب ڈاکٹر کہتے ہیں اتنے عرصے مزید گزر جانے اور یکدم ہی ان کا اعصابی نظام بشمول دل جو پہلے ہی کمزور ہو چکا تھا ایک دم ڈیج ہو گیا ہے ڈاکٹر اپنی سی کوششوں میں مصروف ہیں مگر۔"

"ممی اگر اسے کچھ ہو گیا تو۔" جواد بھائی ممی کے کاندھے سے سر لگا کر رونے بھی لگے اور ممی گم صم کھڑی رہیں بے جان سے اور ستارہ، جنید کی جلتی آنکھیں ممی پر ہی مرکوز رہیں حسن عمار کی آنکھوں میں بھی ممی کے لیے شکوہ تھا مگر ممی کسی سے کچھ بھی نہ کہہ رہی تھیں۔ خاموش کھڑی تھیں اور وہ سب کسی معجزے کے منتظر ایمرجنسی روم کا دروازہ کھلنے کے منتظر تھے یہ جانے بغیر کہ یہ معجزوں کا دور نہیں یہ تو کل یگ تھا جہاں رشتے ناتے اپنی پہچان کھو رہے تھے بلکہ کبھی کے کھو رہے تھے مگر پھر بھی مطمئن تھے، جانے کیوں۔

☆

لبنیٰ پہلے تو صرف استغراق کی کیفیت میں خاموش بیٹھی رہتی تھی، مگر اب اس کا ہر موئے تن اللہ کی حمد وثنا میں مصروف رہتا تھا۔ محبت ذاتی فنا کی علامت تھی اور وہ واقعی اس محبت میں فنا ہو رہی تھی اسے اب اپنے لیے کچھ طلب نہ تھا، طلب تھا الٰہی مشک وعنبر سے لبریز کہ جو ڈوب جاتا اس کی رگ رگ میں یہ خوشبو دیے کی طرح جل اٹھتی، صندل کی طرح

جل جل کر اور زیادہ مہکیلی ہو جاتی تھی اور للّی کا وجود اب صندل میں ڈھل گیا تھا۔

ظفر انکل بھی پاپا سے کہتے۔

"جمیر یہ میری بیٹی کو کیا ہو گیا ہے۔" تو وہ کہتے۔

"دنیا وہ سرکش گھوڑا ہے کہ دام لگا کر خریدو تو مالک کو پٹخنیاں دے دے کر ادھ موا کر دیتا ہے نظر بھی نہ ڈالو تو قدموں میں ڈھیر ہوا جاتا ہے اپنی پیٹھ پر سواری کروانے کے لیے پریشان ہوتا ہے لالچ دیتا ہے مگر ظفر جنہوں نے دنیا سے زیادہ اچھا سودا خرید لیا ہو وہ ان داؤ گھات میں نہیں آتے ظفر انکل ان کی باتیں سنتے مگر باپ تھے اکلوتی بیٹی کے سو بدحواس سے ڈاکٹروں سے رجوع کرتے پھرتے۔

"میری بیٹی نارمل نہیں ہے عجیب عجیب باتیں کرتی ہے کوئی دوا دیجیے۔" ڈاکٹرز چیک اپ کرتے اور کہتے۔

"آپ کی بیٹی بالکل نارمل ہے ہر قسم کے نفسیاتی ٹیسٹ کا رزلٹ آیا ہے آپ گھبرانا چھوڑ دیجیے آپ کی بیٹی کو کوئی دماغی عارضہ نہیں ہے ہاں بس وہ عام انسانوں سے مختلف اپروچ رکھتی ہے اور بس۔"

"اور بس" ظفر انکل اور بس کے بعد کی پریشانی اپنے اندر اتارتے رہے پھر پاپا ان سے تنہائی میں ملتے تو سمجھاتے۔

"جو ملتا ہے اسے جذب کرنا سیکھو للّی یوں خود کو بکھیرو مت جو چیز جذب نہ کی جائے وہ جلد ادھر ادھر بٹ جاتی ہے مجھے دیکھو میں نے دنیا بھی کی اور اللہ کے آگے بھی سر جھکائے رکھا سمرہ کی محبت میں بھی ڈوبا، مگر للّی اپنی بیٹی کی محبت کی شدت میں بھی مجھے اللہ یاد رہا، ہاں یہ اور بات تھی کہ دنیاوی محبت میں مجھے خوف نے کبھی سکون سے سونے نہیں دیا یہ میری خامی تھی مگر للّی انسان وہی ہے جو اپنی ناکامیوں کا اعتراف کرنے۔ انہیں خود سے بھی دور کرے اللہ تمہیں ہر جگہ ملے گا للّی خود کو یوں در در مت بھٹکاؤ للّی سنتی رہتی کہتی کچھ نہیں۔

دن یونہی گزر رہے تھے کہ ایک دن ظفر انکل کو سرِ راہ ایک فقیر نے روک لیا ظفر انکل نے پاکٹ پرس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ اپنا کاسہ فضا میں بلند کرتے ہوئے حق حق کا نعرہ مارتے رہے سرخ آنکھوں سے انہیں گھورنے لگے پھر بولے۔

"یہ کاسہ تیرے لیے نہیں اس رب کے سامنے پھیلا رکھا ہے جہاں جہاں سے جو ملتا ہے اس کے حکم سے سمیٹ لیتا ہوں تیری طرح لوگ ان کاغذ کے ٹکڑوں سے اسے بھرنا چاہتے ہیں مگر بندہ خدا یہ تو پہلے ہی اتنا بھرا ہوا ہے کہ اس میں جگہ نہیں اور جگہ ہوتی بھی تو کچرہ گناہ اکٹھا کرنا اللہ کے بندوں کا مسلک نہیں۔

یہ تو دنیا کا قہر ہے جسے ہم سب اپنی گردنوں میں لٹکائے پھرتے ہیں اطلس و کمخواب ہو یا کھردری سنگلاخ زمین سب کو ایک ہی جیسی نیند اور ایک ہی جیسے خواب آتے مگر ہم اللہ کے اس انصاف کے باوجود بھی اس سے جھگڑتے اپنی قسمت کا شکوہ کر کے ناشکرا پن کرتے ہیں رکھ یہ رکھ جیب میں فقیر اور گداگر میں فرق کرنا سیکھ حق حق۔" وہ آگے بڑھنے لگے تو ظفر انکل نے ان کے بھیگے کرتے کا دامن تھام لیا پھر بولے۔

"میری بیٹی کا کیا ہوگا؟" فقیر نے پھر اسی طرح ظفر انکل کو دیکھا پھر بولے۔

"یہ بات رب سے پوچھ مجھ گنہگار، کم ذات، حقیر ذرہ سے کیا پوچھتا ہے قبلہ درست کر انسان کے پیچھے مت بھاگ انسان سے انسان کو خود کچھ نہیں ملتا جب تک وہ رب کسی کو وسیلہ نہ بنائے کسی کے دکھ کی دوا کسی اور کے پاس ہو تو

اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حرف آخر شخص ہے وہ دوا اس رب ہی نے اس میں انڈیلی تھی تبھی اس میں سچائی آئی بندے کی کیا مجال کہ خود کسی کا مداوا یا کسی کی مسیحائی کر سکے۔“

پھر بھی بابا جو لوگ اللہ کے نام پر اسکی راہ میں فنا ہو جاتے ہیں انہیں کچھ نہ کچھ تو کشف ہو ہی جاتا ہے پلیز مجھے میری بیٹی کے بارے میں کچھ بتائیے میں پریشان ہوں۔“ فقیر نے آنکھیں بند کریں کتنے ہی لمحے استغراق کی کیفیت میں رہے سارا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا تب تیز تیز سانسوں کے بیچ انہوں نے آنکھیں بند کئے کئے ہی بتایا۔

”تیری بیٹی اب تیری نہیں رہی، وہ راہ حق میں فنا ہو گئی ہے تیرے گھر کی دیواریں اب اس کے جنوں کو زیادہ دیر تک قابو میں نہیں رکھ سکیں گی وہ دنیا میں ہوگی مگر تیری نگاہ سے دور، ابھی وہ جذب کرتی ہے مگر سمندر اس کے اطراف دل سے چھلک چھلک جاتا ہے وہ جتنا پیتی ہے اس کی پیاس اتنی بڑھتی چلی جاتی ہے اور یہی پیاس زیادہ دیر اسے پتھر اور اینٹ کی سرائے میں روک نہیں سکے گی اس نے تیری نظر سے دور جانا ہے اور جانا ہی تھا کہ سب میں دین اور دنیا کے بندھن میں رہ کر زندگی گزارنے کی قوت برداشت نہیں ہوتی حق حق باقی جانے اللہ حق حق۔“

فقیر آگے بڑھ گیا تو ظفر انکل وہیں ہت کے بت بنے رہ گئے انہوں نے سوچا بنجارن جوگی تو وہ بچپن ہی سے تھی ساری دنیا کی خاک اڑاتی پھرتی تھی زندگی کا کتنا کم عرصہ وہ اس کو دیکھ سکے اس کو چھو سکے بس ہوا یہ ہے کہ ماضی پھر سے ری پلے ہو رہا ہے پہلے وہ گمنام منزل کے لیے پھرتی تھی اب منزل جان کر اس منزل کو پانے کے لیے جوگن بن گئی ہے مگر محبت کا کتنا مختصر وقت رہا اس کے پاس۔

وہ آنکھوں کی نمی صاف کرتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تو سامنے ہی سمرہ پاپا حسن عمار کے ساتھ بیٹھی تھی اس کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو رہی تھیں ان کا دل جسم کے پنجرے میں مقید پنچھی کی طرح دھڑکا پوری قوت سے اور انہوں نے صوفے کو تھام کر ضبط سے پوچھا۔

”خیریت کیا ہو گیا سمرہ بیٹا۔“ سمرہ سے جواب نہیں دیا گیا تو پاپا بولے۔

”ہشم ہاسپٹل میں ہے ابھی حسن آئے تو ہمیں پتہ چلا کتنے دنوں سے ہم ہشم کی طرف سے لاپروا تھے۔“ ظفر انکل کا ردعمل تو شدید ہونا چاہیے تھا کہ اس ہشم نام کے شخص نے ان کی بیٹی کی زندگی کو ناشاد کیا تھا مگر لڑکی کی جدائی کی غمی نے ان کا دل نرم کر دیا تھا آپ ہی آپ ان کا دل پگھل کر آنکھوں سے بہہ جاتا تھا وجہ بے وجہ آنسوؤں میں ڈھل گئی تھیں اور وہ نرمی سے بولے۔

”ہوا کیا تھا ہشم کو تم تو وہیں سے آ رہے ہو نا حسن۔“ وہ صوفے پر بیٹھ گئے تو حسن نے سر ہلایا۔ پھر ہشم کا بیان جو کہ اس نے چند گھنٹوں بعد ہوش میں آ کر دیا تھا بتانے لگا۔

”ہشم اور میں ایک ریستوران میں کافی پینے گئے تھے کافی کے بعد اس کی طبیعت کچھ مکدر ہو گئی تو میں اس کے کہنے پر اسے گھر لے آیا مگر ذرا سی دیر میں اس کی حالت ہی بگڑ گئی تو اسے ہاسپٹل لے جایا گیا وہاں پتا چلا اسے کسی نے سلو پوائزننگ کافی میں ملا کر پلا دی تھی ڈاکٹرز کا خیال ہے یہ اسے کافی عرصے سے کوئی مسلسل دے رہا ہے ہشم نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا اس بات سے کیوں کہ وہ ہمیشہ مختلف ہوٹلز میں کافی پینے کا عادی ہے اس نے کسی پر شک بھی ظاہر نہیں

کیا کہتا کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ کون میری جان کا دشمن ہے پولیس نے نامعلوم ملزموں کے خلاف ایف آئی آر درج کر کے تفتیش شروع کر دی ہے۔"

"ہیشم کی طبیعت اب کیسی ہے۔"

"فی الحال تو ٹھیک ہے وہ دراصل للی سے ملنا چاہتا ہے اس لیے میں انکل اور سمرہ آئے ہیں یہاں اگر آپ اجازت دیں تو۔"

"میری اجازت چھوڑو للی سے پوچھو اگر، وہ راضی تو۔" حسن عمار پریشان ہو گیا۔

"للی سے میں بات کر چکا ہوں مگر وہ کہتی ہے ہیشم کون ہے میں نہیں جانتی۔"

"پھر تم بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں جب وہ ہی اس سے ملنا نہیں چاہتی۔" انہوں نے بے بسی سے دیکھا تو سمرہ نے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا پھر بولی۔

"اگر انکل آپ اس سے کہیں تو وہ آپ کی بات نہیں ٹالے گی۔"

للی نے انہیں دیکھا تو سر پر رکھا دوپٹہ مزید درست کر لیا پاپا نے نظر نیچی رکھی پھر بولے۔

"ہیشم تمہارا ماضی ہے للی ماضی کو اتنی بے دردی سے نہیں کھرچتے صرف ایک بار اس سے مل لو۔"

للی نے نم آنکھوں سے پاپا کو دیکھا پھر آہستگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"بیمار کی عیادت کرنا سنت کی پیروی ہوتی ہے۔"

للی پھر بے زاری سے بولی۔ "آپ مجھے دنیا کی طرف کیوں کھینچتے رہتے ہیں انکل۔" پاپا نے سر پر ہاتھ پھیرا پھر آہستگی سے بولے۔

"میں تمہیں دنیا کی طرف نہیں کھینچتا میں تو صرف کہتا ہوں جو تعلق اس رب نے تم سے جوڑ رکھے ہیں تم انہیں بھی تھوڑا بہت سنبھالو تارک الدنیا ہو جانا ہمارے اسلام میں بھی ممنوع ہے نفس پر غالب آنا یہ سب دنیا میں رہ کر بھی کیا جا سکتا ہے۔

مگر انکل میں خام ہوں ابھی کندن نہیں میں دنیا اور دین ایک ساتھ نبھانے کی قوت اور صلاحیت نہیں رکھتی اس لیے انکل پلیز چلیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو سب ایک کار میں ہاسپٹل پہنچے ستارہ للی کو دیکھ کر خوب لپٹ کر روئی کی ایک طرف ابھی تک سرسوں کی طرح پیلی بیٹھی تھیں جیسے کسی نے ساری جان کھینچ کر صرف ذرا سی رہنے دی ہو۔

"کیسے ہیں ہیشم بھائی۔" سمرہ، ستارہ سے پوچھنے لگی تو وہ اور بلک کر رو دی سمرہ نے حوصلہ دیا تو بولی۔

"ڈاکٹر محسن کہہ رہے ہیں وہ ہمیشہ کے لیے کوما میں چلے گئے ہیں انہیں اب کبھی ہوش نہیں آئے گا ان کا نروس سسٹم ڈیمج ہو گیا ہے بس تھوڑا تھوڑا وہ دماغ اور دل میں جی رہے ہیں اس لیے ڈاکٹرز نے انہیں مشینز لگا رکھی ہیں سمرہ، میرے ہیشم بھائی سب سے بازی لے گئے ورنہ بھلا کوئی یوں بھی۔" ستارہ ادھورا جملہ کہہ کر چپ ہو گئی تو ممی کی سماعت میں اس کی ڈوبتی ابھرتی آواز بین کر رہی تھی۔

وہ مر رہا تھا مگر پھر بھی اس کی جان ممی میں اٹکی ہوئی تھی ڈاکٹر کہہ رہے تھے آرام کرو اور وہ ممی کا ہاتھ تھامے انہیں اپنی قسم دے رہا تھا کہ یہ سب باتیں پولیس کو نہ پتہ چلیں کامران ماموں کی اسے فکر تھی وہ شخص جس نے ہر ہر قدم پہ

اے اور اس کے باپ کو زک دی وہ اس کے لیے پریشان تھا ان کے کمزور وجود کا دفاع کر رہا تھا کہ کامران ماموں خود ے ایسے نہیں تھے خراب صحبتوں نے انہیں رشتوں محبتوں کی تمیز ختم کرا دی وہ ممی کو بھی الزام نہیں دے رہا تھا۔

"جتنی محبت آپ نے مجھے دی اس کے بدلے اگر تھوڑا سا زہر میں نے اپنے جسم میں اتار لیا تو یہ تو کچھ بھی بدل نہ ہوا ممی میں آپ کی محبتوں کا مقروض ہوں مگر آپ کے لیے کچھ کر نہیں سکتا اس لیے مجھے میری غلطیاں، میرا جنون محبت معاف کر دیجیے گا کہ جو سانس زمین کے نیچے لکھی ہو وہ سانس زمین کے اوپر تو کوئی بھی نہیں لے سکتا نا پلیز ممی سب بھول جائیے گا آپ کی محبت کے بدلے میں نے اپنا خون بہا آپ کو بخش دیا کبھی دوبارہ مت ذکر کیجیے گا ان گزری باتوں کا۔"

جنید جواد اور ستارہ میں مجھے ڈھونڈ لیے گا پیار کیجیے گا آپ کی محبت مجھ تک پہنچتی رہے گی اور۔" وہ اور سے ـگے بھی کہنا چاہتا تھا مگر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور ڈاکٹرز نے ساری محنت صرف کر دی تھی تب وہ پلٹا تھا مگر بس مٹی کی پھر نہ آنے والوں میں سے رہا تھا، نہ جانے والوں میں سے رہا تھا بس بیچ میں کہیں معلق تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔

"ہیشم....." سب کے ہزار بار کہنے پر للی نے بمشکل اسے پکارا مگر وہ ویسے ہی خاموشی میں ڈوبا رہا اور اس کے قریب کھڑی سمرہ کو چند ماہ پہلے کا واقعہ یاد آ گیا جب وہ اسی طرح بیڈ پر لیٹا تو شوخی کیسے اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی اس کے لہجے میں۔

"میں آپ کا انتظار برسوں کر سکتا ہوں آپ اگر ملنے نہیں آتیں نا تو بائی گاڈ میں دوبارہ آنکھیں بھی نہیں کھولتا یہ تو آپ کی خوشبو ہے آپ کی مسیحائی ہے جو میں پھر سے جی اٹھا۔" سمرہ کی آنکھوں میں سمندر آ گیا وہ اس کے تھے پر ہاتھ رکھ کر پکاری۔

"دیکھیے ہیشم بھائی للی آپ سے ملنے آئی ہے آپ آنکھیں کھولیے نا پلیز یہ صرف آپ کے لیے ہی آئی ہے شم بھائی۔" مگر ہیشم میں معمولی سا بھی ردعمل پیدا نہ ہوا شاید کہیں نہ کہیں محبت کی الیکٹرک کیبل میں فالٹ آ گیا تھا جو س کی انرجی اس کی محبت ہیشم کو واپس نہیں بلا پا رہی تھی۔

"للی تم پھر سے کہو دیکھو بھائی کبھی تو سنیں گے۔" للی نے دیکھا پھر سے پکارا مگر کوئی جواب نہ آیا تو وہ انکل کے ساتھ باہر آ گئی پاپا نے اسے دیکھا تو کہا۔

"تم نے للی درحقیقت اسے پکارا ہی نہیں، ورنہ محبت اس قدر کمزور جذبے کا نام نہیں۔" للی نے آنکھیں ٹھائیں پھر آنسوؤں کو ہتھیلیوں سے رگڑ ڈالا اور مدھم لہجے میں بولی۔

"میرا صرف ایک دل ہے انکل اس میں صرف کسی ایک کی محبت ہی سما سکتی ہے، آپ ہی بتائیے کیا آپ مجھے نت میں پھر سے برزخ والی درمیانی کیفیت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔"

پاپا نے بے بسی سے نفی میں سر ہلا دیا پھر وہ سب آگے بڑھتے چلے گئے ہیشم کہیں کسی دریچے سے لگا اب بھی ا کے قدموں کی چاپ سننے کا منتظر تھا مگر وہ تو ہوا کی طرح جا بھی چکی تھی اور ممی اس کے جانے کے بعد پھر سے اس کے کے قریب کرسی ڈال کر بیٹھ گئی تھیں لاحاصل انتظار کرنے کے لیے۔

☆

للی ہاسپٹل سے لوٹی تو بہت گم سم سی تھی ظفر انکل نے اسے ڈسٹرب دیکھا تو پھر سے اللہ سے رجوع کرنے کو

کہا وہ وضو کر کے جائے نماز پر کھڑی ہوئی تو رقت سے اس کی آنکھیں گیلی ہو گئیں۔ اس کی پھر وہی کیفیت تھی۔

اس دن وہ اپنے کمرے سے غائب تھی ظفر انکل کا دل اتھل، پتھل ہو گیا پہلے ہاشم سے بچھڑنے نے اسے اد راہ کا راہی کیا تھا مگر اس کی تھوڑی بہت دنیا کی طرف نظر رہتی تھی مگر اس بار کے بچھڑنے نے تو شاید اسے پورا کا پورا گم کر دیا تھا ظفر انکل کو اس فقیر کی بات یاد آ رہی تھی اور وہ دیوانوں کی طرح اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے پاپا حسن عمار سمرہ گ الگ الگ اسی کام میں لگے ہوئے تھے مگر وہ تو نہ جانے کون سا اسم پڑھ کر غائب ہو گئی تھی کہ کہیں ملی ہی نہیں ایک ہفتے کی تلاش بے سود رہی تو پاپا نے انہیں تسلی دی۔

"سنبھالو خود کو ظفر ملنا ہوگا تو وہ خود آ جائے گی وہ جس راہ چلی ہے خود وہ اب اس کی حفاظت کرے گا۔"

ظفر انکل نے ان کی بات مانی یا شاید نہیں مانی مگر صبر کی سل دل پر رکھ لی۔ یہ اور بات کہ اب بھی ان کا وقت اسے ڈھونڈنے میں نکل جاتا مگر وہ کہیں نہ ملتی یہاں تک کہ للی کا حادثہ ان کی زندگی کا رستا زخم بن کر دل ہی میں کہیں چھپ گیا۔

پھر پاپا نے دو تین برس بعد اچانک ایک فیصلہ کر لیا ظفر انکل سے مشورہ کیا تو وہ رو پڑے۔

"مجھے تم پر رشک آتا ہے، تم اپنی بیٹی کے ہاتھ پیلے کر دو گے اسے خود وداع کرو گے مگر میری للی جانے کہاں کہاں کی خاک چھان رہی ہوگی۔"

پاپا نے دلاسے سے انہیں اپنے قریب کر لیا پھر بولے۔

"جس طرح للی میری بیٹی تھی سمرہ بھی اسی طرح تمہاری بیٹی ہے ظفر، سمرہ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ اسے دعاؤں کے سائے میں رخصت کرنے والے کتنے ہاتھ ہیں وہ تمہاری بھی تو بیٹی ہے ظفر تم غم نہ کرو ہم سمرہ کو بانٹ لیتے ہیں ایک بار وہ تمہارے ہاں ٹھہرے گی اور ایک بار میرے ہاں اب تو خوش ہو جاؤ اولڈ مین۔" ظفر انکل ہنس دیے تو مم ی اور پاپا تیاریاں کرنے چلے گئے سمرہ حسن عمار کے لیے بہترین انتخاب تھی مگر سمرہ اس خوشی میں کچھ ناخوش سی تھی۔

پاپا نے پوچھا تو اسے للی ہاشم اور روشن گوہر یاد آ گئے پاپا کے دل کا درد بھی ان کے چہرے پر نمایاں ہو گیا مگر وہ پھر بھی باحوصلہ رہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

یہاں تک کہ شادی کا خوشگوار دن بھی آن پہنچا وہ ہار سنگھار کیے، سرخ عروسی لباس میں بہار کا جھونکا بنی بیٹھی تھی آنکھوں میں آنسو بھر بھر کر آ رہے تھے بچھڑنے والے ایسے موقعوں پر کیسے کیسے یاد نہیں آتے سو اس کا دل بھی للی ما اور زندگی موت کے درمیان اٹکے ہوئے ہاشم کے لیے ہوک رہا تھا۔

"کاش آج ماما تو آ جائیں۔" اس نے دل سے پکارا دروازے پر دستک ہوئی سفید اور کالے بارڈر کے کنٹراس کلر کی ساڑھی پہنے اونچا سا جوڑا بنائے روشن گوہر یعنی اس کی ماما اس کے سامنے کھڑی تھیں۔

"ماما......" وہ ان سے لپٹ کر خوب روئی اور روشن گوہر اسے ماؤں والی نصیحتیں کرتی رہیں۔

"عورت کا دل محبت کی بدولت جنت ہوتا ہے مگر سمرہ خیال رکھنا اس میں نفس کا شیطان نہ گھسنے پائے ورنہ کچھ بھی نہ بچے گا۔" اس نے اثبات میں سر ہلا کر ان کی یہ بات پلو میں باندھ لی تو پتہ چلا بارات آ گئی دور پرے کی لڑکیاں سمرہ کو تھامے ہوئے اسٹیج کی طرف بڑھ گئیں پھر ایجاب و قبول کے بعد طعام سے فارغ ہو کر وہ رخصت ہو کر

حسن عمار کے پہلو میں بٹھا دی گئی تو اس کا دل خوشی اور غم کی درمیانی کیفیت میں لٹک رہا تھا چہرہ تو حسن عمار کا بھی پر ملال تھا اس موقع پر اسے ہیشم کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی مگر وہ ابھی تک کوما میں تھا اور ممی ڈاکٹر کی ہر تاویل ٹھکرائے جا رہی تھیں۔

"ڈاکٹر بن کر نہیں ماں کے دل سے سوچیں میرا ہیشم ایک نہ ایک دن ہوش میں آئے گا کبھی نہ کبھی تو وہ میری غلطی معاف کرے گا مجھے انتظار کرنا ہے اس کا وہ ایک دن لوٹے گا کبھی نہ کبھی تو۔" اور یہ امید ان کو ایک لمحہ کے لیے بھی ہشم سے دور نہ ہونے دیتی حسن عمار جب بھی جاتا ممی کو بے حال لٹا لٹا سا ہیشم کی پیشانی پر جھکا ہوا پاتا وہ اسے پیار کرتے ہوئے کہتیں۔

"آنکھیں کھول ہیشم دیکھو اب میں صرف تیری ممی ہوں ہیشم آنکھ کھول کر تو دیکھ کتنی ڈھیر ساری محبت ہے جو مجھ میں جمع ہوگئی ہے میں کیا کروں کیسے لٹاؤں اس محبت کو تجھ پر ہیشم میرے بیٹے۔" اور حسن عمار انہیں دیکھے جاتا جنید ملتا بھی تو کہتا۔

"مجھے لگتا تھا میں اس حادثے کے بعد ممی سے کبھی محبت نہیں کروں گا بائی گاڈ حسن مجھے ممی سے نفرت بھی ہوگئی تھی مگر اب میں انہیں جاگتے انہیں روتے بلکتے دیکھتا ہوں نا تو میرا دل پھٹنے لگتا ہے حسن یہ محبت حادثہ کیوں چاہتی ہے خود کو ظاہر کرنے کے لیے۔"

حسن عمار بے حال سے جنید جواد اور ستارہ کو دیکھتا مگر کچھ سمجھ ہی نہیں آتا اسے سو کچھ کہہ نہ پاتا اور ہر روز اسی رح پلٹ جاتا پھر دوسری صبح بڑا سا سرخ گلابوں کا بکے تھامے ہاسپٹل کی سیڑھیاں چڑھتا تو دل میں دعا مانگتا۔

"کاش ہیشم ہوش میں آ گیا ہو۔" مگر دعائیں اس تک پلٹ آتیں اور وہ ان پلٹ آنے والی دعاؤں سے دل ما ہوا پاتا بالکل آج کی طرح کہ زندگی کی سب سے بڑی خوشی اس کی ہمراہ عروسی لباس پہنے بیٹھی تھی مگر وہ پھر بھی دکھی تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں۔" سمرہ نے بہت ہولے سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا حسن عمار نے نگاہیں اس پر ئیں تو وہ بن کہے اس کا دکھ جان گئی اور پھر جب وہ اس کے بیڈروم میں بیٹھی تھی تو اس کا روم روم حسن عمار کے دکھ بوجھل ہوا جا رہا تھا کہیں ذہن میں پاپا کی بات گونج رہی تھی۔

"روشن کہو ہم محبت کے مارے بھی کیا ہیں۔" اور روشن گوہر نے کتنا سچ کہا تھا۔

"ہم محبت کے مارے محض آنسو ہوتے ہیں صحرائے زیست میں آبلہ پا دوڑنے والی آس ہوتے ہیں خواب تے ہیں یا شاید راکھ ہوتے ہیں۔"

سمرہ نے سوچا اور آنکھیں موند لیں۔

لکھو محبت کے مارے بھی کیا ہیں

کبھی بند کمرے کی تنہائیوں میں

کبھی سرد تکیے کی بے مہر اور اجنبی گود میں منہ چھپائے کبھی چاندراتوں میں خالی چھتوں اور سنسان راہوں کی وشی میں بکھرتے شکستوں غضب ناک محرومیوں اور پسپائیوں کے صعوبت کدوں۔

کا عذاب سفر جھیلتے۔

شاعری اور فسانوں کے بستر پہ حیراں نگاہ جمائے
زمانے کی لحات کی اور خود اپنی سلگتی ہوئی ذات کی
وحشتوں کی اماوس میں محصور کوئی عجب اور گمنام ڈر جھیلتے ہیں۔
دلوں میں تمناؤں خوابوں خیالوں کی قربتیں لیے اور بلکتی ہوئی بے قراری چھپائے
لہو میں مسلسل بہے دکھ سے گھبرا کے اور یاد سے ہار کے نت نئی دوستی اور جھوٹی محبت کے صحراؤں میں اد
وفاؤں کے روشن چمکتے سرابوں کی دہلیز پہ زندگی ڈھونڈتے ہیں۔
ہواؤں سے خوشبوؤں کی بستیوں کا پتہ پوچھتے ہیں۔
لکھو
ہم محبت کے مارے
خود اپنی نگاہوں میں مجرم
ہم اجڑے ہوئے منتشر بے وفا کھوکھلے اور بیمار دل
ہم نہ تیرے نہ میرے
نہ اس کے نہ اپنے
ہمیشہ ہمیشہ کے تکلیف دہ رنجشوں کی سیہ کھائیوں
میں
پڑے اونگھتے ہیں
لکھو
ہم محبت کے مارے بھی کیا ہیں

اس کے دماغ میں نظم گونجنے لگی اور لفظ لفظ میں ناشاد پاپا دکھی سی ماما ہیثم اور للی پھرتے چلے گئے یہ محبت کیا تھی کیسی تھی کہ مار کر بھی نہیں مارتی آدھا آدھا بانٹ لیتی ہے زندگی اور موت کے درمیان ہوش اور بے ہوشی کے درمیان، محبت یہ تو جنوں تھا کہ اس نے کتنوں کی زندگی برباد کی مگر پھر بھی ہر دل اس کا مزا چکھنا چاہتا ہے۔

یہ جنوں نہیں تو اور کیا تھا، پاپا ماما کے بے وفائی کے باوجود انہی کو چاہتے رہے اور ماما بے وفائی کے بعد بھی پاپا سے بے وفائی نہیں کر سکیں ان کا دل بھٹک جانے کے بعد آخر دم تک انہیں کی طرف مڑا رہے گا یہ جنوں ہی تو تھا کہ محض محبت کی طلب میں ہیثم ممی کے ہاتھ سے ہر روز سم کا پیالہ پی کر زندگی کو تھوڑا تھوڑا اٹھاتا رہا مگر پھر بھی بے مزا نہیں ہوا۔

یہ جنوں ہی تو تھا کہ للی ہیثم کی راہ میں جوگن بن کر کسی نہ کسی گلی کہیں نہ کہیں کی زمین پر ابھی تک پھر رہی ہوگی اس نے انسان کی طلب کی تھی مگر اسے اللہ مل گیا یہ جنوں یہ محبت کتنی پرتیں رکھتی ہے کہ ایک عقدہ کھل نہیں پاتا کہ دوسرا راز ہاتھ اٹھا کر اپنی طرف متوجہ کرنے لگتا ہے جیسے اس وقت سمرہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

وہ اپنے دل کو کوئی جواب دینا چاہتی تھی اس منظر کے بدلے جو مہمانوں کے ساتھ نکلنے والی اداس سی ماما اور دلگیر سے پاپا کی نگاہ میں تھا اور آنسو کی طرح ڈول گیا تھا۔

”سمرہ کیا سوچ رہی ہو یار۔“ حسن عمار سر جھکائے اسے مسلسل دیکھتا ہوا منہ دکھائی میں دینے والے کنگن کا بکس دراز میں ٹٹولنے کے بعد لوٹا تو اس سے بے تکلفی سے پوچھنے لگا وہ چپ رہی تو اس نے اس کا گھونگھٹ الٹ دیا اور اس کے لب کانپے۔

”کہو ہم محبت کے مارے بھی کیا ہیں حسن۔“ حسن نے لمحہ بھر کو اس کے ملال آمیز چہرے کو دیکھا پھر اس کے دائیں ہاتھ میں کنگن ڈالتے ہوئے گنگنایا۔

”ہم محبت کے مارے مجسم محبت کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔ محبت خواب سے راکھ اور راکھ سے گلاب تک صرف محبت رہتی ہے ہر روپ میں سجتی ہے اس کے دکھ بھی سکھ اور سکھ تو امرت رس لگتے ہیں جو دل محبت کرتے ہیں وہ صرف محبت کے علاوہ کچھ کر ہی نہیں سکتے چاہے تباہ ہوں فنا ہوں یا رد کر دیے جائیں ان کے دل دھڑکن کی طرح محبت محبت کرتے ہیں محبت جو اس جہاں کا سچ ہے کبھی نہ مٹنے والا۔“ سمرہ نے سنا تو آہستگی سے اپنا سر حسن عمار کے کاندھے سے ٹکا دیا۔

اور کھڑکی سے باہر کھڑی ہوا یہ پیغام لے اڑی گلیوں گلیوں کی خاک اڑانے والی ایک لڑکی کے لیے ہاسپٹل میں زبردستی زندہ رکھنے والے ایک محبت آمیز دل کی طرف گاؤں کی کچی پکی پگڈنڈیوں پر مضمحل سی چلنے والی ایک عورت کے لیے دل کا روگ لگا لینے والے دل نما ایک مرد کی طرف اور ہر ہر آہٹ پر نوکروں کے ہوتے ہوئے دروازہ کھولنے کے لیے دوڑتے ہوئے ظفر نام کے انتظار کے لیے جو دیے کی طرح جل رہا ہے مگر اس دیے کا نہ انتظار ختم ہوتا ہے نہ سحر ہوتی ہے۔

مگر محبت تو خود سحر ہے روشن صبح ہے اور یہی پیغام تو تھا جو ہوا اپنے پیروں میں سمیت ہر دل ہر در کو کھٹکھٹاتی پھر رہی تھی اور رشک کو ترسنے والے دل اور سماعتیں مکمل اس طرف مرتکز تھیں نظر میں بینائی اور دل میں دھڑکن والی محبت کی طرح۔

……

کوئی شہر ایسا بساؤں میں

آج وہ پھر اس بینچ پر بیٹھا ہوا تھا، وہ ہر روز صبح جب بھی جاگنگ کے لیے اس پارک میں آتا اسے ہمیشہ ای جگہ بیٹھے دیکھتا، یہی کوئی ایک ہفتے سے اور اس کے چہرے کی گمبھیرتا الامان الامان۔ لیکن بس آج سرمد احمد کا دل چاہا جہاں بہت سے لوگ دعا سلام کے زمرے میں آتے ہیں، کیوں نہ وہ بھی اس دائرے میں شامل کر لیا جائے۔ وہ یوں تو بہت مصروف رہنے والا بندہ تھا۔ لیکن پھر بھی اس پارک میں پاپا کے، چاچو کے اور خود اس کے اتنے فرینڈز ملتے تھے کہ خود بخود ہیلو ہائے کا بندھن بنتا چلا جاتا۔ یہی وجہ تھی وہ آج اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ عمر اس کی بھی سرمد احمد جتنی ہی تھی یعنی یہی تیس اکتیس سال۔

”ہیلو، میں سرمد احمد ہوں۔“ مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا اور سامنے بینچ پر بیٹھے شخص کے تی... دوستوں جیسے تھے، نہ دشمنوں کیطرح بس ایک خالی پن سا تھا ان آنکھوں میں، جیسے اس نے دیرینہ تمنا کے کھونے کا دکھ سہارے بیٹھا ہو۔ پتا نہیں وہ اس دکھ کے سہارے بیٹھا تھا یا دکھ اس کے سہارے لیکن اسے لگا وہ عام انسان نہیں ہے۔ کچھ خاص تھا اس میں۔

”کیا...... آپ اجنبیوں سے بات کرنا بالکل پسند نہیں کرتے؟“ وہ کھڑے سے اس کے سامنے پڑی بینچ پر بیٹھ گیا۔ لیکن اسکے انداز میں پھر بھی کوئی تبدیلی نہ آئی۔ آپ کسی سے خفا ہیں کیا؟“ اس نے پہلی بار سر گھما کر اسے دیکھا۔ سرمد احمد کو لگا جیسے وہ سارے جہان سے خفا ہو۔ اپنے آپ سے خفا لوگ نہیں منائے جا سکتے۔ لیکن دنیا سے ناراض لوگوں کو منانے کا چانس لیا جا سکتا ہے۔ یہی چانس وہ لے رہا تھا۔ مگر ہنوز خاموشی دم سادھے اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

”آپ کا خوبصورت نام کیا ہو سکتا ہے؟“ اس نے نئی طرح سے پرانا سوال کیا۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں، جو بات کو رد کر دیتے ہیں۔ لیکن کوئی اگر ان کی شخصیت کی تعریف کرے تو ان کے انداز میں گرمجوشی پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر یہاں تو گرمجوشی کا ابال تو کیا اٹھنا تھا، ہلکی سی بھاپ بھی نہ اٹھی۔ سو اس نے بور ہو کر ریسٹ واچ پر نظر ڈالی۔

”اُف! ساڑھے سات ہو گئے، سوری دوست کل پھر ملیں گے۔“ وہ دوستانہ انداز میں اس کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے اٹھا مگر اجنبی نے کوئی رد عمل ظاہر نہ کیا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا، شاید اجنبی سچ مچ شرمیلا ہو مگر اس کی آنکھیں اب بھی داخلی دروازے پہ ٹکی ہوئی تھیں۔

”کسی کا انتظار ہے اسے......؟“ اس نے سوچا پھر سر جھٹک کر گھر تک جانے والے ٹریک پر واپسی کے لیے دوڑنے لگا۔

اور یہ بہت کم ہوتا ہے، ہم واپسی کے لیے سیدھے قدموں دوڑ سکیں۔ ہمیشہ وقت ہمیں آگے دوڑاتا ہے اور واپس پلٹنے کے لیے الٹے قدموں لوٹنے کی شرط لگاتا ہے اور الٹے قدم ہمیشہ الٹی گنتی کی طرح ہوتے ہیں، ہر قدم پر منہ کے بل گرنے کا خدشہ سانس پھلائے دیتا ہے۔ اتنی کہ اگلی سانس کے لیے ہم منتظر ہی رہتے ہیں۔

باسی، پرانی سانس ہمیں اترن کی طرح تھما دی جاتی ہے اور ہم اسی میں خوش حال سے بے حال اپنے جیتے، وقت سے جیتنے کے وہم میں دھمال ڈالتے ہیں اور وقت......؟

وہ ہماری بے وقوفی پر ہنسے ہی جاتا ہے۔ اتنا اتنا زیادہ کہ اس کی آنکھوں میں پانی آ جاتا ہے اور پھر کوئی نہیں جانتا، یہ پانی ہماری آنکھوں میں ساون کی طرح کیوں آن بیٹھتا ہے۔ وہ چلتے چلتے اسی اجنبی کو سوچ رہا تھا اور خود میں اتنا محو تھا کہ گھر میں داخل ہوتے ہی صبا سے ٹکرا گیا۔

”کیا ہے سرمد بھیا! آنکھیں ادھار دے آئے ہیں؟“

مسکرا کر کالج یونیفارم میں اسی کی منتظر صبا احمد کو دیکھنے لگا۔ لمبی لمبی سیاہ آنکھیں اور ان میں بیٹھا انتظار۔

”آخر یہ آج مجھے ہر کوئی انتظار کا سمبل کیوں لگ رہا ہے؟“ اس نے چونک کر خود سے پوچھا اور اس کے معصوم ہاتھوں کا دباؤ اپنے کندھوں پر محسوس کیا۔ وہ اسے زبردستی دھکیل رہی تھی۔

جلدی سے تیار ہو جاؤ بھیا! مجھے آپ آج ضرور لیٹ کرواؤ گے۔“ وہ اپنے بیڈ روم تک آیا۔ بیڈ پر اس کے آج کے منتخب کپڑے پریس ہینگ کیے پڑے تھے۔

”یہ چھوٹی کتنی ساری ذمہ داریاں سنبھالے بیٹھی ہے۔“ اس نے جلدی جلدی باتھ روم کا رخ کیا۔ پھر آدھے گھنٹے بعد وہ میز پر تھا۔

ناشتہ بہت سہولت سے چن دیا گیا تھا۔ پاپا معمول کے مطابق اخبار پڑھ رہے تھے، ان کی آنکھوں میں غیر متوقع تاسف اُمڈ آیا۔

”آج کل کے بچے کتنے غیر ذمہ دار ہو گئے ہیں؟“

”کیوں پاپا! کہیں سرمد بھائی کی کلاس تو نہیں لگنے والی؟“ اس نے توس پر مارجرین لگا کر سرمد کی طرف بڑھایا اور پاپا کے چائے کے کپ کو نئے سرے سے لبریز کرتے ہوئے شوخی سے سوال داغا۔ پاپا نے چونک کر اس کی چہکار کو دل سے سنا پھر ہلکے سے نفی میں سر ہلا کر بولے۔

”میرا سرمد ایسا بچہ ہی نہیں۔ بچپن سے یہ اتنا سمجھ دار، اتنا باشعور ہے کہ مجھے کبھی الگ سے کوئی کلاس نہیں لینی پڑی۔“ سرمد نے پاپا کے ریمارک پر شرٹ کے کالر کو اکڑا لیا۔ مسکرا کر اسے دیکھا تو وہ بھنا گئی۔

”پاپا! دیکھیں، بھیا مجھے چڑا رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے۔ میں سمجھ دار نہیں ہوں۔“

”دیکھیے ناں، پاپا! یہ لڑکی تو آ بیل مجھے مار کی مثال بن رہی ہے۔ میں نے کیا ایسا کچھ کہا ہے؟“ پاپا اب دونوں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ سرمد کی شرارت بھری مسکراہٹ اور صبا کا خفا سا انداز۔

"بری بات سرمد! بہنوں کو نہیں ستاتے۔"

"بہنوں کو نہیں ستاتا پاپا! میں صرف بہن کو ستاتا ہوں۔ ایک ہی تو ہے انجوائمنٹ کا ذریعہ اگر اسے بھی نہ ستاؤں تو بور نہیں ہو جاؤں گا۔"

پاپا مسکرانے لگے اور صبا منہ بنائے جلدی جلدی ناشتہ کرنے لگی۔ ہمیشہ پاپا اور وہ اسے کہہ کہہ کر تھک جاتے تھے کہ ناشتہ ڈھنگ سے کیا کرو۔ اپنی صحت کا خیال رکھو، مگر وہ جلدی مچائے رکھتی۔ مگر آج غصے میں وہ بڑی تندہی سے ناشتے پر ہاتھ صاف کر رہی تھی۔

"غصے میں ناشتہ کرنے والے بہت جلدی موٹے ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کھانے کی رفتار پر ان کا کنٹرول نہیں رہتا۔ وہ صرف مصروف نظر آنے کے لیے کھاتے ہیں تمہاری طرح۔" اس نے اپنی معلومات کا رعب جھاڑا۔ تو وہ ناشتہ چھوڑ کر اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے رکو، اکیلے کہاں جاتی ہو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا نا۔" بریف کیس تھامے وہ اس کے پیچھے لپکا۔ لیکن اتنی جلد میں بھی وہ نیوز پیپر اچکنا نہیں بھولا تھا۔ نیوز پیپر بغل میں دبائے وہ اس کے برابر گاڑی میں آ کر بیٹھا تھا۔ مگر اس نے منہ بنا کر کھڑکی کی طرف چہرہ موڑ لیا۔ اس نے شرارت سے اسے دیکھا اور رعب دار آواز میں پکارا۔

"چلو ڈرائیور......" گاڑی سبک رفتاری سے گیٹ سے نکلی تو وہ اس کی من پسند چاکلیٹ کوٹ کی جیب سے نکالتے ہوئے بولا۔

"بھئی ناراض لوگ چاکلیٹ تو نہیں کھاتے۔" اس نے جنبش نہیں کی، مبادا کہیں وہ اس کی کمزوری کا فائدہ اٹھا رہا ہو۔ مگر اس نے اس کی آنکھوں کے سامنے چاکلیٹ لہرائی تو خود بخود وہ پوری کی پوری اس کی طرف مڑ گئی۔

"آپ بہت برے ہیں بھائی!"

وہ ہنسنے لگا، پھر مسکرا کر بولا۔ "برا ہوں، لیکن تم مجھ سے زیادہ بری ہو۔ پتا ہی نہیں چلتا۔ کب ہلکے پھلکے مذاق، ناراضی میں لپیٹ ہو۔ ساری محبت۔ بھائی چارے کا دھڑن تختہ کر دیتی ہو۔" وہ لفظ بھائی چارے پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی، پھر شرارت سے بولی۔

"اگر جھوٹ موٹ کی ناراضی میں اصلی والی ناراضی کا ٹچ نہ دوں تو آپ کی یہ اصلی والی محبتیں کیسے دیکھوں گی۔"

"بہت چالاک ہو گئی ہو......" اس نے اسے کالج کے گیٹ پر چھوڑا، والٹ سے ایک بڑا نوٹ نکال کر ریفریشمنٹ کے لیے تھمایا اور باوردی ڈرائیور گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔ سبک رفتاری سے چلتی گاڑی میں تنہا ہو کر اس نے پہلی بار نیوز پیپر کھولا، ڈان پڑھ چکا تو اردو اخبار کھول کر بیٹھ گیا۔ اگلے پچھلے صفحات پڑھتے پڑھتے کالمز پر نظر پڑی تب اسے حیرت ہوئی۔ آخر یہ کس کالم نگار کے اچانک منظر نامے سے غائب ہونے کے تذکرے ہیں۔ شاید کوئی ہوگا، مصروف، کوئی بھی مصروفیت ہو سکتی ہے۔ لیکن ڈھنڈورا ایسے پیٹا جا رہا ہے جیسے کوئی قیامت آ گئی ہو۔ ایک تو یہ صحافتی ذرائع! اس نے عمومی صحافتی کارکردگی پر، ول لفظ کہہ کر اخبار تہہ کر کے گود میں رکھ لیا۔ تب اچانک اس کی نظر میں بجلی کوندگی۔

"یہ چہرہ......! بہت دیکھا ہوا ہے۔" اس نے سوچا وفعتاً اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

یہ تو اس خاموش نوجوان کی تصویر ہے جس سے میں صبح سر بازار ٹھٹک گیا تھا۔ لیکن اس کی آواز تک نہیں سن

سکا تھا۔ چھریرا بدن، غلافی آنکھیں۔ گندمی رنگت، کلین شیو، ڈریسنگ کا شعور رکھنے والا پرکشش شخصیت کا مالک۔ لیکن یہ شخص کراچی سے یہاں اسلام آباد میں آ کر کیا کر رہا ہے؟ اس نے گلاسز اتار کر اسے پھر سے غور سے دیکھا۔ پھر بڑبڑایا۔

''اچھا جناب تو آپ کا نام طارق فاروق ہے، ایم اے صحافت اور بہت زبردست کالم نگار ہیں لیکن کالم نگار اتنے قنوطی تو نہیں ہوتے۔ تنقید، تعریف، احتجاج کوئی بھی نوع کی مصروفیت نکال کر وہ خود کو زندہ رکھتے ہیں۔

یہ زندہ تھا، لیکن زندگی سے منہ موڑے کھڑا تھا۔ آخر پرابلم کیا ہے اس کی؟''

اس نے سوچا مگر اس وقت تک اس کا دفتر آ چکا تھا، وہ یہاں شوروم میں بیٹھتا تھا۔ ان کے کراچی، لاہور اسلام آباد میں گاڑیوں کے شورومز تھے۔ جو ان کے قابل بھروسہ ملازمین کی زیرِ نگرانی تھے اور کراچی، اسلام آباد کے شوروم وہ خود دیکھتا تھا۔ شورومز کے ساتھ ساتھ اس کا رینٹ اے کار کا سائیڈ بزنس بھی تھا۔ اسلام آباد میں اکثر ڈیلیگیشن آتے رہتے تھے۔ دارالحکومت ہونے کی وجہ سے اس کا یہ بزنس بھی بہت اچھا بزنس جا رہا تھا۔ وہ آج دن بھر رینٹ اے کار کی لسٹ دیکھنے لگا۔ پچاس فیصد گاڑیاں مصروف تھیں۔ اس نے کچھ واؤچرز پہ دستخط کیے۔ کچھ پے منٹ بینک میں جمع ہونے بھیجی اور شام تک اتنا مصروف رہا کہ ذہن سے طارق فاروق کا نام تک محو ہو گیا۔ مگر شام سات بجے گھر پلٹا تو پہلا فون صریحہ جلال کا آیا تھا۔

''زہے نصیب، آج ناچیز کو کیونکر یاد کیا گیا؟'' لہجہ کافی شوخ تھا۔ صریحہ کچھ دنوں سے سیمینارز اٹینڈ کرنے میں اتنی مصروف تھی کہ دو ماہ بعد ہونے والی شادی کے حوالے سے بھی سرمد احمد کو لفٹ نہیں کروا رہی تھی۔ دونوں کا نکاح عید پر کر دیا گیا تھا، رخصتی عیدالاضحیٰ پر ہونا قرار پائی تھی۔

''کیا ہو گیا، کیا بہت ناراض ہیں آپ؟'' اس کی شوخی کو وہ کچھ اور بھی سو لہجے میں التجا بھر کر پھر سے پوچھا تو وہ ہنسنے لگا۔

''خفا اور تم سے، پاگل لڑکی! ایک تم ہی تو ہو جو مجھے سمجھتی ہو، تم سے ناراض ہو سکتا ہوں۔''

ڈھیروں اطمینان صریحہ جلال کے دل میں اتر آیا۔ بہت خوش قسمتی ہے کہ انسان کو جیون ساتھی واقعی جیون دینے والا ملے اور سرمد احمد ایک آئیڈیل انسان تھا۔ وہ بہت زیادہ خوبصورت نہیں تھا، لیکن اس کی شخصیت کی ساری جاذبیت اس کی محبت میں تھی۔ وہ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ موبائل آف کر کے واپس اپنے روم میں آیا تو اسے صبا کی ہڑک اٹھی۔

وہ بیڈ روم سے باہر نکلا۔ اسے ہر جگہ ڈھونڈ چکا تو خیال گزرا شاید وہ اسٹڈی میں ہو۔ پڑھتے رہنے کا اسے جنون سا تھا۔ مگر غیر نصابی کتب، تعلیمی میدان میں وہ اوسط قسم کی طالبہ تھی۔ لیکن ذہین تھی۔ دنیا پر اس کی نظر مطالعہ کی وجہ سے ہی گہری تھی۔

''صبا کی بچی کہاں ہو تم......؟'' وہ اسٹڈی میں آیا لیکن وہ وہاں بھی نہ تھی۔

''شاید ٹیرس پر ہو گی۔'' اس نے سوچا۔ گھر میں ملازمین کی فوج ظفر موج اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھی۔

بابا شام ہوتے ہی اپنے مخصوص دوستوں کے ساتھ کلب چلے گئے تھے۔ یہی وجہ تھی، وہ بور ہو کر اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔

یہ نہیں تھا وہ کوئی بیبا بچہ تھا۔ جس کے آٹھ پہر گھر میں ہی گزرتے تھے اس کی بھی گیدرنگ تھی۔ یار دوست

تھے۔ کئی کلب کی ممبر شپ تھی مگر کبھی کبھی دل چاہتا ہے نا گھر میں اپنوں کے ساتھ کچھ وقت بتایا جائے۔

''گڑیا! کہاں ہو آپ......؟'' حیران ہونے کے ساتھ ساتھ اسے فکر بھی لاحق ہوئی۔ تبھی اس نے اس کا موبائل ٹرائی کیا کافی دیر بعد اس کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔

''میں راستے میں ہوں بھائی! گھر آ رہی ہوں، یہاں تھوڑی سی شاپنگ کے لیے نکل گئی تھی۔ میری دوست مجھے گھر ڈراپ کر کے جائے گی۔'' وہ ٹیرس سے نیچے آ کر بیٹھ گیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی، خالی ہاتھ...... اس نے اس کے خالی ہاتھوں کو غور سے دیکھا۔ وہ خاموش آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

اتنا سنجیدہ، اتنا دکھی اس نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا اس وقت بھی نہیں جب اس کا پیارا کڈی، ڈاگ مرا تھا۔ اس وقت بھی نہیں جب بہت محنت کے باوجود پہلے سمسٹر میں دو پیپر میں رہ گئی تھی۔ آج کوئی بات بہت ہی زیادہ دل شکستہ کرنے والی تھی۔ جو اس کی آنکھوں میں اتنا غم تھا اور صبا کی آنکھوں میں غم ہو تو پھر کیسے ممکن ہے سرمد احمد بغیر کوئی ردعمل ظاہر کیے رہ سکے۔ وہ اٹھ کر اس کے برابر آن بیٹھا۔

''کیا بات ہے صبا! تم کچھ اپ سیٹ لگ رہی ہو؟'' اس نے اپنی تھکی ہوئی آنکھوں کو ہولے ہولے مساج کرتے ہاتھوں کو روک کر بھائی کو دیکھا۔

سوال آنکھوں میں بدستور رکے ہوئے پایا تو ہولے سے بولی۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے بھائی! بس ویسے ہی کچھ تھکن ہو گئی ہے۔ اس لیے موڈ اچھا نہیں ہے۔'' اس نے سوچا شاید یہی کافی ہو گا۔ مگر سرمد احمد کب ٹلنے والا تھا۔ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

''موڈ خراب ہوتا بچے! تو میں مطمئن ہو جاتا کہ تم نارمل ہو۔ لیکن مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے تم اداس ہو، بہت زیادہ اداس، اور ڈسٹرب۔ آخر ایسی کیا بات ہے، جس نے تمہاری آنکھوں میں اتنا غم بھر دیا ہے؟''

اور بس۔ صبا احمد کو لگا یہ محض لفظ نہیں کاندھا تھا، اپنے پن سے لبریز، جس پر سر رکھ کر وہ رو سکتی تھی۔ بے تحاشا ہچکیاں، سسکیاں کیا کیا کچھ نہیں تھا اس کے اندر۔ وہ سب باہر آنے لگا تھا۔ وہ سب آنسو جنہیں اس نے حوصلے کی زنجیر سے باندھ رکھا تھا۔ وہ سب قیدی آزاد ہو گئے تھے۔ سرمد کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیسے ان آنسوؤں کو روکے۔ ان آنسوؤں کو جن کی قیمت دنیا کی ہر چیز سے زیادہ تھی۔ وہ ہر نقصان برداشت کر سکتا تھا، لیکن اتنا بڑا نقصان۔ بچپن سے لے کر آج تک اس نے جسے گڑیا کی طرح سنبھال کر رکھا شہزادیوں کی طرح جس کی ہر خواہش کو پورا کیا۔ جب وہ اس قابل بھی نہیں تھا کہ اس کی خواہش پوری کر سکتا تو پھر کیسے ممکن تھا کہ وہ اب اس کے لیے ہراساں نہ ہوتا۔ وہ ٹہل ٹہل کر اسے دیکھے جا رہا تھا اور وہ روئے جا رہی تھی۔ اس کا خلجان اتنا بڑھا کہ اس نے فون کر کے صریم جلال کو بلا لیا۔ جس نے آتے کے ساتھ ہی اسے گھورا۔

''ضرور تم نے ستایا ہو گا میری صبا کو......'' وہ جھپٹ کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ پھر لاڈ سے بولا۔

''میں برا ہوں، پر اتنا برا نہیں کہ صبا کی آنکھوں میں اتنا ڈھیر سارا پانی بھر دوں اور پھر انہیں بہنے دوں۔ ڈیئر صریم! صبا کے آنسو بہت قیمتی ہیں، میرے لیے۔''

''بھیا کی کوئی شرارت نہیں ہے صریم بجو۔ یہ تو بس پتا نہیں میرے آنسو کیوں نہیں رک رہے۔'' صریم نے

اس کی شیگی کٹ بالوں کو لپیٹ کر کیچر لگایا کچھ کہنے کے بجائے اسے اپنے ساتھ لگائے لگائے اس کے روم میں لے گئی۔

سرمد احمد نے ان کی طرف پیش رفت کی تو ان نے ہولے سے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر روکا۔

”مجھے تنہائی میں بات کرنے دو۔ ہوسکتا ہے کوئی ایسی بات ہو جو وہ تم سے شیئر نہ کرسکتی ہو۔“ بات اس کے دماغ میں آگئی، سو وہ دوبارہ صوفے پر آن بیٹھا۔ ٹی وی آن کیا تو حیران رہ گیا۔ یہ چہرہ تو دیکھا بھالا تھا۔

”اوہو یہ تو طارق بن فاروق ہے۔“ اس نے ٹی وی کی آواز تیز کردی۔

تب اس پر کھلا، وہ بہت عمدگی سے اپنے فرائض نبھا رہا تھا۔ کہ اچانک منظر عام سے غائب ہوگیا۔ آج کل آنے والے زلزلے میں اس کی کارکردگی بے حد نمایاں تھی۔ اسے بات کہنے بھی آتی تھی اور منوانے کا ہنر بھی خوب ہی رکھتا تھا، لیکن میڈیا کے آپس کے تناؤ اور اتنے ہاٹ ایشو پر بھی سیاست چمکانے کے ماہر افراد کے آگے اس کی ایک نہیں چلی تھی۔ جگہ جگہ اسے بدعنوانی کرنے کی اتنی پرکشش آفرز دی گئی تھیں۔ ہر معاملے میں اس قدر تھکایا گیا تھا، اندرون خانہ بیوروکریٹ نے ایسی ایسی چالیں چلی تھیں کہ وہ ہر چیز سے کٹ آف ہوگیا، اس نے اپنا موبائل آف کر رکھا تھا۔ اپنی ہر شناخت سے منکر ہوگیا تھا۔

”تو یہ تمہاری پرابلم......“ اس نے تاسف سے خود کو بتایا، ٹی وی آف کر کے مڑا ہی تھا کہ صریم جلال کو سامنے پایا۔

”کیا معاملہ تھا، کچھ پتا چلا؟“ صریم جلال متوازن قدم چلتی ہوئی صوفے پر آکر بیٹھی، پھر سنجیدگی سے بولی۔

”طارق بن فاروق ہے کوئی ان ہمارے اسٹوڈنٹس کا آئیڈیل جس کی ایک آواز پر یہ سب جان لٹانے پر بھی تیار ہیں۔ لیکن کچھ عرصے سے میڈیا نے اسے ایسے بدنامی سے لک آؤٹ کیا ہے۔ یہ سارے طلب جو اس کی آواز پر والنٹیئر بن کر زلزلہ زدگان کی امداد کے لیے آنکھ بند کر کے چل پڑے تھے۔ وہ سب بہت دل برداشتہ ہوگئے ہیں، انہیں راہ دکھانے والا کوئی نہیں ہے۔ سوائے دکھ تکلیف کے خاتمے کی خواہش کے سوا اور صبا اسی ناامیدی کا شکار ہے۔ کہیں سے اسے اطلاع ملی تھی کہ طارق بن فاروق یہاں اسلام آباد میں دیکھا گیا ہے۔ تو ان کا پورا گروپ اس کی تلاش میں سرگرداں رہا اور ناکام لوٹنے سے ہی وہ اتنی شکستہ ہوکر روئی ہے۔“

سرمد احمد نے طویل گہری سانس لی۔ ورنہ اس کا خیال تھا عموی طور پر اس عمر کے کسی دھوکے نے اسے اتنا ٹوٹ کر رونے پر مجبور کیا ہے۔ لیکن وہ اس تکلیف سے بہت اچھی طرح واقف تھا کہ محبت کا ہر دھوکا انسان سہہ لیتا ہے، لیکن محبت کی سب سے عمیق حالت آئیڈیل کی ہوتی ہے۔ اگر اس میں کھوٹ ملے یا کھوٹ دکھایا جائے تو دل کے بچنے کی پھر کوئی سبیل نہیں نکلتی۔ پھر آپ کتنی ہی محبت سے، محبت کا ہاتھ تھام کر اس میں زندگی اور تحریک بیدار کرنے کی کوشش کریں، مگر سب بے سود رہتا ہے۔ پھر آپ کسی بڑے حادثے پر بھی نہیں چونکتے آپ کی زندگی میں پھر ہر معاملہ ”سو واٹ......“ کا سلوگن بن جاتا ہے۔ وہ یہ بہت اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ بہت پہلے وہ اسی کا شکار رہا تھا۔ اس کا آئیڈیل جیریمی زون بے تھا۔ جس کی بات کو وہ حرف آخر سمجھتا تھا۔ جس کی بلند کرداری پر وہ ایک لفظ نہیں سن سکتا تھا، جس کے لیے وہ جان تک دے سکتا تھا۔ مگر ایک دن جب وہ اس سے ملا تو اسے لگا وہ صرف دھوکا ہی دھوکا ہے اور وہ صرف فریب نظر کا شکار رہا یا شاید میڈیا نے اس شخص کو عظیم انسان کے طور پر سجا کر پیش کیا کہ وہ ہر دل میں مکین ہوگیا مگر

اس لمحے وہ اس کے سامنے تھا اور ڈرنک سے مدہوش، زندگی پر اپنی رائے دے رہا تھا۔

”زندگی بہت ہو تب بھی کم لگتی ہے، اور فی زمانہ زندگی آج کل بہت کم ہو چکی ہے۔ سو ایک سانس میں پا جانے کی تمنا ہر تمنا سے بڑھ کر ہے۔ میں اگر تمہاری طرح جوان ہوتا تو اسے پھر سے جیتا پھر سے جیتا لیکن طلب نہیں مٹی اور تم...... تم یہ کن چکروں میں پڑے ہو۔ یہ چیریٹی، یہ فلاح بہبود، یہاں صرف انسان اپنی زندگی سنوار لے تو یہی بہت ہے۔ ہاں اگر اپنی تنہائی سجانا چاہتے ہو تو میرے وی لائف ہاسٹل کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہیں۔ وہاں جو تم چاہو تمہیں ملے گا، کبھی مایوس نہیں ہوگے۔ بے یار و مددگار بہت سی لڑکیاں ہیں، جو تمہارے کسی بھی خواب میں کسی بھی ڈھوکے میں ہر بار آنے کو تیار ہو سکتی ہیں اور اگر تم چاہتے ہو یہ چیریٹی تمہارے نام پر کوئی تمغہ لگا سکے تو اس کا بھی انتظام ہے میرے پاس۔ میرے ساتھ رہ کر دولت، شہرت، عزت، سب کچھ تمہیں ملے گا۔ لیکن بس تمہیں منہ بند رکھ کر میرے پیچھے چلنا پڑے گا۔ میری طرف سے تم آنکھ موڑ لینا، تمہاری سرگرمیوں سے میں صرف نظر کروں گا۔ حماد یوسف اگر تمہیں نہ لایا ہوتا تو شاید میں اتنی جلدی تم پر کبھی نہ کھلتا مگر حماد لایا ہے تو تم اپنے ہی بندے ہو، مجھے تم پر اعتماد ہے......“

وہ خاموش کھڑا دیکھتا رہا، پھر سر ہلایا اور سوچنے کا وقت لے کر اس کی کوٹھی سے ایسے نکلا جیسے کسی دیو کی قید سے بھاگ نکلا ہو۔ سارے سراپے، سارے وجود سب مشت خاک ہیں۔ پر یہ خاک کتنی بڑھک باز، کتنی ضدی، کتنی خود سر ہے۔ زمین پر زور زور سے پیر مار کر اپنے وجود پر اتراتی ہے اور یہ زمین! یہ زمین اس کی اس حرکت پر کتنا کلستی ہوگی، حیرت سے ایک لمحے کو گنگ ہو جاتی ہوگی کہ ہر ذی نفس نے موت کا مزہ چکھنا ہے۔ لیکن پھر بھی زندگی کے چٹخارے سے اس کی زبان اتنی لتھڑی ہے کہ ہر چیز، ہر بات بے معنی لگتی ہے۔ ہر انسان سمجھتا ہے: جس کے مرنے کی اطلاع اس تک پہنچی، بس اسے ہی مرنا تھا اور صرف اسے جینا ہے۔ موت کو ہم اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارتے ہیں اور مٹی ڈال کر سمجھتے ہیں موت اب فنا ہوئی تو کبھی پلٹ کر ہمیں نہیں دبوچے گی۔ مگر موت ہے کہ ہر قبر کے سرہانے ہائے افسوس وائے افسوس کر کے ہر بشر کی کم عقلی پر ہنستی ہے اور اس کی یہ ہنسی، ہر سوچنے والے دماغ پر خلش چھوڑ جاتی ہے۔ ایسی خلش جو دیر دل میں چبھتی رہے، کسی نئے حادثے سے پرانی ہو کر بھی نئے افسوس کی طرح باتوں میں در آئے۔ اس کی ذہنی حالت کتنے عرصے تک ڈسٹرب رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ پاپا اور صبا نے اسے اس فیز سے نکالا تھا اور کتنی مشکل سے نکالا تھا اور آج پرانا واقعہ نئے طرز پر اسٹیج ہوا تھا اس اپی سوڈ میں بھی ایک ایماندار آدمی کو ناکام ثابت کر کے کک آؤٹ کر دیا گیا تھا۔

مجھے کچھ کرنا ہے، پہلے میں نے ایک برائی کو ہوتے دیکھا، لیکن نہ اسے روکا نہ اسے پوائنٹ آؤٹ کیا۔ آج بھی وہ شخص اسی طرح بلند مرتبہ پر فائز تھا اور لوگ اسی کو انسانیت پر حرف آخر سمجھتے تھے اور یہ طارق بن فاروق یہ سب کچھ لٹا دینے پر کمر بستہ تھا۔ لیکن میڈیا کی من مانی رپورٹس، ٹی وی کے خود ساختہ سیکریٹ کے راز افشاء کرتی سیکریٹ رپورٹ نے اس کے اندر کے طارق بن فاروق کو مار دیا تھا۔ وہ اتنا دل شکستہ ہو گیا تھا کہ کسی سے کچھ نہ کہنا چاہتا تھا، نہ کوئی حرف تسلی سننا چاہتا تھا۔ بت بن گیا تھا۔ جس کے اندر باہر ہر طرف خاموشی اور تنہائی کی بلند فصیلوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

رات کے کھانے کے بعد صریم کو گھر چھوڑ کر آیا تو ٹیرس پر صبا کو بالکل خاموش کھڑا دیکھا۔ وہ دبے قدموں اس کے پیچھے جا کر کھڑا ہوا پھر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”بہت برا لگ رہا ہے ناں تمہیں؟“

اس نے سر موڑ کر بھائی کو دیکھا لہجے میں جو بات تھی، آنکھوں میں وہ بات ڈھارس کی طرح سمٹ آئی تھی۔

’’طارق سر، ناکام آدمی نہیں ہیں بھائی! انہیں لوگوں نے ٹریپ کیا ہے۔ ان کے جذبوں کو ایک اسکیم کے تحت مسترد کیا گیا ہے۔ انہیں جان کر جگہ جگہ یہ جتایا گیا ہے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے، ان میں منصوبہ بندی کی صلاحیت ہے ناں۔ ورکرز سے کام لینے کی لیڈرشپ۔ انہیں میدان سے اس لیے کک آؤٹ کیا گیا ہے کہ وہ ان کی بدعنوانیوں کا پردہ نہ چاک کر دیں۔ وہ جو جانتے ہیں، وہ دنیا کو نہ بتا دیں۔ سر طارق ناکام انسان نہیں ہیں بھائی!‘‘

جو بات اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ وہ بات صبا کے لہجے میں در آئی تھی۔ جیسے یہ بات اتنی اہم نہ ہو صرف یہ یقین اہم ہو کہ اس دنیا میں دو انسان ہی سہی طارق بن فاروق کی ذات کا دفاع کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس کی ذات کا بھرم ان کے لیے ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔ سرمد احمد نے اس کے یقین کو اسی مطلوبہ شدت سے تھام لیا تھا۔ پھر اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

’’میں جانتا ہوں طارق جیسے انسان جن میں کچھ کر جانے کا دم خم ہوتا ہے جو صرف اپنی انرجی پر جنگ لڑنا جانتے ہیں، وہ لوگ تھک تو سکتے ہیں۔ ناکام ہرگز نہیں ہو سکتے۔ اس لڑکے کی حب الوطنی پر بہت گہری چوٹ لگی ہے، لیکن ہمارا اس پر یقین یہ درد اسے کم سے کم کر کے محسوس کرائے گا۔‘‘ صبا احمد نے آسودگی سے سر ہلا کر اس کی ہر بات پر یقین کر لیا کہ سرمد احمد ہمیشہ وعدہ کرنے سے ہچکچاتا تھا۔ دامن بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا، لیکن جب وہ وعدہ کر ہی لیتا تو پھر اسے نبھانے کی کوئی بھی قیمت ہوتی اسے دے کر وہ سرخرو ہو جاتا تھا۔ یہی یقین تھا کہ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا، وہ طارق بن فاروق کو کس طرح باور کرائے گا کہ وہ اس پر کتنا مان کرتے ہیں اور سرمد احمد کل کی پلاننگ کرتے ہوئے دعا مانگ رہا تھا، کاش وہ کل اسی باغ میں اسی بینچ پر بیٹھا ہو مل جائے۔

دوسری صبح بہت جلدی ہوئی تھی، آج وہ وقت سے بہت پہلے گارڈن میں داخل ہوا تھا۔ ابھی تک اندھیرے کی چادر صبح کی طاقت سے دست و گریبان تھی اور اس کا خیال تھا وہ، پہلا بندہ ہے جو اس وقت سحر خیزی کے لیے اتنی ٹھنڈ میں بستر چھوڑ سکا ہو گا۔ لیکن وہ حیران رہ گیا کیونکہ وہاں پہلے سے کوئی بینچ پر بیٹھا تھا۔ وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتا قریب پہنچا۔

طارق بن فاروق......! اپنے معمول کے مطابق ٹی شرٹ اور جینز میں وہ موسم کے ہر طرح کے تیور سے بے نیاز بیٹھا خلا میں کچھ تلاش کر رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بات کہاں سے شروع کرے۔ رات بھر اس نے اپنے جذبات اس تک پہنچانے کے بہت سے جملے تراشے تھے۔ لیکن اس کی اتنی حسرت آمیز خاموشی کے سامنے وہ سارے لفظ شرمندہ ہو گئے تھے۔ وہ کچھ کہنے کے بجائے اس کے کندھے کو چھو کر اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ پھر جانے کیا ہوا اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر دل بن کر بولا تھا۔

’’ساری دنیا تمہیں کچھ بھی کہے، لیکن طارق! میں اور صبا آپ پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ سب کچھ غلط ہو سکتا ہے لیکن آپ...... آپ میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ آپ کبھی ناکام نہیں ہو سکتے۔ آپ کی ایمان داری آپ کی حب الوطنی اور خود آپ تا دیر یاد رکھے جانے والے انسان ہیں۔ ہم ہمیشہ آپ کو اچھے لفظوں میں یاد کرتے ہیں۔ یاد کرتے رہیں گے۔ چاہے دنیا کچھ بھی کہے۔‘‘

سرمد احمد کے ہاتھ میں پکڑے ہاتھ میں کسمساہٹ ہوئی اس نے دیکھا طارق بن فاروق کی پلکیں پہلی بار

جھجکیں جیسے خلا میں کسی نقطے نے پہلی بار اپنی مربوط تشکیل کی، اندر برف کے گلیشیئر میں کسی نے امید کا نامحسوس دیا دکھ دیا، جمع ہوئے آنسوؤں میں ہلکی سی باڑ آئی، ایک۔ دو، تین قطرے آنکھوں سے بہہ نکلے۔ کسمساہٹ زندگی بننے لگی تھی۔ وہ چہرہ اب بھی بے یقینی سے سرمد احمد کو تک رہا تھا۔

"ایک دوست آپ کے پہلو میں ہو تو ایک ہزار کی حسرت کبھی نہیں کرنا چاہیے۔" سرمد احمد کے اندر کبھی کا پڑھا ایک جملہ اس کے اندر از از ابھرا۔

"میرے دوست بنو گے۔ میرا کوئی اچھا دوست نہیں ہے؟" ہاتھ پھیلا کر اس کی ذات کو اہمیت سے پکڑ دیا۔

وہ کچھ بولا نہیں، لیکن اس کے انداز میں انکار نہیں تھا۔

"تم رہتے کہاں ہو؟" اگلا سوال کیا اور طارق بن فاروق کے وجود میں جیسے ہل چل مچ گئی۔

"میں سکون سے رہنا چاہتا ہوں۔ پلیز میں یہاں کسی کو نہیں جانتا اور نہیں چاہتا کوئی اور بھی مجھے جانے۔ میڈیا کی یلغار ابھی تک مدھم نہیں ہوئی ہے۔ جب تک ان کی زبان کو کوئی نیا واقعہ چٹخارہ نہیں دے گا۔ وہ مجھے ہی ذائقہ بنائے رکھیں گے۔"

"لیکن میں میڈیا میں نہیں ہوں، میں صرف سرمد احمد ہوں، تمہیں آئیڈیلائز کرنے والی ایک کالج گرل صبا احمد کا بھائی۔ وہ لڑکی اور اس کے دوست تم پر آنکھ بند کر کے اعتبار کرتے ہیں اور اس سارے معاملے سے تمہارے واک آؤٹ کر جانے سے وہ سب ڈس ہارٹ ہو گئے ہیں۔ وہ سب میڈیا کو بتانا چاہتے ہیں، سچ کتنے ہی جھوٹ کے پلندے کے نیچے دیا جائے، وہ پھر بھی سچ ہی رہتا ہے۔" طارق اسے دیکھتا رہا پھر خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔ کچھ کہے بغیر۔

سرمد احمد نے ہمت نہیں ہاری وہ اس سے روز ملنے لگا۔ صریمہ جلال سے مل کر اس کے کچھ صحافی دوستوں کو طارق بن فاروق کے کیمپ میں شامل کر کے اس کی ذات کا دفاع کرنے بیٹھ گیا۔ روز اخبار میں اس کی طرف سے خبریں، کالم لگنے لگے تو جنگ یک طرفہ نہیں رہ گئی۔

تب طارق نے پہلی بار اس کے دیے کارڈ پر اس کا نمبر دیکھ کر اسے فون کیا۔

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تم میرے گھر آجاؤ، بہت دن ہوئے کسی اچھے دوست کو گھر بلائے ہوئے۔"

"لیکن تمہیں کیا پتا، میں اچھا دوست ہوں، کیا پتا میں بہت برا انسان ہوں؟"

"تم سمجھتے ہو گے ایسا، وگرنہ میرا ذاتی خیال ہے مکمل برا انسان بھی کسی ایک رشتے، ایک انسان سے تو ضرور بالضرور مخلص ہوتا ہے۔ کوئی تو کسی دل کو پیارا ہوتا ہے نا اور تمہارا پلس پوائنٹ یہ ہے کہ تم بہت سے دلوں کو پیارے ہو۔"

کبھی دل چاہتا ہے نا، کوئی ہو اس اتنی بڑی دنیا میں، ایک اکیلا جو آپ کے لیے بہت محبت سے آپ کی ذات کی جنگ اپنی انرجی پر لڑے، پھر جیتے یا ہارے کوئی خوف اس کے قدم پیچھے نہ ہٹا سکے۔ ساری دنیا بھی جب آپ کو چھوڑ جائے تب بھی وہ آپ کی ڈھارس کے لیے آپ کی پشت پر کھڑا رہے، لیکن یہ رویہ جس قدر عنقا ہے اسی قدر اس جذبے کی قدر کرنے والے دل بھی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اور وہ کفران محبت کرنے والوں میں سے کب تھا۔

بہت دل سے تیار ہو کر وہ اس کی کوٹھی پہنچا تھا۔ سرمد احمد پورچ میں کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر کھل اٹھا محبت سے

تھام کر ڈرائنگ روم میں لے کر آیا۔ وہاں پہلے سے چار پانچ نفوس موجود تھے۔

”میں صرف تم سے ملنے آیا تھا۔“ اس نے رخ موڑ کر خفگی سے اسے دیکھا۔ وہ اسکے قریب آ گیا اور محبت سے بولا۔

”یہ باہر کے لوگ نہیں، میرے بہت خاص ہیں طارق! یہ صریمہ جلال ہیں میری بیٹر ہاف یہ صبا احمد ہے، میری بہن اور یہ تین افراد وہ ہیں جو میڈیا میں تمہاری جنگ اپنی انرجی، اپنے کیریئر کے بی ہاف پر لڑ رہے ہیں۔ صرف اپنے دل کے یقین پر کہ تم جیسے پیش کے گئے ویسے نہیں ہو۔“

وہ آہستہ آہستہ سب سے ہاتھ ملاتا صریمہ اور صبا کے سلام کا جواب دیتا خالی صوفے پر بیٹھ گیا۔ خاموشی کمرے میں چکراتی پھر رہی تھی۔ جب گفتگو کی خواہش نے خاموشی کا ہاتھ تھام کر اپنے قریب بٹھایا۔ لفظ چھوٹے بچوں کی طرح شور کرنے لگے، تب سرمد نے کہا۔

”تمہیں کس نے مجبور کیا تھا کہ تم میدان چھوڑ کر بھاگ جاؤ؟“

وہ اسے دیکھنے لگا۔ ساری اذیت اس کے چہرے پر پھیل گئی، پھر لفظ جیسے سسک اٹھے۔

”میں سمجھتا تھا جو زندگی سے بھرپور ہے۔ وہ اپنے وجود کے بی ہاف پر اپنے ہم وطنوں کی زندگیوں کی جنگ بھی لڑ سکتا ہے اس ملک نے جو کچھ مجھے دیا ہے، میں اسے کچھ، بہت میں سے تھوڑا لوٹا سکتا ہوں۔ سرمد! میں کوئی بہت اعلا قسم کی روح نہیں تھا۔ میں نے کالج لائف میں بہت بلنڈر کیے، وقت سے پہلے پرچے آؤٹ کروائے تو کبھی چیٹنگ کرنے کے نئے نئے طریقے سوچے۔ ہم صرف دوستوں کے لیے جیتے تھے کیونکہ ہماری زندگی کا کینوس اتنا ہی تھا۔ موج مستی، موسیقی ادھر ہاتھ بڑھایا ادھر تمنا ہتھیلی پر رکھی ملی۔ زندگی میں تمنا کرنا ناکام ہونا کیا ہوتا ہے۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ لیکن پھر 18 اکتوبر کی صبح میں یہاں ایک سیاسی شخصیت کے انٹرویو کے لیے رکا ہوا تھا۔ اس صبح مجھے لگا، بلند و بالا عمارتیں شاندار محل بہت ساری زندگی بس ایک نقطہ میں سمٹ آئی ہے۔ ”اللہ“ پہلی بار میری زبان پر وہ لفظ آیا جس ذات نے ہر لمحہ مجھے سنبھال کر رکھا، میری تھوڑی سی محنت پر بہت ساری کمائی ہاتھ میں تھما کر کہا۔

”جاؤ، میں دینے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتا۔ ہاں تم گننے میں کم گنتے ہو، اور شکوے میں تمہاری کوئی حد نہیں ہوتی۔ جاؤ لیکن پھر بھی میں تمہیں بخشش کرتا ہوں، کرتا رہوں گا۔“

میں نے اپنے تھنک ٹینک اور اپنی سوچوں کو سراہنے والے بہت سے لوگوں کو اس لمحے سوچا۔ وہ سب میری بات کو حرف آخر سمجھتے تھے لیکن اس لمحے میں نے سوچا اگر یہ ہلتی ہوئی چھت مجھ پر آن گری تو کیا ہے میرے پاس جو میں اچھے عمل کے لیے ساتھ لے جاؤں گا۔ آوازیں، چیخیں، لوگ پاگلوں کی طرح باہر دوڑ رہے تھے، سب جان بچانا چاہتے تھے۔ لیکن کیا موت کا ایک دن معین نہیں، ہم کب تک اس سے بھاگ سکتے ہیں۔ میں نے اس لمحے خود کو پہلی بار دل سے کلمہ توحید پڑھتے سنا۔ مجھے لگا ہر لفظ میرے اندر اتر رہا ہے۔ اس دن میں صرف مسلمان ماں باپ کے گھر پیدا ہونے کی جزا سے بڑھ کر کوئی جزا سمیٹ رہا تھا۔ میرے دل میں خوف نہیں تھا اور تب کسی نے میرا ہاتھ تھام کر باہر کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ جھٹکے اب بھی آ رہے تھے، مگر میرے قدم اب لڑکھڑا نہیں رہے تھے۔ مارگلہ ٹاور کا سانحہ ہو چکا تھا، ہر طرف خاک خون، زندگی سب ہارنے لگی تھی۔ ہم سب مارگلہ ٹاور کے مکینوں پر افسوس کر رہے تھے۔ تعزیت کر رہے تھے

اور ملک کے دوسرے حصوں سے اطلاع آئی تھی۔ راولاکوٹ، باغ، مانسہرہ، مظفرآباد اور چھوٹی تنگ دشوار گزار پہاڑیوں پر آباد زندگی منہ کے بل جا گری۔ میں نے اسی لمحے سوچا مجھے کچھ کرنا چاہیے۔ مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ تب میں اگلی فلائیٹ سے کراچی آ گیا۔ میں نے چھوٹے سے پیمانے پر اپیل شروع کی، لوگ دیوانہ وار سن 65 کے بعد پہلی بار اپنے گھروں سے کسی ایشو پر باہر نکلے، سوئے ہوئے لوگوں نے آنکھ کھولی تھی، میں مصروف تھا۔ جب اتنے ہاٹ ایشو پر بھی کرپشن کا بازار گرم ہو گیا۔ ایکسپائرڈ ڈیٹ دوائیں، مارکیٹ سے اٹھوائی گئیں خیموں کی قیمتیں بڑھا دی گئیں۔ گرم کپڑے اور کمبل عنقا ہو گئے۔ کھانے پینے کی چیزیں اسٹور ہونے لگیں۔ تو میری آواز بلند ہوئی۔ میں اس کرپشن کے اندر اتر گیا تو بڑے بڑے لوگ ملوث پائے، بیوروکریٹ تاجر اور بہت سے نام میں ان پر لکھنے لگا تھا کہ میرے کالمز پر پابندی لگا دی گئی۔ ''آپ کہیں نہیں چھپ سکتے'' میں بالکل اکیلا کر دیا گیا تھا۔ اخبار میں میری نااہلی پر خبریں لگ رہی تھیں، میرے کیے گئے کاموں میں خامیاں نکالی جا رہی تھیں۔ مجھے کالج سے لے کر اب تک کی زندگی میں کھنگال دیا گیا تھا۔ میری معصوم شرارتوں کو بڑی سے بڑی بدعنوانی سے نتھی کیا جا رہا تھا۔ مجھے ناکام انسان ثابت کر دیا گیا تھا میں نے جو کچھ اپنے ملک پر لٹا دیا تھا اس میں سب سے قیمتی چیز میری ایمانداری اور کیریئر تھا۔ مجھے مکمل طور پر کرپٹ بنا دیا گیا تھا میں نے جناح ٹرمینل سے معصوم بچوں کی بردہ فروشی کے پورے نیٹ ورک سے واقفیت پر آواز بلند کی مگر کچھ شنوائی نہ ہوئی، میرے لوگ مر رہے تھے، ملبے تلے دبے ہوئے تھے اور وہاں کے لوگوں سے کچھ کرپٹ مافیا ممبرز اتنے بری طرح سے پیش آ رہے تھے دکھ کی کوئی تاویل، صورت گری نہیں ہو سکتی تھی۔ میرے اندر سکتہ ہو گیا تھا۔ مجھے مکمل طور پر بند گلی میں بند کر دیا گیا تھا مگر میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ تب ہی میں نے خاموشی سے دوسری فلاحی تنظیموں کے ساتھ در پردہ کام کرنا شروع کیا اور وہی وقت تھا جب اخبار میں خبر چھپی تھی کہ کچھ لوگوں نے کھانے پینے کے لالچ دے کر میری عزتوں کو پامال کیا تھا اس ملک میں عزت بنانا جتنا مشکل ہے اسے گنوا دینا اتنا ہی آسان، گینگ ریپ اتنے عام ہیں کہ اب کوئی لال آندھی چلتی ہے نا عذاب اترتا، بس زندگیاں کوما میں چلی جاتی ہیں نہ زندہ نہ پوری مردہ، بس وہ لمحہ تھا جب میرے دل پر ان معصوم لڑکیوں کی چیخوں آنسوؤں نے زخم ہی زخم لگا دیے، میں نے اس لمحے جانا، ناکام ہونا کیا ہوتا ہے۔ میرے اعصاب جواب دے گئے، بے بسی میرے اندر پتھر باندھ کر اتر گئی تھی۔ کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا اس ملک میں۔ یہاں پر لوگ صرف شور کر سکتے ہیں۔ شور کرتے ہیں، کیونکہ انہیں اس کام کے لیے باہر سے ایڈ ملتی ہے۔ میڈیا کوریج ملک پر سیر حاصل تبصرہ اور صاف شستہ انگلش بولنے پر تمغہ سجانے والے سارے نام نہاد انٹلیکچوئل یہ سب خود نمائی کے اتنے عادی ہیں، عادی ہو چکے ہیں کہ پھر ملک کی عزت حرمت کی ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں۔ یہ صرف اس بات پر خوش ہو جاتے ہیں کہ غیر ملکی میڈیا پر انہیں دکھایا جاتا ہے۔ ان کی بات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ بس اسی سے ان کی بھوک مٹ جاتی ہے اور کبھی کبھی دل چاہتا ہے تو یہ زہر اگلتے ہیں۔ اس ملک میں کچھ نہیں بدلا جا سکتا، بس یہی خاموشی کی وجہ تھی کیونکہ ہم کروڑوں کی آبادی پر یہ چند سو افراد حکمران بنا دیے گئے ہیں کہ واقعی لگنے لگتا ہے کہ اس ملک میں کچھ نہیں بدلا جا سکتا۔ یہاں ایسے حالات پیدا کر دیے جاتے ہیں کہ ہر ایماندار انسان چور بن جاتا ہے اور ہر کرپٹ انسان بڑے سے بڑے پائیدان پر کھڑا ملک کی بہتری میں اپنی لگائی جانے والی خود ساختہ انرجی کا حساب بے باق کرتا پایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے سرمد! یہاں بہت کچھ بدلا جا سکتا ہے۔ سسٹم کرپشن، ایمانداری ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھا جا سکتا

ہے۔ بدلا بھی جا سکتا ہے لیکن مایوسی...... مایوسی وہ ہتھیار ہے جس کے ڈستے ہوئے ہر انسان کو اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگتے ہیں۔ جو ان کی بات کرتا ہے ان کے دکھوں کو کیش کروانے کے لیے جھوٹ موٹ آنسو بہاتا ہے تم جانتے ہو اگر اس ملک کے باسیوں کے ذہن سے مایوسی نکل گئی تو کیا ہوگا؟''

سرمد اسے خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں کتنا غصہ، کتنا غم تھا۔ لیکن وہ بول کر اس کی بات کا ردھم نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ سو وہ خاموش رہا اور وہ اس غم و غصے سے بھڑکتا ہوا شعلہ ہو کر پکارا۔

''اگر اس ملک کے باسیوں کے ذہن سے مایوسی نکل گئی تو ان میں جرات پیدا ہوگی۔ وہ اپنا حق مانگنے لگیں گے۔ ملک میں، ملک سے باہر اپنے تشخص پر دو بدو بات کریں گے۔ اسی لیے انہیں غیر ملکی میڈیا اور یہاں کا اسٹیبلشمنٹ ل کر جان کر مایوسی کے غار میں گرائے رکھے ہوئے ہیں تاکہ بس میوزیکل چیئرز گیم چلتا رہے۔ لیکن وہ نہیں جانتے سرمد! اگر مایوسی حد سے سوا ہو جائے تو پیار سے بھی نہیں رکتی۔ پھر پا بجولاں بھی دیوانے رقص کرتے ہیں، پس پھر کوئی ہتھکنڈا کام نہیں آتا۔ لیکن ابھی اس نہج پر آنے میں برسوں لگیں گے اور یہی ایڈوانٹیج ہے جو ہر نسل کو بونا بنا دیا جاتا ہے اور ہر اس شخص کو زہر ہلاہل پلایا جاتا ہے جو یہ قند نہیں پینا چاہتا۔

سقراط یہاں ایک بار زہر کا پیالہ پی کر امر ہو گیا اور ہمارے ملک میں ہر ایماندار شخص ہر ایک قدم پر اسی زہر کو پیتا ہے پھر بھی مردود قرار دیا جاتا ہے۔ ہمارے لوگ اتنے سادہ ہیں، اتنی مرتبہ ٹریپ کیے گئے ہیں کہ یہاں اگر کوئی خیر سگالی کے طور پر بھی آپ سے آپ کی خیریت پوچھ لے، آپ کی معمولی سی پرواہ کرنے کا تردد کرے تو آپ چونک جاتے ہیں۔ آپ اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں، آپ سامنے والے کے لیے کس سبب سے اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر کوئی وجہ نہ ملے تو آپ اور زیادہ کانشس ہو جاتے ہیں۔ جانے کس جگہ آپ کو یہ شخص ہاتھ دکھا جائے۔

اور بس یہی مایوسی ہے جو مجھ میں رچ گئی ہے۔ میں سب جانتا ہوں لیکن پھر بھی ٹریپ ہو گیا ہوں یا شاید میں بہت زیادہ دل برداشتہ ہو چکا ہوں۔ سیاہ ضمیروں نے آگے ہار گیا ہوں۔ اتنی بہت ساری اچھائی کے آگے یہ بہت معمولی سا سیاہی کا دھبہ بہت بڑا ہو جاتا ہے۔ ساری جزا کو کھا جاتا ہے لیکن کوئی نہیں جانتا وقت کسی بڑے حادثے کے لیے اسٹیج تیار کیے جا رہا ہے، کسی بہت بڑے حادثے کا جس کے ہونے کے بعد دولت، امارت، جاہ و حشم سب روئی کے گالوں کی طرح یہاں سے وہاں اڑتے پھریں گے اور دعاؤں سے قبولیت کا ذائقہ اٹھا لیا جائے گا۔ کچھ لوگوں کا عمل بہت سارے لوگوں کے عمل کو ایسے کھا جائے گا جیسے آگ سوکھی لکڑی کو۔ سرمد! ہر شخص اپنے حصے کی آگ اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہے لیکن کوئی نہیں سوچتا کہ وہ کیا گنوا کر کیا کما رہا ہے۔''

وہ چپ ہو چکا تھا، پہلے کی طرح خاموش جیسے کبھی بولا ہی نہ ہو۔ کمرے میں خاموشی حیرت بنی لفظوں کو تک رہی تھی جو سینے میں کہیں اٹک گئے تھے۔ کیا چیز تھی جس نے چپ سادھ لی تھی۔

کیا آواز؟

کیا سوچ؟

کیا لفظ؟

نہیں۔ شاید ضمیر نے چپ سادھ لی تھی اور ضمیر چپ سادھ لے تو گناہ بھی نیکی کا روپ دھار لیتے ہیں۔ کہتے

ہیں، دنیا میں ہر نیا آنے والا بچہ اس بات کا اعلان ہے کہ اللہ ابھی بندوں سے ناامید نہیں ہوا۔ بالکل اسی طرح ضمیر زندہ رہے تو یقین رہتا ہے، ابھی ناامیدی خودکشی کی سمت نہیں بڑھی اور یہاں...... یہاں ضمیر نے چپ سادھ لی تھی۔ خودکشی کرنے والا انسان بقول جبران اپنی ذات کے دفاع میں ناکام ہو کر خودکشی کرتا ہے لیکن ناامید ہو کر کوئی زندہ ہوتے ہوئے مر جائے، وہ خودکشی سے بھی بڑھ کر عذاب ہے۔ اپنی ذات کا دفاع، سچ، امید آپ دونوں ہاتھوں سے صرف خوش وقتی کے لیے قربان کر دیں۔ اس سے زیادہ زندگی کے ساتھ کیا مذاق ہو سکتا ہے اور یہی مذاق بھرا طنز تھا کہ طارق بن فاروق نے چپ سادھ لی تھی۔

صبا احمد، سرمد احمد، صریحہ جلال اسے دکھ سے دیکھ رہے تھے۔ کتنی دیر وقت ایسے ہی رکا رہا، تب سرمد احمد اٹھا، طارق کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"تم جو کچھ کہہ رہے ہو، سب سچ ہے۔ تم جس اذیت سے گزر رہے ہو، وہ سچ ہے لیکن تم یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ اگر کرپشن، مافیا، برائی کی کوئی حد نہیں ہے تو ہم اپنے اندر کی اچھائی کو کیوں حدوں میں باندھ کر رکھیں۔ بہہ جانے دو ان آنسوؤں کو طارق! آنسو نمکین سمندر سہی لیکن سمندر زندگی دیتا ہے۔ صحرا کیوں بنتے ہو، سمندر کا ہاتھ تھامو۔ اپنا سفر ان لوگوں کے لیے کیوں کھوٹا کرتے ہو جن کا نہ کوئی ملک ہے، نہ مذہب، نہ وفاداری۔

وفادار لوگ بھلے امر نہ ہوں، بھلے ان کے سینے پر کوئی تمغہ نہ ہو لیکن ان کی اپنی ذات میں جو کچھ کر جانے کا جذبہ ہوتا ہے نا، وہ ساری زندگی کو سرشار رکھتا ہے۔ ناامیدی حد سے بڑھے تو ایک جگہ آ کر اپنی حیثیت کھو دیتی ہے اور امید اس کی کوئی انتہا نہیں، یہ لامحدود ہے کیونکہ امید اللہ سے ملاتی ہے، اللہ یاد کراتی ہے۔ امید دعا کو ذائقہ بخشتی ہے، امید ہارنے نہیں دیتی اور جو نہ ہاریں، انہیں کبھی نہ کبھی جیت کا میڈل ضرور ملتا ہے اور ہماری جیت تو یہ ہے کہ ہمارا سفر نہ رکے، ہمیں چلنا ہے، چلتے رہنا ہے، حرکت زندگی ہے طارق! اور زندگی سے منہ موڑنا کفرانِ نعمت ہے۔"

طارق بن فاروق، سرمد احمد کو دیکھتا چلا گیا۔ گم صم سرمد احمد نے اس کے اندر کے ابال کو محسوس کیا تو کھینچ کر سینے سے لگا لیا اور وہ مایہ ناز صحافی بچوں کی طرح رونے لگا، اسے اپنا غم رلا رہا تھا۔ کچھ اپنوں کا بہت اپنا غم رلا رہا تھا اور کسی نے اسے چپ نہیں کرایا تھا۔ آنسو رک جائیں تو ذات کو زنگ لگ جاتا ہے۔ سو یہ آنسو بہنے دیے جانا ہی بہتر تھا۔

کتنی ساعتیں گزر گئیں جب وہ اپنے آپ کو کمپوز کر چکا تھا تو صریحہ جلال نے بڑھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

"اپنا سفر وہیں سے شروع کرو، جہاں سے ختم کیا تھا۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ تمہاری ذات کی نہیں، خود ہماری خوش امیدی کی زندگی کی لیے لڑی جانے والی سب سے اہم جنگ ہے۔"

وہ کچھ نہیں بولا لیکن اب اس کے قدموں میں لرزش نہیں تھی، اعتماد بولتا تھا وہ پھر سے ان لوگوں کو ورثے دے رہا تھا، جنہوں نے اس حادثے میں خود دکھی ہونے کے باوجود اس دکھ کو اوڑھ نہیں لیا تھا بلکہ اپنے سر کی ردا بھی دوسرے کے سر پر رکھ دی تھی۔ گرم جذبوں کی شال کسی اور کے کندھے پر رکھ کر بہت محبت سے کہا تھا۔

"سنو تم تنہا نہیں ہو، یہاں ہر شخص تمہارے لیے ہے جس کے اختیار میں جو کچھ ہے، وہ سب کچھ تمہارے لیے ہے جو کچھ کر سکتے ہیں، وہ کر رہے ہیں۔

حادثہ جتنا بڑا ہے، سنبھلنے میں بھی اتنا ہی وقت لگنا تھا مگر پھر بھی تیسری دنیا کے اس ترقی پذیر ملک نے ہار نہیں مانی تھی۔ طارق بن فاروق جیسے بہت سے لوگ تھے جو آگے کی طرف کا سفر جاری رکھنے کا ہنر رکھتے تھے۔

وہ آج کیمپ میں بیٹھا ہوا اپنے اخبار کے لیے یہاں کے حالات اور کارگزاری پر رپورٹ لکھ رہا تھا، صبا احمد اس کے خیمے میں داخل ہوئی تھی۔

”صبا.....! تم..... آؤ آؤ.....“ اس نے کرسی پر سے کتابیں ہٹا کر اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

”صبا احمد! تم اور اتنی خاموش، خیریت۔“ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا

اور وہ پھیکے انداز میں ہنس کر اسے دیکھنے لگی۔ بہت سارے پل بے ذائقہ گزر گئے، تب اس نے اپنی رپورٹ کو پن اپ کر کے پیپر ویٹ کے نیچے دبایا اور سنجیدگی سے بولا۔

”جب زندگی کی تحریک بننے والے چہرے بہت زیادہ خاموش ہو جائیں تو بہت حیرت ہوتی ہے۔ کیا ہو گیا ہے لڑکی! تم اتنا کیوں چپ ہو، کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟“

اس نے سر دائیں سے بائیں گھما کر خیمے کے اندر رکھی چیزوں کو پھر سے گنا۔ کیروسین لیمپ، ایک ہیٹر، کچھ کتابیں، چند جوڑوں سے بھرا بیگ اور ایک سلیپنگ بیگ، ایک میز، دو کرسیاں جہاں وہ دن بھر ہونے والے کام کی نگرانی کر کے اس کا شیڈول رکھتا تھا۔ یہاں اس جیسے بہت سے لوگ تھے۔ قافلہ بن گیا تھا۔

”کیا ہو گیا ہے صبا! تم چپ کیوں ہو۔ کیا ماحول سے گھبرا گئی ہو؟“ اس کا اشارہ زخمی ڈیڈ باڈیز اور ملبے تلے دبے افراد کی ڈیڈ باڈیز سے اٹھنے والی بو کی طرف تھا مگر اس نے نفی میں سر ہلا کر اسے دیکھا۔

”نیہا چوہدری کو جانتے ہیں آپ؟“ یکدم اسے لگا، اسے کسی نے جلتے شعلوں میں دھکیل دیا ہو۔ رنگ اڑ سا گیا۔

”تم..... تم نیہا کو کیسے جانتی ہو؟“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

”کل آپ فیلڈ میں مصروف تھے، تب میں نے آپ کا موبائل فون ریسیو کر لیا۔ انہوں نے کہا تھا، آپ جلد سے جلد رابطہ کریں۔ آپ کی فیملی میں کوئی مسز سرفراز ہیں جن کی طبیعت بہت خراب ہے۔“

”میری دادو ہیں وہ۔ ٹھیک ہے، میں فون کر لوں گا اور کوئی بات؟“

”نہیں اور کوئی بات نہیں۔“ طارق بن فاروق نے اس کا جائزہ لیا پھر کسی مشفق استاد کی طرح اس کے سر پر ہولے سے ہاتھ مار کر بولا۔

”چھوٹی سی لڑکی! کیا بڑی بڑی سوچیں پالے بیٹھی ہو۔ دیکھو، تم جیسی عمر کے بچے ہنستے کھیلتے گاتے اچھے لگتے ہیں۔ اپنی عمر کو اچھی یادوں سے جھولی بھر کر لے جانے دو۔ خالی ہاتھ لوٹانا، چاہے کوئی سائل ہو، کوئی دل یا وقت کسی کا بھی اچھا نہیں۔“ وہ چند لمحے رکا پھر بولا۔

”اب بتاؤ کیا بات پریشان کر رہی ہے تمہیں؟“

”سر! پتا نہیں مجھے کیوں لگتا ہے، آپ نے اگر شادی کر لی تو آپ اتنے مصروف ہو جائیں گے کہ پھر کوئی بھی انشو آپ کا ہاتھ نہیں تھام سکے گا۔“

”پاگل ہو لڑکی! ابھر دیکھو، ویسے تو ابھی فی الحال میرا شادی کا ارادہ نہیں لیکن اگر ہوا بھی تو تب بھی وطن پر بنی ایک ایسی ذمہ داری ہے جس سے کوئی محب وطن کسی بھی حالت، کسی بھی نوعیت میں درگزر نہیں کر سکتا۔ ابھی اسی ابنو پر، دیکھا، بڑے بڑے فوجی افسر، ادنیٰ یا عام نوعیت کی پوسٹ کے فوجی سب نے انسان ہونے کا ثبوت دیا اور تو اور وہ سارے فوجی ریٹائرڈ ہو چکے تھے، وہ بھی اس موقع پر پھر سے میدان کارزار میں اتر گئے ہیں اور صبا! یہی ذمہ داری ہے، یہی حب الوطنی۔ یہ احساس زندگی کے ختم ہونے سے پہلے تو نہیں مٹ سکتا۔“

صبا احمد کے چہرے پر پہلے جیسی تازگی آ گئی جیسے اس کے سر کا بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو، وہ مصروف تھا، اس لیے وہ اٹھ کر چلی گئی پھر سرمد احمد اور صبا کو اپنی تعلیمی اور بزنس سرگرمیوں کے لیے واپس اسلام آباد آنا پڑا لیکن اس کا رابطہ طارق سے مسلسل تھا۔ صریحہ جلال حکومتی نوعیت کے پروگرام میں شامل تھی، اس لیے ان کی شادی ملتوی ہو گئی تھی۔ سرمد کا خود بھی حالات سے اتنا دل گھبرا گیا تھا کہ وہ بھی کچھ وقت چاہتا تھا۔

وہ سب اپنے اپنے دائروں میں سفر کر رہے تھے کہ ایک دن صبا احمد سے نیہا چوہدری آن ملی۔ وہ پہلی نظر میں بہت دلکش، بہت خوبصورت لگتی تھی مگر نجانے کیوں صبا احمد کو اس نے بہت زیادہ متاثر نہیں کیا۔

”میں نیہا چوہدری ہوں، طارق کی فیانسی۔“ وہ کھلے دل سے ملی ضرور مگر اپنی ذات کی نمائش اس میں ہر جذبے سے زیادہ تھی جو متاثر نہیں کر پا رہی تھی۔

”آئیے، آپ بیٹھیے۔“ وہ اسے ڈرائنگ روم میں لے کر آ گئی۔ ملازم کو کافی کا کہہ کر وہ واپس اس کے سامنے بیٹھی تھی کہ اس کی بات پر چونک گئی۔ سوال ہی اتنا احمقانہ تھا۔

”تم بہت کم عمر ہو۔ لوگ تم سے متاثر تو بہت ہوتے ہوں گے، تمہارے چہرے پر تازگی نہ ہو، تب بھی تمہاری کم سنی کتنے دلوں کو تمہاری طرف کھینچتی ہو گی؟“

”میں آپ کی ان باتوں کا مطلب نہیں سمجھ سکی ہوں۔“ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی اور وہ یکدم بپھر گئی۔

”تم میری بات کا مطلب نہیں سمجھیں۔ ہاں واقعی تم میری بات کا مطلب کیسے سمجھو گی، تم نے میری طرح کی اذیت کب سہی ہے۔ تم جب چاہو، طارق کی آواز سن سکتی ہو، بات کر سکتی ہو اور میں پچھلے تین مہینے سے کوشش کے باوجود اسے نہ دیکھ سکی ہوں، نہ مل سکی ہوں۔ وہ دادو سے ملنے آیا تھا لیکن مجھ سے ملے بغیر چلا گیا۔ شاید اس کے خیال کے آسمان پر کسی اور کے نام کا ستارہ چمکنے لگا ہے۔ ہے نا۔“

اس نے کافی کا مگ ہاتھ سے رکھ دیا پھر سرد لہجے میں بولی۔

”آپ کسی بہت بڑی غلط فہمی کا شکار لگتی ہیں مس نیہا چوہدری! آپ کو معلوم ہونا چاہیے، وہ میرے لیے بہت معتبر مقام رکھتے ہیں۔ ہمارا کوئی رشتہ نہیں لیکن ایک ہی طرح کی بات سوچنا کسی ایک مقصد کے لیے انرجی خرچ کرنا خود اتنا خوبصورت جذبہ ہے کہ پھر کسی وقتی ابال سے پیدا ہونے والا جذبہ اس کے آگے بے وقعت لگنے لگتا ہے لیکن شاید یہ بات آپ نہیں سمجھ سکیں گی اور شاید یہی وجہ ہے کہ سر طارق بھی آپ سے خاطر خواہ انسیت نہیں رکھ پائے۔“

نیہا چوہدری یک دم کھڑی ہو گئی پھر کچھ کہے بنا تن فن کرتی آگے بڑھ گئی۔

رات گئے جب وہ طارق بن فاروق کو فون کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی، وہ بہت اچانک کھانے کے

وقت گھر چلا آیا۔ سرمد احمد، پاپا، صبا احمد، سب اسے دیکھ کر خوش ہو گئے تھے۔ وہ کھانے کی میز پر بھی وہیں کے حالات ڈسکس کر رہے تھے، جب سرمد نے بہت سنجیدگی سے کہا تھا۔

"طارق! برف باری شروع ہوتے ہی وہاں کا سیٹ اپ ٹھیک رکھنا اور مشکل ہو جائے گا۔ معذور، بھوکے، پیاسے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے پریشان حال لوگ جو اس قدر دکھ تلے دب گئے ہیں کہ اپنوں کا غم بھی نہیں منا سکے اور زندگی کی جدوجہد کے لیے پھر سے جت گئے۔ طارق! پورے ملک سے اس قدر امداد گئی ہے۔ دوسرے ممالک بھی بھیج رہے ہیں مگر ابھی تک ہزاروں لوگ آسمان تلے بے سروسامان کیوں دکھائی دے رہے ہیں؟ یہ کس کی کوتاہی ہے؟"

طارق خاموشی سے گلاس سے گھونٹ گھونٹ پانی پیتا رہا جیسے اندر کسی آگ پر پانی ڈال رہا ہو پھر خود کو کمپوز کر چکا تو بولا۔

"مارگلہ ٹاور دو بلڈنگز تھیں، اس معاملے میں انتظامی مشینری کس قدر مشکل سے معاملات کی چھان بین کر سکی ہے پھر سرمد! یہ تو اتنے بڑے علاقے ہیں۔ کہیں کہیں انتظامی خامیوں کا بھی ہاتھ ہے لیکن پھر بھی بڑی بات یہ ہے کہ کام اور سفر رکا نہیں ہے اور جو سفر رک نہ سکے، کسی مشکل کے آگے جھک نہ سکے۔ اسکی منزل کہیں قریب ہی ہوتی ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا اب لوگوں میں شعور ہے، وہ بہت آسانی سے کوئی بات آمنا صدقنا نہیں کرتے، وہ ہر چیز کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں اور جتنا ممکن ہو، اس میں اپنا حصہ بھی ڈالتے ہیں جو کچھ پہلے ہو چکا، اب ایسا کچھ کرنا آسان نہیں۔ وہ بچے جن کا کوئی نہیں زندہ بچا انہیں بھی لوگ گود لے رہے ہیں اور وہ بچیاں جن کے دور قریب کا کوئی رشتہ دار نہیں ہے، انہیں بھی بے یارو مددگار نہیں چھوڑا گیا۔" یکدم وہ چپ ہو گیا، بس اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ صبا احمد کو اچنبھا ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ اس کی اس چمک کی وجہ ڈھونڈ پاتی ملازم کے ساتھ نیہا چوہدری سامنے آن کھڑی ہوئی۔

"تمہیں اس گھر میں آخر کیا دکھتا ہے جو تم کہیں اور نظر نہیں کر پاتے؟" سرمد احمد کے چہرے پر غصہ نظر آیا۔ وہ طارق بن فاروق تھا جو بہت مطمئن بیٹھا تھا۔

"میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں، آخر کیا دکھتا ہے تمہیں اس لڑکی میں جو مجھ میں نہیں ہے۔"

"تمہیں گفتگو کرنے کی تہذیب بھول گئی ہے نیہا! اور تم جانتی ہو یہاں سب بہت مہذب اور معتبر لوگ بیٹھے ہیں۔" نیہا چوہدری کچھ نہیں بولی، اسے گھورتی رہی پھر مٹھی کھول کر چیخی۔

"یہ کیا ہے طارق؟" طارق نے ٹیبل پر دھری ہیرے کی انگوٹھی کو دیکھا پھر واپس ٹیبل پر ڈال کر بولا۔

"یہ انگوٹھی ہے میری اور تمہاری منگنی کی۔ پہلے میرے پاس تھی لیکن اب یہ تمہارے پاس ہے، میں نے کل ہی داور کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔"

"یہ فیصلہ تم اکیلے کرنے والے کون ہوتے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے، میں کس کی بیٹی ہوں؟"

"میں جانتا ہوں۔" اس نے متوازن انداز میں اسے دیکھا پھر ٹشو سے ہاتھ صاف کر کے کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

"میں جانتا ہوں، تم کس کی بیٹی ہو لیکن شاید تم بھول گئی ہو کہ میں نے کبھی تمہارے پاپا کے امپائر اور بزنس سے متاثر ہو کر تم سے محبت نہیں کی تھی۔ محبت تو بس ایک لہر کی طرح میرے دل سے اٹھی تھی، تمہیں دیکھ کر پہلی بار میں نے محسوس کیا تھا کہ تم میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جس کی وجہ سے تمہیں چاہا جا سکتا ہے۔ تمہاری سوچ اور تم سب سے

پہلے میرے دل کی سیڑھیاں اتری تھیں، تمہاری صورت کا عکس تو بہت بعد میں آئینۂ دل نے منعکس کیا تھا۔ کتنی حیرت کی بات ہے، تمہارا چہرہ ہر چیز سے بہت پہلے میری آنکھ سے ٹکرایا تھا لیکن میرے اندر وہ سب سے آخر میں اتر سکا اور جانتی ہو، محض چہروں سے محبت میں کبھی نہ کر سکا۔ سو جب تم میں اچھی سوچ نہیں رہی تو میں نے اس بندھن کو برقرار رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔"

"تم پچھتاؤ گے طارق بن فاروق! تم بہت پچھتاؤ گے۔ میں کسی کو آسمان تک لے جا سکتی ہوں تو زمین پر منہ کے بل گرانا بھی آتا ہے مجھے۔" اس نے غصے میں ٹیبل پر ہاتھ مارا اور وہ اس کے سامنے آ گیا۔

"منہ کے بل گرانا۔ تمہیں آتا ہے نیہا! ایک یہی کام تو تمہیں آتا ہے۔ میرا دل، میری محبت گواہ ہے اس بات کی لیکن تم اس محبت کے چکر میں کب پڑی ہو جو سمجھو گی۔ تمہیں تو صرف شہرت، نمائش بس اسی کی طلب ہے اور یہ سب تو تمہارے پاس موجود ہے۔ تم نے کچھ نہیں کھویا نیہا! تم نے کچھ نہیں کھویا لیکن کسی نے کیا گنوا دیا ہے، یہ تم کبھی نہیں سمجھو گی، کبھی بھی نہیں۔" آواز میں ضبطِ گریہ کی جھلک آنے لگی تھی۔ تب ہی اس نے پشت کر لی تھی۔ "تم جا سکتی ہو اب اور بھول جانا ہم کبھی ملے تھے۔" وہ پیر پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔ سرمد اس کے قریب چلا آیا۔

"غلطی ..... میں نے نہیں، غلطی میرے دل نے کی ہے سرمد! مگر دیکھو تو سزا سارے وجود نے پائی ہے۔ تمہیں نہیں پتا یہ لڑکی کتنی بری سوچ رکھنے والی ہے۔ ساری دنیا جب مجھ پر الزام لگا رہی تھی تو یہ میری پشت پر کھڑے ہونے کے بجائے میرے سامنے کھڑی تھی اور اس کی آنکھوں میں شک...... مجھے اس شک نے مار دیا تھا۔ میں اس تکلیف سے نبرد آزما ہی تھا، جب اس کے لب ہلے تھے۔

"کیا واقعی تم نے یہ کرپشن کی ہے طارق؟"

مجھے لگا میرے اندر جو ہلکا سا سانس کا واہمہ رہ گیا تھا، وہ بھی چور چور ہو گیا۔ میری آنکھیں اس پر جمی رہ گئی تھیں اور اندر کوئی مر گیا تھا، تب وہ پھر سے بولی تھی۔

"میرے پاپا ایک وائٹ کالر بزنس مین ہیں، انہیں تمہاری اس بدنامی سے بہت نقصان ہو گا۔ لوگ کیا سوچیں گے، ہم کیسے کیسے لوگوں سے واسطہ رکھتے ہیں۔ طارق! جب تک یہ معاملہ دب نہیں جاتا، تم مجھ سے نہ ہی ملو تو اچھا ہے۔ میں کسی اچھے دن کی امید میں آج تم سے رخصت ہو رہی ہوں۔"

وہ چلی گئی تھی سرمد! اور مجھے لگا تھا۔ اس پل میرے اندر سے میرا مان، بھرم، امید ہر چیز رخصت ہو گئی تھی۔ میں خالی ہو گیا تھا، بالکل خالی۔ میرے اپنے گھر والے مجھ سے کترانے لگے تھے، تب میں نے خود سے کہا تھا۔ طارق فاروق! تم مر چکے ہو، تمہیں زندگی کی حسرت کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ وجود میں انسان مر جائے تو یادیں دل میں کرلاتی رہتی ہیں لیکن اگر انسان زندہ ہو اور دل میں مر جائے تو کوئی امید آسرا نہیں بنتی۔ میرے اندر ساری امیدیں مر گئی تھیں، تب ہی اس شہر میں آ گیا تھا۔

سرمد! تم نہ ہوتے صبا اور پاپا نہ ہوتے، تو صریمہ جلال اور ان کے پریس کولیگ نہ ہوتے تو شاید میرے اندر جو زندگی گلیشیئر بن گئی تھی، وہ کبھی نہ پگھلتی۔ سو یہ کیسے ممکن ہے جو محبت کہیں اور سے دامن میں ڈالی گئی، اس محبت کی سے کسی اور کے دل کو بہلایا جائے۔ سرمد! یہ میرے اختیار کی چیز نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے مجھے پہلی طرح سے محبت کرنا

آئے یا یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کی آنکھ میں بھڑکتی یہ محبت نام کی جزا میرا نصیب بن ہی جائے لیکن سرمد! محبت کا سفر ہمیشہ بے فیض دکھائی دیتا ہے لیکن تمہیں نہیں لگتا، یہ سفر کبھی بھی رائیگاں نہیں جاتا، کبھی رائیگاں نہیں رہتا۔“

سرمد احمد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے دباتے ہوئے گویا اس کی بات کی تصدیق کی۔

صبا احمد چائے لینے چلی گئی۔

وہ سب واپس لوٹے تو طارق بن فاروق نے لیپ ٹاپ کھول لیا تھا۔

اس کی آنکھوں کی چمک پھر لوٹ آئی تھی۔ لیپ ٹاپ پر کچھ ساعت بعد ایک لڑکی کی تصویر ابھر رہی تھی۔ صبا احمد کے ستے ہوئے چہرے پر دھیرے دھیرے مسکراہٹ اتر آئی تھی۔ تباہ شدہ علاقے کی ایک لڑکی جس کی آنکھوں میں خواب بھر گئے تھے۔ طارق اور وہ لڑکی سادہ سے جوڑے میں گہرے عمیق بندھن میں بندھے کھڑے تھے۔

”آپ نے شادی کر لی سر؟“ سرمد اسے مبارک باد دے رہا تھا اور پاپا اسے دعائیں۔ وہ خاموش کھڑا تھا۔

جب صبا احمد نے سرمد کو چھیڑا۔

”کچھ شرم کرو بھائی! دیکھو سر طارق آپ سے بازی لے گئے۔ آپ کب بنو گے دولہا، شادی کرنے کا ارادہ ہے یا نہیں۔“ سرمد احمد مسکرانے لگا پھر اطمینان سے بولا۔

”طارق نے جو نیکی کمائی ہے، بظاہر میری شادی اس اجر سے خالی ہے لیکن تم سب کی محبتیں، دعائیں اس خوشی کے لیے ڈھارس کی طرح ہیں۔“ طارق بن فاروق یقین سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مسکرایا۔ سریہ جلال، صبا احمد کی فون پر دی جانے والی حکمیہ شادی کی تیاری پر ہنستے ہوئے خوابوں کو اپنی آنکھوں میں در آنے کی راہ دے بیٹھی۔ بڑے ے کمرے کے کسی کونے میں محبت تھی، زخم زخم تھی پھر بھی دعا کی طرح سایہ فگن ہونے کے لیے تیار بیٹھی تھی اور دل تھا جو یقین بھر کر زندگی سے کہتا تھا۔

”تیرے ہوتے ہوئے کوئی محبت سے بڑھ کر بھی جزا ہو گی؟!“

اور زندگی مسکرا کر چپ تھی، صرف محبت اطراف میں بولتی تھی محبت رس گھولتی تھی۔

* * *

دل کے رنگوں میں

اس وقت وہ کالج سے نکلی ہی تھی کہ اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے ہی رہ گئی۔ اس نے اچٹتی سی نظر دوبارہ سامنے ڈالی اور ثابت ہوگیا کہ وہ خواب تھا نہ خیال بلکہ واقعی ایک جیتا جاگتا وجود لیے اس کے سامنے کھڑا تھا اور اس کا صبح کا خیال ''ہوگا کوئی بے چارہ'' غلط ثابت کر رہا تھا۔ ورنہ گھر سے اپنے ساتھ ساتھ سفر کرتے اس شخص کو دیکھ کر اس کا یہی گمان تھا کہ ہوسکتا ہے اس کا روٹ بھی یہی ہو۔ دراصل بات یہ تھی وہ ہمیشہ منفی پہلو سے مثبت پہلو نکال ہی لیا کرتی اور ساتھ ہی ساتھ اسے گمان تھا جس طرح وہ دنیا کو سادگی اور سچائی سے دیکھتی ہے دنیا میں اور رہنے والے بھی اسی طرح سوچتے اور سمجھتے ہوں گے۔ دنیا اس کے لیے کتابوں کی خوبصورتی اور خیالوں کے جنت کے مخمل جیسی اصلی اور حسین و مصفا ہوا کرتی تھی اور شاید اس کا یہی سبب تھا کہ آج تک اس نے جہاں سانسیں لی تھیں وہاں ایسے ہی خیالوں کا ڈیرا رہا کرتا تھا۔ پیار محبت سے گوندھی گئی اماں تھیں۔ پرشفقت ماموں جان تھے۔ ممانی جان تھیں تو تنک چڑھی تھیں مگر پھر بھی تکلیف کے وقت وہ بھی برکھا سایہ بن جاتی تھیں۔ تین کزنز تھیں اور اس کی اپنی پانچ بہنیں، سب مل جل کر یوں رہتے کہ بس وہ ٹکڑا اسے زندگی محسوس ہوا کرتا۔ زندگی جو مہکار تھی، چہکار تھی مگر یکدم ہی چہکاریں دم توڑنے لگی تھیں اور دل میں عجیب طرح کا ہراس اور خوف پھن کاڑھے بیٹھ گیا تھا۔

''آخر یہ شخص ہے کون اور میرے تعاقب میں اسے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟'' اس نے شوز زمین پر ہولے ہولے بجا کر کئی بار سوچا پھر ڈرتے سہمتے سڑک پر اپنی بس کا انتظار کرنے لگی۔ چار قدم دور وہ شخص ابھی تک اس کی طرف متوجہ تھا۔ بظاہر اس کی نگاہیں سامنے تھیں لیکن عائنہ حاکم کی حسیات برملا کہہ رہی تھیں کہ وہ مکمل اس کی طرف ہی مرکوز ہے شکر خدا کا یہی تھا کہ اس نے ابھی تک بدتہذیبی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا ورنہ اکیلے وہ اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکتی تھی۔ لڑکیاں اور بھی کھڑی تھیں مگر اس کی توجہ کسی اور طرف نہیں تھی اور عائنہ حاکم یہی وجہ تھی کہ خود کو غیر محفوظ محسوس کرنے میں حق بجانب تھی۔ اس وقت کچھ بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دلی طور پر سہمی ہوئی ہونے کے باوجود اعتماد سے کھڑی ہی رہی یہاں تک کہ بہت دیر بعد اس کے روٹ کی بس اس کے سامنے آرکی۔ وہ بھی بہت سارے لوگوں کے ساتھ بس میں سوار ہوگئی۔

سیٹ پر بیٹھی ہی تھی کہ اس کا چہرہ فق ہوگیا۔ وہ شخص سامنے ہی کھڑا تھا۔ درپردہ اس کی تمام توجہ بھری ہوئی بس میں خود کو بیلنس رکھ کر کھڑے ہونے میں صرف ہو رہی تھی مگر عائنہ حاکم کو اب بھی پیچھے والا احساس حاوی لگ رہا تھا۔ دل

ہی دل میں وہ دعا کر رہی تھی کہ جلد سے جلد گھر آ جائے حقیقتاً یہ بچکانہ سی دعا تھی اس لیے مطلوبہ وقت پر ہی اس کا گھر آیا۔ بس روک کر وہ اسٹاپ پر اتری، سڑک کراس کرتے ہی دوسری سمت میں اس کا چوتھا بنگلہ تھا مگر پاؤں ایسے من من بھر کے ہو گئے تھے کہ یہ فاصلہ صدیوں لمبا لگنے لگا تھا۔ وہ تیز تیز سانسوں کے ساتھ سڑک کراس کر کے دوسری طرف پہنچی تو بے ساختہ اس نے مڑ کے دیکھا، وہ شخص اس سڑک پر کھڑا ہولے سے مسکرائے جا رہا تھا جیسے اب تک کی ساری کارروائی محض لطف اندوزی کی سادہ سی کوشش تھی۔

”جانے کیا سمجھتا ہے خود کو، میں کوئی ڈرتی ہوں اس سے۔“ اس نے گھور کے دیکھا پھر زمانے بھر کی تلخی سمیٹ کر ہنکارا بھر کر گردن موڑ لی۔ گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو ہیجانی کیفیت میں مبتلا۔ اعصاب کو ایسا ہی لگا جیسے وہ یکدم تپتی دھوپ سے گھنے سائے میں آ گئی ہو، یہ گھر کس قدر مختصر اور سادہ سا لفظ ہے مگر اس عام اور سادہ لفظ میں کتنی آسودگی، کتنا تحفظ ہے۔

اس نے چادر سر سے اتارتے ہوئے اندر کی طرف قدم بڑھائے مگر ڈرائنگ روم میں اماں کی تیز تیز آواز میں بولنے کی آواز سن کر وہ متحیر رہ گئی۔ یہ طرز تخاطب اماں کا کبھی نہیں رہتا تھا۔

وہ تو ہمیشہ اتنا ہلکا اور آہستہ بولتی تھیں کہ ایک بات کے لیے اسے کئی بار ٹہوکا دینا پڑتا اور ماموں جان کہتے۔

”بڑی سعید روح ہے میری بہن کی، یہی تو بولنے کا اصل لہجہ ہے، مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتیں وہ خواتین جو چلا چلا کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ نرمی میں جو تاثیر ہے وہ سختی میں کہاں، جیسے بولنے سے زیادہ اثر خاموشی میں ہوتا ہے۔“

اور وہ ہنس پڑتی ”سچ کہتے ہیں ماموں! اماں واقعی نایاب لوگوں میں شمار کرنے کے قابل ہیں۔ آئندہ صدی میں یہ نادر و شاہکار وجود دوبارہ دنیا میں بھیجے جانے کا کوئی امکان نہیں۔“

اماں گھور کے دیکھتیں تو وہ ہنس کر ان کے گلے میں جھول جاتی پھر یقین دلانے والے لہجے میں کہتی۔

”اماں! آئی سوئیر، آپ اپنے وجود میں ایک نادر اور ماسٹر پیس ہیں۔ کاتب قدرت نے آپ کو تخلیق کر کے تخیل کا قلم توڑ دیا ہوگا۔“

”چل ہٹ، مت بنایا کر۔“

”میں کیا بناؤں گی۔ آپ کو تو اللہ نے خود اتنی فرصت سے بنایا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔“

اور اماں کے پنکھڑی سے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہلکورے لینے لگتی، اور وہ ہاتھوں کا پیالہ بنائے ٹکٹکی باندھے انہیں تکے جاتی۔ میدے کی طرح شفاف رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، لمبی پلکیں، ستواں ناک، سڈول جسم، لمبے کالے بال جن میں وقت نے کہیں کہیں چاندی بکھرائی تھی مگر لگتا تھا یہ ان کی ریاضت کا صلہ تھا کہ بادشاہ وقت نے ان کے ماہ و سال کو چاندی کی افشاں سے روپہلا کر دیا تھا مگر اس وقت حیرت انگیز طور پر وہی اماں گھن گرج کے ساتھ تیز اور اونچا بول رہی تھیں، سو وہ حیرت سمیٹے ڈرائنگ روم کے دروازے پر آ رکی۔

ایک شخص سامنے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اور عائنہ حاکم کو پتا نہیں یوں کیوں لگا جیسے وہ اس چہرے کو جانتی تھی۔ بہت قریب سے، بہت حساسیت سے۔

"پلیز عاصمہ! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"نہیں۔ اب ایک لمحہ بھی نہیں ہے آپ کے لیے۔ جب آپ کو ہماری پروا نہیں تھی تو اب کیا یہ ضروری ہے ہم آپ کی ایک ہی پکار پر اٹھ کر چل پڑیں۔"

"صرف ایک پکار۔ عاصمہ! دو مہینے ہو گئے ہیں مجھے تمہارے در سے نامراد لوٹتے ہوئے۔"

"اور مجھے اسی بات پر حیرت ہے، یہ سب تو آپ کے مزاج کے بہت خلاف ہے۔ آپ تو ایک بات سے دوسری بات بھی نہیں سنتے تھے۔"

"ہاں وہ بھی میرے مزاج کا ایک پہلو تھا اور یہ بھی میرے ہی مزاج کا رخ ہے کہ میں چاہتا ہوں میں تمہیں اور اپنی بیٹیوں کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔"

"بیٹیوں کو حالانکہ آپ نے ان ہی بیٹیوں کی وجہ سے مجھ پر زندگی تنگ کر دی تھی۔ آپ کو تو ان معصوم وجودوں سے نفرت تھی ناں پھر کیونکر یہ نفرت محبت میں بدل گئی؟"

"صرف اس لیے کہ مجھے اب تم سب کی ضرورت ہے۔"

"محض ضرورت؟ یعنی اب بھی آپ کو محبت نہیں کھینچ لائی صرف ضرورت ہی کھینچ کر لائی ہے حاکم مرودا آپ...... شاید کبھی نہیں بدل سکتے۔"

"ہاں شاید! مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے مگر پلیز، ایک موقع تو دو! کیا پتہ میں بدل ہی جاؤں اب جب کہ میرے پاس نہ ماہ و سال کی نقدی ہے نہ بلند آہنگ غرور رہا ہے۔ سب میری طرح تھک گئے ہیں۔ عاصمہ! مجھے سہارے کی ضرورت ہے۔"

اماں نے غور سے انہیں دیکھا اور بے قراری سے پوچھا۔

"کیا کیا ہو گیا ہے آپ کو؟!"

اور بابا سائیں سہارا ملتے ہی ڈھے گئے۔ کسی چھوٹے سے بچے کی طرح رونے لگے۔ اماں قریب چلی آئیں اور عائشہ حاکم وہیں پردہ تھامے کھڑی رہی۔ کمرے میں بابا سائیں کی آواز بلکورے لے رہی تھی۔ وہ اپنے وجود کی دفاع کی آخری جنگ کی داستان سنا رہے تھے۔ جس میں میڈیکل نے ثابت کیا تھا کہ وہ ہارنے والے ہیں۔ وہی دل جس نے ہزاروں چہروں کو اس میں بسایا، اپنوں کو دربدر کر کے، آج وہی بااختیار دل بے اختیار ہو چکا تھا۔ وہ جو ہمیشہ خود فیصلہ کیا کرتے تھے۔ بناء کسی پس و پیش کسی خوف کے آج ان کے فیصلے کہیں اور ہو رہے تھے اور انہوں نے اپنی مسند اختیار و اقتدار سے اپنی بے دخلی کو محسوس کر کے محسوس کیا تھا کہ وہ اب تک دھوکے میں رہے تھے ورنہ اقتدار اور اختیار تو ہمیشہ اس رب کے پاس رہا ہے جس سے وہ سدا روگرداں رہے یا اگر یاد کیا بھی اسے تو یوں جیسے ایک عام روزمرہ کا کوئی کام، رب کو رب کی طرح انہوں نے کبھی مانا ہی نہیں تھا مگر اب ہر جگہ وہی مان اور وہی حاکم دکھائی دے رہا تھا اور بابا سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ایک نئے فیصلے کے منتظر اماں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں جیسے چاندی کے شفاف کٹوروں میں پہلی بارش کا پہلا پانی، وہ ضبط سے اماں کو دیکھتی رہی پھر بلک اٹھی۔

"اماں!" اماں نے چونک کر پشت کی طرف دیکھا۔

"عائنہ!" سر جھکائے بابا سائیں نے بھی چونک کر دیکھا۔ تین برس کی عائنہ حاکم، ان کی پہلی اولاد کس قدر بڑی ہو گئی تھی دو لمبی چوٹیاں گوندھے سفید یونیفارم میں اپنی ماں کی طرح ہی پاکیزہ روح لگ رہی تھی پاکیزہ روح یا شاید نیکی کی پری جس کا کام دلوں کا دکھ چننا اور غم بانٹنا تھا ازل سے اور ابد تک کے لیے۔

"بابا سائیں۔" وہ بے ساختہ اندر بڑھ آئی تو بابا سائیں بے وقت اٹھے اور اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور عائنہ حاکم نے پہلی بار اپنے باپ کے دل کی دھڑکن اتنے قریب اور اتنے غور سے سنی اور سوچا۔

"اتنے متوازن انداز میں دھڑکنے والا دل یکدم بھلا کیسے تھم سکتا ہے۔ ڈاکٹر تو یونہی اپنی قابلیت جھاڑتے ہیں ورنہ چھ بیٹیوں کے ہوتے، ان کی محبتوں اور دعاؤں کے ہوتے بھلا موت اس کے باپ کو کیسے اچک سکتی ہے۔ وہ سب اپنے باپ کے لیے حصار بن جائیں گی۔" اور وقت اس کی اس معصوم سوچ پر ہنس دیا، اور وہ بے خبر بابا سائیں کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے انہیں تسلیاں، دلاسے دیتی رہی۔ زندگی کا فلسفہ محبت کی زبان میں سنائے گئی۔ اس وقت اس کے ذہن سے صبح والا واقعہ بھی بھول چکا تھا۔ وہ مکمل طور پر اپنے پیارے سے بابا سائیں کی طرف متوجہ تھی جنہیں وقت نے بے طرح تھکا دیا تھا اور بابا سائیں اس کا سر اپنے زانو پر رکھے اب تک کی دوری کا سبب بتا رہے تھے۔ رنجیدہ شرمندہ سے کہ ایک وارث کے لیے انہوں نے کیسے کیسے نہیں عاصمہ حاکم کا دل توڑا۔ آج انہوں نے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ سب حقیقت گوش گزار کر دی تھی اور اس نے بابا کے سچ کے باوجود ان کی محبت میں اس ساری تشنگی اور محرومی کو پس پشت ڈال دیا تھا جو ماموں کی تمام تر محبت اور توجہ کے باوجود اس نے محسوس کی۔ پیرنٹ ڈے پے دل پر چرکے لگاتی اور سالگرہ پر ماموں کے دیے گئے تحفوں پر اس نے جو کمی محسوس کی، وہ کبھی نہیں پوری ہو سکتی تھی کیونکہ وہ ماہ و سال کبھی پلٹ کر نہیں آ سکتے تھے لیکن اب وقت کی طرح بابا سائیں پلٹ آئے تھے تو وہ ان کی آنے کی خوشی میں سب کچھ بھول گئی تھی، اسے سمجھوتہ کرنے کی پرانی عادت تھی اور بابا سائیں کا خیال تھا باقی سب بھی اسی طرح کا مزاج رکھتی ہیں لیکن دوپہر کو جب باقی بہنیں آئیں تو چار کو چھوڑ کر منجھلی والی اینہ حاکم اپنے ماہ و سال کا حساب لینے بیٹھ گئی۔ وہ جو ہمیشہ خاموش رہتی تھی آج بے تکان بول رہی تھی اور بابا سائیں تھے خاموش سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"اینہ پلیز بابا سائیں کی طبیعت کا کچھ خیال کرو۔"

اینہ نے گھور کے عائنہ کو دیکھا پھر نخوت سے بولی۔

"کیوں صرف میں ہی کیوں کروں ان کا خیال، انہوں نے کبھی ہمارا خیال کیا؟ آخر ان کا تعلق ہی کیا تھا میری ماں سے، صرف اتنا کہ ہر سال دو سال بعد اماں کے پاس آ کر اجازت نامے پر دستخط کرواتے اور نئی شریک سفر کے ساتھ چند قدم اور آگے بڑھ جاتے پیچھے اڑتی دھول سے بے پرواہ جوان کے سرپٹ دوڑنے سے اڑتی، اڑتی ہم کہیں دکھائی ہی نہ دیتے۔ یہ ہیں عائنہ! ہمارے بابا سائیں، جنہوں نے کبھی پروا نہیں کی ان کے ہوتے ہم کتنے لاچار و بے بس تھے، کتنے غیر محفوظ تھے۔ ایک بیٹے کی خواہش میں انہوں نے ہمیں کتنا رد کیا، بے کیا ہم یہ سب بھول سکتے ہیں؟"

عائنہ نے کھینچ کر اینہ کو گلے سے لگا لیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بابا سائیں نے ہولے سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تو وہ عائنہ کو چھوڑ کر ان کے سینے سے آ لگی۔ ہچکیوں سے روتے ہوئے بولی۔

"بابا سائیں! آپ نے ہمیں بھلائے رکھا مگر آج تک ہم اس پر قادر نہیں ہو سکے کہ آپ جو ہماری زندگی میں

نہیں تھے تو ہم بھی آپ کو بھول جاتے۔ آپ کا وجود بظاہر ہماری پہنچ سے بہت دور تھا لیکن بابا سائیں! اماں سائیں کی باتوں میں اور ہمارے خوابوں میں ہمیشہ آپ کا ایک ہیولہ تراشیدہ رہا۔ آپ کے قدم ہمیشہ ہماری دہلیز پر ثبت تھے حالانکہ آپ نہیں تھے پھر بھی ہمیں لگا کہ آپ آنے والے ہیں۔ انتظار بہت جاں گسل ہوتا ہے بابا سائیں! آپ جانتے ہیں یہ۔!"

"ہاں! میں جانتا ہوں بیٹا! تب ہی تم تک تم سے ملنے آیا ہوں۔ انتظار صرف تم نے نہیں میں نے بھی کیا تھا مگر اس وقت مجھے اپنی احتیاجات اور جذبات کی سمت معلوم نہیں تھی یا پھر ایک وارث کا اس قدر خفقان تھا، اس شوریدہ خواہش کا مجھ پر اتنا اثر تھا کہ مجھے کچھ اور دکھائی ہی نہیں دیتا تھا، مجھے ہر اس چیز، ہر اس شخص سے نفرت تھی جو میری راہ میں رکاوٹ بنے۔ میں نے کتنے بے بس اور معصوم ہاتھوں میں آزادی کے پروانے پکڑا دیے۔ کتنوں کی خواہش کے قتل عام میں میری یہ خواہش ہراول دستہ رہی، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کبھی نہیں رہی تھی، مگر وہ وقتی پہچانا جاتا ہے۔ اس وقت زیادہ، جب اپنے ارادے اور عزم شکست خوردہ اور ریت کی دیوار ثابت ہوں۔ میں نے بھی اسے پہچانا، اس وقت جب میرے پاس ہارنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ ہاں صرف ایک آس تھی کہ شاید میں ہار کر بھی جیت جاؤں، شاید میرا بھی کہیں انتظار کیا جاتا ہو، امینہ! بس یہی تمنا اس دہلیز تک لائی ہے مجھے لیکن تمہارا دل صاف نہیں تو میں تم پر بلکہ کسی پر بھی جبر نہیں کروں گا۔"

"نہیں بابا سائیں! ایسا تو نہ کہیں۔ آپ کا تو ہم پر بہت حق ہے۔ ہم آپ ہی کی محبت کا حصہ ہیں۔"

عائنہ حاکم نے بابا سائیں کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا تو باقی چاروں بیٹیاں بھی ان کے قریب آ گئیں۔ ماموں نے مسکرا کر بابا سائیں کو مبارک باد دی پھر ہنس کر بولے۔

"حاکم بھائی! مانتے ہو نا بیٹیوں کے معصوم محبت کی کشش کو؟"

"ہاں افسر بھائی یہ بیٹیاں بہت میٹھی اور شریں، دل سے لگا کر رکھی جانے والی نعمت ہوتی ہیں۔ میں پتہ نہیں کیوں اتنے عرصے تک یہ کفران نعمت کرتا رہا شاید یہ بیماری بھی اس ناشکرے پن کا شاخسانہ ہے۔ یہ میری سزا ہی تو ہے افسر بھائی کہ میرے دل نے ابھی دھڑکنا سیکھا ہی تھا کہ اب رکنے پر کمر بستہ ہے۔ میں اس شہد آگیں احساس سے روح کو سیراب کرنا چاہتا ہوں اور بلاوے کی گھنٹیاں ہیں کہ مسلسل بجے جا رہی ہیں ابھی تو میں نے انہیں ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں ہے، پیار بھی نہیں کیا اور۔"

"اور کچھ بھی نہیں ہے آپ کو! ڈاکٹر تو بکتے ہیں۔ اتنی پیاری پیاری بیٹیوں کے ہوتے بھلا آپ کو کیا ہو سکتا ہے۔ ہم ہیں ناں آپ کی ڈھال، آپ کا ہتھیار، آپ کے جینے کی آس۔"

بابا سائیں کی غلافی آنکھوں میں سکون لہریں لینے لگا مگر اس سکون میں غم آلود سکوت بھی تھا جیسے یہ سب کچھ محض دل بہلاوے کا سامان تھا ورنہ حقیقت میں زندگی گھونٹ بھر تو بچی تھی۔ سینے سے نکلتی تو پہنچتی یا نہ پہنچتی کسے خبر تھی مگر وہ پھر بھی آس سے دل کو تھپکتے ہوئے کھلکھلاتی چہکارتی زندگی کی طرف متوجہ ہو گئے کہ سچ تو یہی سب کچھ تھا وہ ہی تھے جو اس سے کتراتے آ رہے تھے، اور وہ چھوٹی تھیں کہ دیوانوں کی طرح پھر لیے بناء ان سے اتنے لمبے عرصے کی دوری میں ہونے والے حادثے، خوشیاں سب ہی کچھ شیئر کر رہی تھیں، ان کی تنہائی پر بلک رہی تھیں اور انہیں دلاسے دے رہی تھیں۔

"یہ رشتہ کس قدر آفاقی، کس قدر حسین ہے۔" وہ صوفے کی پشت سے سر ٹکائے سوچے جا رہے تھے اور وہ

سب ان میں مگن تھیں۔ پورے خلوص اور سچائی سے۔

☆

اس وقت وہ بستر پر اوندھا پڑا تھا۔ بظاہر اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن پھر بھی اس کے جذبات اس کے چہرے پر نقش تھے۔ لگتا تھا، وہ کسی اندرونی جنگ کا شکار تھا۔ کبھی رنگ سرخ پڑ جاتا، کبھی جلال سے یہ رنگ دوآتشہ ہو جاتا اور کبھی اس کے چہرے پر ملاحت آ جاتی۔ بھوری مونچھوں تلے خوبصورت ہونٹ مسکرانے لگتے مگر مسکراہٹ گہری بھی نہ ہونی کہ ہونٹ بے سبب بھینچ جاتے۔ چہرے کے خال و خد ایک بار پھر کھنچ جاتے۔ کتنی دیر سے وہ ان ہی خیالات کا شکار تھا کہ اچانک فلیٹ کا دروازہ کھلا۔ ایک نوجوان ہاتھوں میں کھانے پینے کا سامان لیے اندر داخل ہوا۔ دروازہ اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے کھولا تھا۔ بستر پر لیٹے ہوئے نوجوان نے صرف ایک بار سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر تکیے پر سر ڈال کر دوبارہ سے خیالات کا تانا بانا وہیں سے جوڑنے لگا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ آنے والے نوجوان نے سرسری کی نظر اس پر ڈالی پھر کچن میں سامان رکھ کر آیا اور اس کے قریب ہی بیڈ پر آرام سے بیٹھ گیا پھر ملائمت سے بولا۔

‘‘تمہیں آج پھر بیزاری کا دورہ پڑ گیا۔ صبح تو اچھے بھلے تھے پھر یہ اچانک؟’’

‘‘بس ویسے ہی دل نہیں چاہ رہا کچھ کرنے کو۔’’

‘‘آخر دل کو ہوا کیا ہے؟’’ لحہ بھر کو وہ رکا پھر آہستگی سے بولا۔ ‘‘میں دیکھ رہا ہوں ضمان! تم اس شہر میں آ کر یکسر بدل گئے ہو۔ ہم میں کوئی بات بھی راز نہیں رہتی تھی لیکن یہاں آ کر تم راز بن کر رہ گئے ہو۔ جانے کیا کام ہے جو کرتے پھر رہے ہو مجھے تو کبھی کبھی ڈر لگنے لگتا ہے کہ کہیں تم۔’’

‘‘پاگل مت بنو، میں ایسے ہر کام کے خلاف ہوں جو میرے یا ملک کے لیے نقصان دہ ہو۔’’

‘‘پھر تم کیا کرتے پھر رہے ہو، مجھے کچھ پتا تو چلے، آج کل تو دفتر میں بھی نہیں بیٹھتے، سیدھے منہ بات نہیں کرتے، سچ بتاؤ، کیا واقعی ہم اب بھی دوست ہیں یا کوئی بھی نہیں رہے ایک دوسرے کے؟’’

ضمان حیدر یکدم اٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے مسکرایا۔

‘‘آخر تمہیں یہ کیوں لگا کہ ہم ایک دوسرے کے کچھ نہیں رہے؟’’

‘‘بس ویسے ہی، اس شہر کی بابت یہی سنا ہے۔ یہاں آنے والے عظیم اور گہرے رشتے بھی بھلا دیا کرتے ہیں۔ ہم تو فقط دوست ہیں اور۔’’

‘‘اور والا رشتہ زیادہ مضبوط ہے۔ کیا ہماری محبت کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہمیں ایک ہی ماں نے جنم دیا ہے۔’’

‘‘میرے لیے شاید مگر دنیا کے لیے یہی سب سے زیادہ ناپائیدار رشتہ ہے۔’’

‘‘حالانکہ ہمیں اپنی زندگی اور محبتوں کو اپنے پوائنٹ آف ویو سے دیکھنا چاہیے۔ جب تمہیں ایسا نہیں لگتا تو پھر تمہیں ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔’’

‘‘میں یہی کوشش کرتا ہوں کہ نہ سوچوں مگر جب تمہاری خفیہ کارگزاری دیکھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہی کہ شاید میں تمہارے لیے ڈسٹربنس کا سبب ہوں۔’’

‘‘احمق ہیں آپ اچھے خاصے۔ ایسی کیوں سوچتے ہو بھئی؟’’ اس نے تکیے کے نیچے سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا!

تو سلمان اسے گھورنے لگا۔

"ضمان یہ میری برداشت سے باہر ہے۔"

"کیا بھئی؟" اس نے سگریٹ کو شعلہ دکھاتے ہوئے بے پروائی سے پوچھا تو وہ کچھ کہے بنا کچن میں چلا گیا۔ ضمان حیدر نے پہلے تو دو تین کش لیے مگر پھر سگریٹ بجھا کر خود بھی کسلمندی سے اٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔ ناراض نوجوان لائی ہوئی سبزی پر سارا غصہ صرف کر رہا تھا۔ ضمان حیدر کچھ دیر تو اسے دیکھتا رہا پھر مسکرا کر اس نے اس کی پشت سے جا کر اس کی گلے میں بازو حمائل کر دیے۔

"ہنو ضمان! تمہیں میری ذرہ بھر بھی پروا نہیں۔"

"ارے واہ مائی! تمہاری پرواہ ہی تو رہی ہے ساری عمر۔ دیکھ لو اس وقت بھی تمہاری مدد کے خیال سے کچن میں چلا آیا ہوں ورنہ تم تو جانتے ہو، میں کتنا عدیم الفرصت ہوں۔" جواب پھر بھی نہ آیا تو اس نے گرفت مزید سخت کی۔

"او سلمان کے بچے! کیا تجھے اس پر یقین نہیں کہ میں عدیم الفرصت نہیں ہوں یا۔"

"مجھے تمہاری دونوں باتوں پر یقین نہیں ہے۔ چند الٹی سیدھی حرکتوں کو کام نہیں کہا جا سکتا اور میری پرواہ؟ تمہیں میری پرواہ کبھی نہیں رہی ہے۔"

"او ظالم انسان! کیا بکتا ہے۔ مجھے تیری پرواہ نہیں ہے۔ آخر یہ کیوں لگا تمہیں؟" سلمان حیدر نے گھور کے دیکھا پھر غصے سے دوبارہ پالک کی طرف متوجہ ہو گیا تو وہ اس کی سامنے آ بیٹھا۔

"ہاں بھئی، اب بک بھی چکو۔ تمہیں ایسا کیوں لگا کہ مجھے تمہاری پرواہ نہیں رہی۔"

"سامنے کی بات ہے اگر نظر آئے تمہیں تو۔ ہر وقت انجن بنے رہتے ہو پھر مجھ سے پوچھتے ہو اور جان جلانے کے لیے کیا تمہیں یہ نہیں پتا مجھے اسموکنگ کرنے والے لوگ کتنے برے لگتے ہیں اور شاید تمہیں یہ بھی پتا نہ ہوگا کہ اسموکنگ صحت کے لیے کتنی خطرناک ہے۔"

"اور اگر میں کہوں مجھے اس زندگی سے نفرت ہے تو پھر؟"

"تو میں کہوں گا تم ناشکرے ہو یا تمہیں خود ساختہ خود رحمی میں مبتلا رہنے کی عادت ہے ورنہ کیا نعمت ہے جو دنیا اور زندگی نے تمہیں نہیں دی۔"

"نعمت سے ہٹ کر کبھی تم نے اس کی اذیت کو شاید محسوس نہیں کیا۔ تمہیں ماں سے محبت تھی اور مجھے ماں سے عشق۔ سلمان! میں نے ماں کے آنسو دیکھے ہیں اور تم نے صرف ان کے قہقہوں، مسکراہٹوں میں زندگی کو محسوس کیا ہے یہی وجہ ہے تمہارے مقابلے میں میں زندگی سے زیادہ روٹھا ہوا اور زندگی کی طرف سے زیادہ تلخ ہوں۔"

"ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن تلخی کا مطلب یہ نہیں کہ تم زندگی جیسی نعمت ٹھکرانے پر تل جاؤ، زندگی کی تلخی تمہارے لیے امرت بھی بن سکتی ہے اور تمہاری کامیابی بھی۔ اگر تم اس کے دیے ہوئے زخموں کو بھلا کر اپنے لیے خود پھول چن لو۔ یہ ہر شخص کے لیے ایک سی ہوتی ہے ضمان! اس کے اندر محبت ہوتی ہے نہ وفا، لیکن ہمیں پھر بھی اس کا ساتھ دینا ہی پڑتا ہے اور جب یہ طے ہی ہے کہ دم آخر تک ہمیں ساتھ ہی رہنا ہے تو میرے خیال میں ہمیں اس کی بے وفائی اور بے مہری کے گلے کرنے کے بجائے اپنے لیے اس سے خوشیاں چھیننے کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ خوش امیدی ایک

موڈ ماسٹر کی ہے۔ جس سے ہر بند دروازہ کھولا جا سکتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو مگر میرے اندر جتنی نفرت ہے، وہ صرف انتقام سے پوری ہو سکتی ہے۔"

"حالانکہ انتقام اور نفرت تمہارے مزاج کے موافق ہی نہیں۔ تم ماں کی محبتوں سے گوندھے گئے ہو عثمان! تم اور نفرت یہ، دونوں کبھی باہم نہیں ہو سکتے تم بہت اچھے انسان ہو پھر یہ انتقام کی رٹ اور خناس کیوں ہے تمہارے سر میں؟"

"بس یہی میرا وعدہ ہے خود سے، اماں نے جب بظاہر آنکھیں بند کی تھیں مانی! تو میں نے ان کے اسٹریچر کی طرف اچٹتی سی نظر ڈال کر اندازہ کر لیا تھا کہ وہ آنکھیں اب کبھی نہیں کھلیں گی۔ ان آنکھوں کی تھکن بتاتی تھی مانی کہ وہ کس قدر اکتا گئی تھیں۔ زندگی سے۔ وہ میرے اور تمہارے لیے زندہ تھیں۔ بابا کی محبت کا عہد لیے جی رہی تھیں مگر ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے تو ان کے اعصاب نے "نیند نیند" کا شور ڈال دیا۔ وہ سو جانا چاہتی تھیں لیکن ان کے دل میں ہماری خوشیاں دیکھنے کی ہوک بھی تھی۔ ان تھکی آنکھوں میں ہماری شاداں فرحاں زندگی کا ایک خیال ہلکورے لیتا تھا مگر تھکن اس کے سامنے جیت گئی اور اور مانی! میں نے یہی انتقام لینا ہے اس کے ایک ایک عزیز سے کہ وہ بھی اسی طرح تل تل کر کے مرے، میں اپنی ماں سے کہیں زیادہ آنسو دیکھنا چاہتا ہوں اس کی آنکھوں میں۔"

کہتے کہتے یکدم وہ تھم گیا تو سلمان نے چھری رکھ اس کی ٹھوڑی اوپر کی پھر مدھم سا بولا۔

"تو بہت سوچتا ہے عثمان! شاید اس لیے تجھے یہ سب کچھ قابل لگتا ہے ورنہ ہمارے مذہب میں معاف کر دینا زیادہ افضل ہے۔"

"ہاں مگر ان کے لیے جن کے پاس طاقت اور حوصلہ نہ ہو اور تم جانتے ہو نا میں کمزور ہوں نا بزدل۔"

سلمان حیدر اسے دیکھنے لگا۔ دکھ اور درد کی انتہا نے اسے کفر بکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اللہ کا حکم ٹھکرا رہا تھا۔ شاید ماں اس کے لیے سب ہی کچھ تھی اور وقت نے ماں چھین لی تو اس کی نظر میں ہر چیز غیر ضروری ہو گئی تھی، اہم رہا تھا تو صرف انتقام اور نفرت، اور نفرت واحد جذبہ ہے جس میں بندہ کبھی دماغ سے نہیں سوچتا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ دل سے کیے گئے کسی فیصلے کی سزا بھگتے لیکن یہ سب باور کرنے کے لیے موقع کی تلاش ضروری تھی سو فی الحال موڈ بحال کرنے کے لیے اس نے پالک کاٹ کر اس کی طرف بڑھا دی۔

"اسے دھو دو اچھی طرح۔ آج کے سالن میں کرکل آ گئی ناں تو بہت برا ہو گا۔"

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ مسکرا رہا تھا، سو بجھا گیا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے، میں کیا خانساماں ہوں تمہارا؟"

"نہیں تم تو میرے ہیرو نمبر ون ہو مگر سارئی! پیٹ پوجا کے لیے یہ سب کرنا پڑے گا۔"

"آخر کیوں کرنا پڑے گا۔ یہ ہوٹل کس دن کے لیے بنائے گئے ہیں؟"

"صرف پیسے کی بربادی کے لیے یا تمہارے جیسے کاہلوں کے لیے جو کام سے جان چراتے ہیں۔"

"بکو مت مجھ سا کامی بندہ بھی آج تک دیکھا ہو گا۔"

"ہاں دیکھ ہی رہا ہوں۔ مسلسل تین مہینوں سے روز صبح اٹھتے ہیں تیار ہوتے اور نکل جاتے ہیں۔ دوپہر کو اس وقت آتے ہیں جب سارے کالجز کی چھٹیاں ہو چکی ہیں۔ اے عثمان کے بچے! کہیں تم آج کل گرلز کالج کے پھیرے تو

نہیں لینے لگے؟"

"بکواست۔"

"کیوں نہ بکوں میرا دماغ ہل کر رہ گیا ہے۔ اچھا خاصا کاروبار ہے۔ غیروں پر چھوڑ کر یہاں کرائے کے فلیٹ میں دھرے ہو، اوپر سے گارڈز فراہم کرنے کی ایجنسی کھول کر بیٹھ گئے ہو۔ آخر یہ سب ہے کیا؟ یہ تم گارڈز کیوں فراہم کرنے لگے ہو؟"

"محض اس لیے کیونکہ یہ کراچی ہے مائی ڈیئر اور یہاں یہی کاروبار زیادہ ان اور پاپولر ہے۔"

"لیکن تم تو دفتر میں بھی نہیں بیٹھتے۔ صرف مجھے ہی مکھیاں مارنی پڑتی ہے۔"

"ٹھیک ہے تمیں مار خان بننے کا مارجن تو ہے تمہارے پاس کرتے رہو خدمت خلق۔"

"یہ خدمت خلق ہے؟ اتنی مہنگی سیکورٹی مہیا کرتے ہو اور اسے تم خلق خدا کی خدمت پر محمول کرتے ہو۔ شاباش ہے تمہاری ڈھٹائی پر۔"

"ڈھٹائی ہی تو ہونی چاہیے، بڑے سے بڑا جرم معاف ہے آپ کو۔ یونو مجرم کون ہے، وہ جو پکڑا جائے اور عقل مند وہ ہے جو ہمیشہ جرم کر کے بچ جائے۔"

"دیکھو، دیکھو تم نے پھر میرے خدشات کو ہوا دی ہے۔ ابھی تم کہہ رہے تھے۔ تم کوئی خطرناک کام نہیں کر رہے۔"

تو بابا میں خطرناک کام تو اب بھی نہیں کر رہا، میں نے تو تمہیں ڈھٹائی اور مجرم کی غرض و غایت اور تھنک تبائی ہے۔ رہا یہ کہ میری سیکیورٹی ایجنسی مہنگی سیکورٹی فراہم کرتی ہے تو میری جان! ہمیں اس شہر میں اور اسی مہنگے سے دفتر میں بیٹھنا ہے اگر میں نے ذرا سی حاتم طائی فطرت ظاہر کی تو ہم دوسرے ہی دن سڑک پر دھرے ہوں گے اور کوئی ہمیں مفت میں بھی خریدنے کو تیار نہیں ہوگا۔" وہ ہنسا پھر سنجیدگی سے بولا۔

"مانی! تم ایک دم سیدھے ہو، کیا نہیں جانتے جو شخص گارڈز رکھ سکتا ہے، وہ اسے رکھنا افورڈ کرتا ہے تب ہی اتنا بڑا قدم اٹھاتا ہے، جب اس شہر میں پیسے کی گنگا بہہ رہی ہے تو ہم اگر اس میں نہالیں تو کیا برا ہے۔" سلمان اسے دیکھے گیا پھر آہستگی سے بولا۔

"میں نہیں سمجھ سکا تم کیا کرنے والے ہو اور کیا سوچ بیٹھے ہو۔ تم عثمان! تم کبھی دولت کو سب سے آخری مارجن گردانتے تھے شخصیت کا تم کہتے تھے دولت سے وہ مرعوب کرتے ہیں جن کی شخصیت میں اور کچھ نہ ہو جو خالی ڈبے کی طرح ہوں تو دولت کی گل کاری ہی ان کی شخصیت پہ بیل بوٹے بناتی ہے مگر آج یہ تم ہی ہو کہ دولت پر گھنٹہ بھر سے رطب اللسان ہو میں کیا سمجھوں اس سے۔ پتہ نہیں کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔" اس نے پالک پتیلی میں ڈال کر سنک میں نلکے کے نیچے رکھا پھر دوسری خالی پتیلی میں دھو دھو کر ڈالنے لگا، اس کے ہاتھ بہت تیزی سے چل رہے تھے اور عثمان نہایت انہماک سے اسے دیکھ رہا تھا پھر ضبط نہ ہو سکا تو شرارت سے بولا۔

"مانی یار! سچ ماں نے تو تجھ میں پورا کا پورا اپنا آپ اتار دیا ہے۔ تو ہم میں سے تو بالکل نہیں لگتا، سر سے لے کر پیر تک ایک پتی ورتا قسم کی لڑکی لگتا ہے۔"

"بس بس۔ کام ہوتا نہیں زبان چلانے میں ماہر ہو۔ چلو ہٹو یہاں سے۔ مجھے سالن بھی پکانا ہے۔"

"ارے واہ! بالکل لڑکیانہ ٹون میں بولنے لگا ہے۔" "مجھے تو ڈر ہے کہیں کسی دن مجھ پر کچھ اور ہی انکشاف نہ ہو جائے کہ میں۔

"فضول بکنے سے بہتر ہے اپنے کمرے میں چلے جاؤ۔ اپنے ہاتھوں سے کام کرنا کوئی بری بات نہیں اور سچ پوچھو تو یہ ساری آفت تمہاری لائی ہوئی ہے۔ اچھا بھلا رہتے تھے لاہور میں۔ دائیں بائیں نوکروں کی فوج ظفر موج تھی مگر نہیں جناب! سکون آپ کی گھٹی میں جب ہی کہاں، بس بے سروسامانی میں آ پڑے یہاں بنا سوچے سمجھے۔ وہ تو شکر کرو ماں کی مدد کی غرض سے کچن میں ان کا ہاتھ بٹانے سے گھر سنبھالنا، کھانا پکانا آتا تھا ورنہ ہوٹلوں کے بدمزہ کھانے کھانے کو ملتے کر نانی یاد آ جاتی۔"

"مگر کیوں؟ صرف نانی کیوں یاد آتی ہیں ہر مشکل میں۔ دادی کیوں یاد نہیں آتیں۔ کیا دادی الجبرا کا سوال ہوتی ہیں؟"

"پتہ نہیں۔ چلو ہٹو یہاں سے۔"

اس نے زبردستی اسے کچن سے دھکیلا اور وہ اسے ایک عظیم انسان کا تمغہ تفویض کرتا اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔ چہرے کی بشاشت اور مسکراہٹ یکدم ہی پتھریلی سنجیدگی میں تبدیل ہو گئی تھی اس نے دروازہ بند کر لیا پھر ٹیلی فون اپنی طرف کھسکا کر ایک نمبر ڈائل کیا۔ پہلی بیل پہ ہی ریسیور اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو! جی کس سے بات کرنی ہے؟"

"تم سے۔ تم صبح والی بے بی ہو نا؟"

"جی! آپ کون بول رہے ہیں؟"

"تمہارا دشمن جو سایہ بن کر ہر وقت تمہارے ساتھ پھرتا ہے مگر سن لو، اب تم مجھ سے بچ نہیں سکوں گی۔ میں تمہیں کڈنیپ کر لوں گا۔"

"کیا فضول بکواس ہے یہ۔"

"عائشہ! کون ہے بیٹا۔ کیا ہوا عائشہ؟" مختلف آوازیں اطراف میں بکھرنے لگیں تو اس نے جنونی قہقہہ لگا کر ریسیور رکھ دیا۔ پلٹ کر دیکھا تو دروازہ کھولے سلمان حیرت سے بت بنا کر کھڑا تھا۔

"یہ تم لوگوں کو ڈرانے دھمکانے کب سے لگے ہو۔ آخر اس کا مقصد؟"

"یہ مقصد میں اچھی طرح جانتا ہوں، سو ضروری نہیں کہ اس مقصد سے تمہیں بھی آگاہ کروں۔"

"تم ہوش میں تو ہو۔ تم کس سے بات کر رہے ہو۔ کیا بھول گئے میں کون ہوں؟"

"نہیں، میں بھولتا ہی تو نہیں ہوں مانی! میں بھول جانا چاہتا ہوں مگر نہیں بھول سکتا اور یہی وہ بری کیفیت ہے جو مجھے مارے ڈال رہی ہے۔ میں تم سے بھی مس بی ہیو کرتا ہوں، اکثر کرتا ہوں مگر مجھے خود پر اختیار نہیں رہتا، میں مجبور ہوں مانی! مجھے معاف کر دو۔ میں واقعی برا ہوں، ہے نا، واقعی بہت برا ہوں۔"

"بکو مت، میرے بھائی ہو کر تمہیں جرات کیسے ہوئی خود کو برا کہنے کی، یہ جو وجود ہے نا یہ صرف تمہارا نہیں ہے، اس کے جملہ حقوق ماں نے مجھے بھی تفویض کر رکھے ہیں سو تم اپنے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کے

مجاز نہیں۔" یہ کہتے ہوئے کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا پھر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر بولا۔

"کون کہتا ہے اس چہرے کو برا۔ اتنا پیارا من موہنا سا تو روپ ہے تمہارا۔ جو ایک بار دیکھ لے تمہارا اسیر ہو جائے۔"

عثمان نے لگا کچھ سنا ہی نہیں، کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہوا پھر پلٹ کر بولا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرا چہرہ واقعی ایسا ہی ہے کہ جو دیکھ لے اسیر ہو جائے۔ کبھی کبھی تو میرا چہرہ مجھے بھی بہت پرکشش لگتا ہے۔ سوچتا ہوں اگر ماں نے اس چہرے کے پیچھے دھوکا کھایا تو وہ واقعی بے خطا تھی مگر میں کیا کروں؟ مجھے اسی لیے خود سے حد درجہ نفرت ہے کہ میرا چہرہ اس شخص کا پرتو ہے جس سے مجھے انتقام لینا ہے۔"

"پھر انتقام۔ آخر تمہارا یہ سرسام کب اترے گا؟"

"شاید کبھی نہیں یا اس وقت جب میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاؤں گا اور تم دیکھنا میں یہ جنگ ضرور جیتوں گا۔"

"چاہے اس جنگ میں جذبوں، رشتوں، مان اور بھرم کی لاشیں یہاں سے وہاں تک بکھری رہ جائیں؟"

"ہاں۔ چاہے ایسا ہی کیوں نہ ہو۔ میں پیچھے نہیں ہٹوں گا اور پھر مانی یہ تو ہوتا ہے ہر جنگ میں اور اس کے اختتام کے بعد یہی سب کچھ ہوتا ہے چند لاشیں، خون اور ناشاد آرزوؤں کی مٹھی بھر راکھ یہاں سے وہاں تک بکھرائی ہوئی۔ یہی کچھ حاصل ہے جنگوں کا۔ ازل سے اور شاید ابد تک۔"

سلمان نے دلگیری سے اپنے ماں جائے کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر کمرے سے نکلتا چلا گیا کہ اس وقت یہی بہتر تھا۔

عائشہ نے جب سے وہ منحوس فون ریسیو کیا تھا تب سے مسلسل روئے جا رہی تھی اور بابا سائیں پیچ و تاب کھا رہے تھے کہ آخر کون شخص ہو سکتا ہے وہ جس نے ان کی بیٹی کو دھمکی دی۔ مسلسل ایزی چیئر پر وہ پیشانی پر ہاتھ دھرے اب تک کے تعلقات اور دشمنوں کو گن رہے تھے مگر واضح جواب ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ کبھی انہوں نے کسی سے برا رویہ نہیں رکھا تھا اور دنیا میں سارے ہی ان کے دوست تھے بلکہ حقیقت یہ تھی کہ انہوں نے زعم اور غرور میں کبھی کسی سے اچھا سلوک روا ہی نہیں رکھا تھا ان کا کوئی دوست تھا ہی نہیں۔ وہ سارے جہان میں اجنبی تھے۔ یا کوئی تھا ان کا تو بغض و عناد سے بھرے دشمن اور ان کی تعداد اتنی تھی کہ بابا سائیں کو شمار کرنا مشکل ہونے لگا تھا۔

"کون ہو سکتا ہے وہ؟" بابا سائیں نے پوری آنکھوں کھول کر عائشہ کو دیکھا۔

ایک لمحے کو خیال ہوا کہیں اس کی ذاتی جان پہچان ہی نہ وجہ دشمنی بن گئی ہو مگر اس کے تقدس سے دمکتے چہرے کو دیکھ کر ان کا دل انکاری ہو جاتا۔

"نہیں عائشہ اس رکھ رکھاؤ کی نہیں اس میں تو ایک ٹھہراؤ ہے، کسی ندی کا سا نہیں، سمندر کا سا ٹھہراؤ اور جو سمندر ہو کر اپنی حد اور اپنے ظرف کا پیمانہ ہر وقت تھامے رہتے، وہ منہ زور موجوں کی طرح کیسے چھلک سکتا ہے۔"

"پھر کون ہے؟ کون ہو سکتا ہے؟" انہوں نے پرسوچ نگاہوں سے پھر سے عائشہ کو دیکھا پھر مدھم سا پکارے۔

"سنو عائشہ! تم کل کالج نہیں جاؤ گی۔"

"بابا سائیں! ایسا کیوں؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ" بابا سائیں کے وجود میں ایک ٹیس اٹھی۔ بیٹی کی شرافت کا اعلان کرتی اور اس کے خیال کو رد کرنے والی ٹیس اور اٹھ کر وہ اس کے قریب چلے آئے پھر سر پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے بولے۔

"میرا وقار تم سے ہے عائشہ! میں نے کبھی عزت اور وقار کو مشکل نہیں دیکھا لیکن اگر اس کی کوئی صورت بنتی ہوگی تو وہ میری بیٹیوں کا ہی پرتو ہوگا۔"

"بابا سائیں!" اس نے بابا سائیں کا ہاتھ تھام کر رونا شروع کر دیا تو وہ قریب ہی بیٹھ گئے۔

پھر بولے۔ "میں نے تمہیں کل صرف اس لیے جانے سے روکا ہے کہ میں سمجھ نہیں پایا اس فون کال کو۔ بیٹا! یہ مشہور سہی کہ گرجنے والے بادل برسا نہیں کرتے لیکن کون جانے گرجنے والے بادل گرجنا بند کر کے کب برسنا شروع کر دیں۔ اس لیے میں اس کال کو محض دل لگی یا ڈراوا نہیں سمجھ سکتا اور تمہیں میرے ماضی کے باعث تکلیف پہنچے میں یہ بھی نہیں برداشت کر سکتا۔"

"پلیز بابا! یوں نہ کہیں، مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔"

"ہونی بھی چاہیے تمہیں شرمندگی ہونی ہی چاہیے بیٹا! میرا ماضی بہت داغ دار ہے لیکن اب تو میں تائب ہو چکا ہوں ناں پھر میرے اعمال میرے بچوں کو ہراساں کرنے کے لیے کیوں صورتیں بگاڑ رہے ہیں۔"

"بابا سائیں! فار گاڈ سیک..... آپ خود کو مورد الزام نہ ٹھہرائیں۔ جو کچھ ہوا اسے بھول جائیں۔"

"کیا واقعی میرے بھول جانے سے میرا ماضی بھی سب کے ذہنوں سے وقت کے صفحات سے اور لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائے گا؟ نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ آج تک ایسا ہوا ہی نہیں ہے مگر اس میدان کا ہر شہسوار یہی سمجھتا ہے کہ وہ ایک الگ تاریخ رقم کرے گا۔ وہ بدنامی کو شہرت اور سنگ دلی کو اعلیٰ نسب کی خاندانی وراثت پر محمول کرتا ہے اور بھول جاتا ہے کہیں ترازو ہے جو اسکے ہر عمل کو انصاف پر تول رہا ہے اور اس کی کج خلقی، سنگ دلی، بے راہ روی وہ باٹ تھا جس کے وزن سے اس کا خسارہ دو چند ہے، اتنا زیادہ کہ وہ رب جو صرف رحمت ہے وہ بھی اس پر نظر کرم ڈالنے کو تیار نہیں لیکن عائشہ! افسوس یہ سب اس وقت میں سمجھ آتا ہے جب ہمارے پاس "نہ وقت ہوتا ہے نہ مہلت۔"

"نہیں بابا سائیں! وقت اس وقت تک آپ کا ہے، مہلت آپ کیلیے ہے جب تک آپ بستر مرگ سے پہلے تائب ہو جاتے ہیں۔ توبہ کا در کبھی بند نہیں ہوتا بابا سائیں! اور یہ وہ عنایت ہے جس کسی کسی پر اتارتا ہے وہ رب، رہی ذہنی پریشانی تو میں پریشانیوں کو انسان کو مضبوط کرنے اور اس کی صلاحیتوں کو جلا دینے کا محسوس عمل گردانتی ہوں یہاں تک کہ وہ عمل ہی ہمارے لیے جزا بن جاتا ہے۔"

"عائشہ! میری بچی! کس قدر پیاری ہے تو اور اس سے خوبصورت ہیں تیری باتیں لیکن پھر بھی ایک بات کا دل تسلی پانے میں ناکام ہے۔"

"محض اس لیے کہ ابھی تک آپ نے میرے عزم اور حوصلے کو ناپا نہیں ہے اس خدا کی عظمتوں اور اس کی حاکمیت کو مانا تو ہے تسلیم بھی کیا ہے مگر اسے محسوس نہیں کیا۔ ہر چیز محسوس کرنے سے عظیم ہوتی ہے بابا سائیں! یہ احساس ہی تو ہے جو آپ کو اشتباہ خرد و نظر سے بچا لیتا ہے۔ سراب اور حقیقت میں تمیز سکھاتا ہے۔ احساس انسان کی کیمسٹری کی ماسٹر کی ہے بابا سائیں! جس سے ہر تالا کھل سکتا ہے احساس ہی تو انسان کو حیوان سے بلند تر کر کے اشرف المخلوقات بناتا ہے۔ "خدا ہے" کا ایک بامعنی اور ٹھوس دلیل دیتا ہے۔ یہ تو سب سے بڑا انعام ہے بابا سائیں۔"

"ہاں مگر یہ صرف تمہارے جیسے سادہ اور پاک دلوں پر اتارا جاتا ہے عائشہ! میرا دل تو بڑا ہی سیاہ ہو چکا ہے،

زخم آلودہ سا، ایک بے کار سا دل۔"

"نہیں، بس اب کبھی یہ نہیں کہیں گے آپ۔" لمحہ بھر کو رکی پھر سعادت مندی سے بولی۔

"آپ اپنی قدر میرے دل سے پوچھیں بابا سائیں! میں نے بلکہ ہم بہنوں نے جس طرح آپ کے وجود کی آس باندھی، آپ کے آنے کی دعائیں کیں بلکہ ہماری دہلیز پہ ہماری دعائیں آج بھی ہاتھ اٹھا کر یہیں کھڑی ہیں اس خوف سے کہ کہیں یہ کوئی خواب نہ ہو، رہا آپ کا حکم تو وہ سر آنکھوں پر لیکن سوچیے بابا سائیں! یہ کسی مسئلے کا مستقل حل تو نہیں۔"

"پھر تمہارے ذہن میں اس کا کون سا مستقل حل ہے؟"

"میرے ذہن کی پوچھتے ہیں تو سب سے پہلا اور آخری آسرا اللہ کا ہے لیکن اگر کسی سیکورٹی ایجنسی سے رابطہ کیا جائے تو کیسا رہے گا؟"

بابا کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ "ہاں یہ صحیح رہے گا میں ابھی فون کرتا ہوں کسی ایسے گارڈ کے لیے جو تم ساری بچیوں کا تحفظ کر سکے۔ تمہیں تمہارے تعلیمی اداروں میں بہ حفاظت پہنچا سکے۔" بابا سائیں نے فون اپنی طرف کھسکا لیا۔

دو تین سیکورٹی ایجنسیوں سے معاملہ کرنے کی کوشش کی مگر کہیں بات نہ بن سکی۔ بالآخر اخبار میں دیکھ کر "زی ایس سیکورٹی" ایجنسی کا فون نمبر ڈائل کیا اور بات کرتے ہی انہیں محسوس ہوا جیسے بولنے والے کی آواز ہی تحفظ کا فیج ہے سو فوراً ہی انہوں نے بات چیت طے کر لی۔ تمام معاملات طے پا گئے تو وہ اس گارڈ کا انتظار کرنے لگے ایجنسی نے ان کے لیے ہائر کیا تھا۔ ٹک ٹک کر کے کتنا ہی وقت بیت گیا تب کہیں ملازم نے گارڈ کی آمد کی اطلاع دی اس وقت جب وہ سب کھانے کی میز پر تھے۔

"ٹھیک ہے۔ تم انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ ہم آتے ہیں۔" بابا سائیں بولے پھر جلدی جلدی کھانا ختم کر کے بابا سائیں اور ماموں ڈرائنگ روم کی سمت بڑھ گئے اور عائشہ حاکم آمینہ اور وہ سب بہنیں ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے گارڈ کو دیکھنے کی کوشش میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے پر کمربستہ تھیں۔ لمبا اونچا سا نوجوان گھنی مونچھوں، فرنچ کٹ داڑھی اور عینک سمیت انہیں عجیب سا لگا۔

"آپی یہ ایسا ہوتا ہے گارڈ؟"

"پتا نہیں آج سے پہلے میں نے بھی کوئی گارڈ نہیں دیکھا، شاید ایسا ہی ہوتا ہوگا۔" عائشہ نے بہ دقت کہا۔

تو امینہ اسے ٹہوکا دے بیٹھی۔ عائشہ! یہ شخص تو صرف شاعر لگ سکتا ہے یا پروفیسر اس سے بھلا مجرم کہاں ڈریں گے۔

"بات تو سوچنے کی ہے لیکن کیا پتہ یہ بھی اس کی پروفیشنل ڈریسنگ کا حصہ ہوں۔"

"بات ڈریسنگ کی نہیں شکل کی ہے سچ اپیا اس کو دیکھ کر تو خوامخواہ رحم آتا ہے۔"

"بکواس نہیں۔ ہمیں بابا کا حکم اور ان کی رائے دیکھنی پڑے گی جو وہ فیصلہ کریں۔"

"لیکن اگر بابا سائیں نے اس آرٹسٹ بندے کو گارڈ مقرر کر لیا تو؟"

"تو اچھا ہوگا، ظاہر ہے بابا سائیں کچھ تو دیکھ کر ہی اسے گارڈ مقرر کریں گے۔"

"مگر مجھے نہیں لگتا کہ یہ شخص اسلحہ چلانا بھی جانتا ہوگا۔"

"سوچنے کی بات ہے لیکن خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" عائشہ حاکم نے کندھے اچکائے تو وہ سب کمرے

انھیں اور ایک گھنٹہ بعد بابا سائیں بتا رہے تھے کہ انھوں نے ”نزی جاہ“ کو ان کا گارڈ مقرر کر دیا ہے۔

”اُفوہ، نام بھی تو شخصیت سے میچ نہیں کرتا۔“

”بکو مت عانیہ! اچھا خاصا لمبا تڑنگا بندہ ہے بس چہرے سے کچھ مسکین تو لگتا ہے اور بات ہے۔“

”ہاں اسی لیے تو کہہ رہی ہوں اس کے ڈیل ڈول پر تو شیر افگن، رستم، سہراب یا اسفند یار جیسے نام زیادہ جچتے۔ ویسے اب بھی ایک ابہام ہے۔ کیا واقعی یہ ڈیل ڈول کے مطابق ہی ری ایکٹ کر سکے گا یا مجرم ہمیں اغوا کر رہے ہوں گے اور جناب انسانیت کا سبق سناتے ہوئے فرمائیں گے.... اگر کوئی شخص تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تم دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دو اور یوں ہم سب فری میں کڈنیپ کیا سمجھیں اپیا؟“

عانیہ نے سنجیدگی سے کہا تو عائنہ ہونق ہوگئی۔ یہ سچ تھا وہ اپنی عمر سے زیادہ دور تک سوچتی تھی لیکن اس کی سوچ اور شخصیت میں کبھی نہیں بنی تھی، وہ کہتی عموماً خلیل جبران کو ذہن میں رکھ کر مگر عمل کرنے کی باری آتی تو اس کی سانس اٹکنے لگتی۔ یہ کالج تک کی بات تھی کتنے ہی دن وہ سب اس کی ہمت بڑھاتے رہے تھے۔

”کچھ نہیں ہوتا آپی! سب لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ اب ہر شخص تو آپ کو اغوا کرنے کے لیے نہیں کھڑا ہوگا۔“

عالیہ کہتی۔ ”اور کیا اپیا! اب ان کا نیت اتنی بھی خراب نہیں۔“ تو وہ جھنجلا جاتی اور یہ جھنجلاہٹ، جھنجلاہٹ اور غصہ ہی تو تھا جس نے اس کو آتی ہمت بخشی کہ وہ کالج جانے لگی ان سب کے مذاق کو غلط ثابت کرنے کے لیے مگر دل ابھی تک پہلے دن کی طرح دھڑک اٹھتا تھا پھر ان معاملے پہ وہ کیسے یکدم بہادر بن جاتی، حالانکہ سر تا پیر، دل تا روح وہ ایک مکمل لڑکی تھی، بزدل اور ڈرپوک لڑکی سو آنکھیں خلا میں ٹکائے وہ عانیہ کو تکے گئی۔

اور امینہ خانم نے چٹکی بجا کر اسے چونکایا۔ ”عائنہ کیا سوچا پھر، یہ شخص تو قطعاً موزوں نہیں لگ رہا۔“

”پھر! پھر کیا کریں؟“

”بابا سائیں کو اپنا خدشہ بتاتے ہیں اور کیا کریں گے۔ جب ہم مطمئن نہیں تو بس۔“

”ٹھیک ہے میں بات کروں گی۔“ اس نے معاملہ ختم کر دیا، پھر رات گئے بابا سائیں سے یہ معاملہ ڈسکس کیا تو بابا سائیں خاموشی سے کتاب پر نظر جمائے بیٹھے رہے اور ماموں جان کھنکھار کے بولے۔

”مجھے عائنہ کا خدشہ بے بنیاد لگتا ہے بھائی جان! ضروری نہیں ہر گارڈ جیل سے چھوٹا قیدی ہی ہو، آپ نے اس کے کاغذات تو دیکھے ہی تھے ناں وہ ایک ریٹائرڈ فوجی ہے۔“

”اتنی سی عمر میں ریٹائرڈ؟ بابا سائیں کوئی تو وجہ ہوگی اس کی برخاستگی کی۔“

”نہیں کوئی خاص نہیں تھی۔ اچھا بھلا کیپٹن بن گیا تھا مگر بس مزاج کی تیزی کے باعث کام خراب ہوگیا۔ ایک بار دل خراب ہو جائے تو پھر اچھائی کی توقع نہیں مگر یہ پھر بھی لگا رہا، کیپٹن کے عہدے تک پہنچ گیا تھا کہ پھر زبردست جھڑپ پر اس کی تنزلی ہوگئی۔ بس تب سے خار کھا گیا اور استعفیٰ دے دیا۔ کافی عرصہ تک اس کا کیس بات کیس رہا تھا، سب دوستوں کی اس کو ہمدردی و حمایت حاصل تھی مگر دل برا ہوگیا تو کسی کی نہ سنی۔“

”مگر بابا! یہ سب تو اس کی کہی ہوئی باتیں ہیں۔ آپ نے کہیں سے تصدیق کی اس کی؟“

”تصدیق کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے پاس تمام کاغذات موجود ہیں جو اس کی باتوں کو سچ ثابت کرتے ہیں۔“

"پر بابا سائیں! آج کل جھوٹے جعلی کاغذات بنانا کیا مشکل ہے اور پھر یہ کراچی ہے...... بابا سائیں۔" بابا سائیں نے غور سے دیکھا اور ماموں نے جھلا کر کہا۔

"آخر تم کیا چاہتی ہو عائشہ؟"

"صرف اتنا ہی کہ مجھے اس شخص پر اعتبار نہیں، بابا سائیں! آپ نے اسے غور سے دیکھا ہے؟ آپ کو نہیں لگتا کہ ہم نے پہلے بھی اسے دیکھا ہے، بہت جانا پہچانا چہرہ ہے۔"

"ہاں مجھے محسوس ہوا تھا لیکن یاد نہیں آ رہا کہ کہاں دیکھا تھا مگر اسے ریجیکٹ کرنے کی یہ وجہ تو نہایت نامعقول ہے۔" بابا سائیں نے کہا تو وہ خاموش ہو گئی۔

☆

"کیا ہوا یہ تم اس قدر خاموش کیوں بیٹھے ہو؟" سلمان حیدر نے ریسور رکھ کر نہایت خضوع و خشوع سے خاموشی کو خراج تحسین پیش کرتے ضمان حیدر سے سوال کیا تو وہ یوں چونک کر اسے دیکھنے لگا جیسے وہ ابھی تک یادداشت سے منہا تھا۔"

"اب بول بھی چکو۔ کس کا فون تھا؟" اس نے پھر سے اسے دیکھا پھر آہستگی سے بولا۔

"مسٹر حاکم سرور کا فون تھا۔ وہ کہہ رہے تھے انہوں نے مجھے ملازمت دے دی ہے۔"

"اب سمجھا، یقیناً یہی بات ہے! جو میں سمجھا ہوں؟"

اس نے طویل سانس لی پھر سر ہلا کر بولا "تم درست سمجھے یہ ہی وجہ ہے شہر بدر ہونے کی اتنی تکلیفیں اٹھانے کی اور یہ سیکیورٹی ایجنسی کھولنے کی۔ صرف اس شہر میں ایک اسی شخص کو تو ٹریس کرنا چاہتا تھا میں محض اس شخص کو ذہن میں ڈھونڈتا رہا ہوں کبھی پایا کبھی کھو دیا لیکن سنا ہے اب مسٹر حاکم سرور اسی شہر میں مقیم رہیں گے کیونکہ ان کا دل ڈیڈ ہو چکا ہے اور ہر وقت انہیں دیکھ بھال اور فوری ڈاکٹری امداد کی ضرورت رہتی ہے۔"

"تو؟"

"تو کیا؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" اس نے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

وہ آہستگی سے بولا۔ "صرف اتنا ہی کہ جو شخص خود مکافات عمل سے گزر رہا ہو، اسے مزید کانٹوں میں کھینچنا کہاں کا انصاف ہے۔"

"پتا نہیں یہ انصاف ہے یا نہیں لیکن ماں کے آنسو تم بھول سکتے ہو میں نہیں، جب تک ان کی آنکھوں میں اسی جیسی برسات کی جھڑی نہ لگا دوں، مجھے چین نہیں آئے گا۔"

"میں، دو تین دن سے تمہاری مصروفیات کا حساب لگایا ہے اور مجھ پر یہ راز آشکار ہے کہ تم ہی تھے جو اس لڑکی کو تنگ بھی کرتے تھے۔"

وہ مزید آہستگی سے بولا۔ "ضمان! کیا یہ سب غلط نہیں۔ جنہیں تم واقعی تحفظ دے سکتے ہو۔ انہیں ہراساں کر رہے ہو۔ ان کے دلوں کو ہر پتے کے کھڑکنے پر خوف زدہ ہوتا دیکھنا چاہتے ہو۔ کیا یہ کوئی اچھی بات ہے؟"

"نہیں! مگر آج کل میں نے انسانیت کا سبق پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ چلتا ہوں۔" کیپ جما کر وہ باہر نکل گیا۔

وہ خاموشی سے اپنے کام نمٹا رہا تھا مگر عائشہ حاکم کی نظر مکمل طور پر اس پر مرکوز تھی۔ پتہ نہیں عائشہ حاکم کی آنکھوں میں اتنے شکوک کیوں تھے۔ وہ کافی دیر تک کن انکھیوں سے اسے دیکھتا رہا پھر مودبانہ بولا۔

"کیا ہوا بیگم صاحب! ہم سے کوئی غلطی ہو گئی؟"

عائشہ حاکم نے چونک کر اسے دیکھا اور نفی میں سر ہلا کر کار سے اتر گئی اور وہ اسے کالج میں داخل ہوتے دیکھتا رہا۔ سارے کام معمول کے مطابق ہی چلتے رہے۔ وہ وہیں کوارٹر میں رہ پڑا مگر جب بھی حاکم سرور کو دیکھتا اس کی آنکھوں میں سرخی بڑھ جاتی جسے وہ عینک کے پیچھے چھپا لیتا اور امینہ حاکم، عائشہ حاکم کے کان میں گھس کر پوچھتی۔

"یہ ہمارا گارڈ رات کے وقت بھی کالی عینک کیوں لگاتا ہے؟" عائشہ حاکم کاندھے اچکا دیتی تو وہ بسور کر رہ جاتی پھر اچانک ایک دن اس نے یہی سوال خود اس سے کر دیا تو کتنی ساعتوں اس سے بولا ہی نہیں گیا پھر سنبھل کر بولا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے بی بی صاحب! یونہی روشنی اچھی نہیں لگتی۔" پشت موڑ لی تو دل میں بڑبڑایا۔

"روشنی! واقعی بعض لوگوں کے چہروں پر روشنی اچھی نہیں لگتی، اس لیے ان چہروں کو تاریک کرنے سے پہلے ہر ایک دیکھنے کی خواہش اس طرح پوری ہو سکتی ہے سو کر لیتا ہوں مگر حقیقت میں ان پر کالی رات نہ لایا تو کچھ نہ کیا۔"

عائشہ حاکم اسکے انداز میں عجیب تحکم دیکھ کر گھبرا جاتی۔

"یہ گارڈ یوں نہیں لگتا جیسے کسی ایسی سلطنت میں آ گیا ہے جس کا دفاع کرنے والا کوئی نہیں اور یہ اپنے زعم اور غرور کا پھریرا لہراتا اپنی فتح کے ڈنکے بجاتا ہوا حکومت کے لیے آ موجود ہوا ہے۔" امینہ ہاں میں ہاں ملاتی۔

عائشہ سوالیہ ہو جاتی تو امینہ آہستگی سے کہتی۔ "کہتا تھا صاحب ہم یہاں ملازم ضرور ہوئے ہیں لیکن آپ ہم پہ بے جا رعب مت ڈالنا ہم پوری ایمانداری سے نوکری کرے گا لیکن اگر ہمیں جانور سمجھ کر سلوک کرو گے تو ہم بھی پٹھان ہیں۔ دماغ گھوم گیا تو کچھ بھی کر بیٹھیں گے۔ صرف مجبوری نے یہاں لا پٹخا ہے ورنہ اعلیٰ تعلیم بھی ہے اور خاندانی نجابت بھی ہے ہمارے پاس۔"

"اچھا یہ کہا اس نے؟ بابا سائیں نے پھر بھی اسے رکھ لیا؟" پھر فکر سے بولی۔

"امینہ! مجھے اس کا انداز بہت پراسرار لگتا ہے۔ پتہ نہیں عجیب طرح کا تحفظ ہے اس کی ذات میں کبھی لگتا ہے چلچلاتی دھوپ میں بے سائبان ہیں اور کبھی لگتا ہے وہ ہمارے ساتھ ہوگا تو ہر مصیبت پریشانی اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گی۔"

"ہاں ایسا ہی لگتا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہے یہ شخص۔" وہ کہتے کہتے چپ ہو جاتی تو وہ جو ان کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ روزانہ ہی ان کے خیالات پر ہنستا رہتا، ان کے خیالات کی پاکیزگی چند لمحے کے لیے اسے روک لیتی لیکن ماں کا چہرہ یاد آ جاتا تو اسے سب بھول جاتا۔

وہ اپنی مصروفیات میں لگا رہتا پھر چند ماہ ہی میں ان سبھوں نے دیکھا تھا کہ وہ بابا سائیں کا دست راست بن گیا تھا۔ گارڈ کے ساتھ ساتھ وہ ان کا مشیر بھی تھا اور بابا سائیں اس کی صلاح کے بغیر کوئی کام نہ کرتے۔ ماموں یہ حالت دیکھتے تو کہتے۔

"عاصمہ! حاکم بھائی کو سمجھاؤ، کسی باہر کے آدمی پر اتنا اعتبار کرنا ٹھیک نہیں۔"

وہ سنتیں مگر کیا کہتیں۔ خاموشی سے بھائی کو اور اس کے مشورے کو دل میں وزنی محسوس کرتے ہوئے بھی خاموش رہتیں۔ بہت عرصے بعد تو ان کی شخصیت کو اعتبار اور مان ملا تھا پھر وہ کیسے اسے محض ایک اجنبی شخص کی مخالفت میں گنوا دیتیں اور یہ تو طے تھا انہیں اب تک اس شخص سے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ بس اس لیے خاموشی سے وہ تیل کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ تیل کی دھار کو دیکھے جا رہی تھیں اور وہ نیا گارڈ لفظوں کی بوند بوند سے بابا سائیں کے دل کو جیتے چلا جا رہا تھا یہاں تک کہ اس گیم کا ٹرننگ پوائنٹ آ گیا۔ اس نے نہایت مہارت سے عین پروگرام کے تحت گمنام فون کال کے ذریعے اغوا برائے تاوان کے عادی گروپ کو ہائر کیا اس شرط کے ساتھ کہ مزاحمت میں بھی قتل و خون نہ ہو۔ ہاں زخمی کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بھی انتہائی صورت حال میں وقوع پذیر ہو، سو تمام کام حسب پروگرام ہی عمل میں آیا تھا۔ اس نے بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا تھا۔ یہاں تک کہ مجرموں نے اس پر فائر کھول دیا۔ یہ رسکی کام تھا مگر انتقام میں وہ دیوانہ ہو گیا تھا سو یہ بھی کر گزرا ایک گولی بازو چیرتی ہوئی گزر گئی تو وہ آگے پیچھے جھولتا ہوا سڑک پر ڈھیر ہو گیا اور عائشہ حاکم چلاتی گئی۔

”عظمی بھائی! ہائے عظمی بھائی! ارے ظالمو! میرے بھائی کا کتنا خون بہہ رہا ہے۔ پلیز چھوڑ دو مجھے، میں تیار ہوں تمہارے ساتھ جانے کو مگر میرے بھائی کو طبی امداد تو دلوا دو۔“

مگر ایک نہ سنی گئی اور وہ ان جملوں میں چھپی محبت کو اپنے اندر اترتا دیکھ کر بھی گونگا بہرا بن گیا۔

”بعض اوقات یہ نفرت ہر جذبے پر حاوی کیوں ہو جاتی ہے؟ زندگی نے پوچھا مگر پھر واقعی خون زیادہ بہنے سے بے ہوش ہو گیا تھا پھر آنکھ کھلی تو وہ ہاسپٹل میں تھا اور بازو میں بے تحاشہ ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

”کیسے ہو بیٹے؟“ بابا سائیں نے اتنی بے قراری اور محبت سے پوچھا کہ اس کی آنکھوں میں بے سبب آنسو آ گئے مگر وہ انہیں پی گیا پھر بھرائے لہجے میں بولا۔

”میں، میں بالکل ٹھیک ہوں صاحب! لیکن عائشہ بی بی کا اغوا میری کارکردگی کے منہ پر طمانچہ ہے۔“

”نہیں نہیں بیٹا! تم نے کوشش تو کی تھی ناں، سب کہتے ہیں تم نے اغوا کرنے والوں سے بھرپور معرکہ لڑا مگر ریوالور کے آگے کوئی کب تک جما رہ سکتا ہے۔ بے فکر رہو۔ اس وقت شہر کی ساری پولیس عائشہ کی بازیابی کے لیے مصروف عمل ہے۔“

”مگر صاحب! یہ فرض تو میرا تھا مگر میں اسے نبھا نہیں سکا۔ میں پٹھان ہو کر بس ایک گولی سے بے ہوش ہو گیا۔ تف ہے مجھ پر۔“

”یوں نہیں کہتے بیٹا! سب ٹھیک ہو جائے گا گھبراؤ نہیں ویسے بہتر سمجھو تو گھر شفٹ ہو جاتے ہیں۔ گولی نے صرف بازو کا گوشت پھاڑا ہے ہڈی محفوظ رہی ہے بالکل پریشان مت ہو۔“ لمحہ بھر کو تھمے پھر بولے۔ ”پھر کیا خیال ہے تمہارا بیٹے؟“

”وہی جو آپ بہتر سمجھیں میرے لیے، آپ کی رائے افضل ہے صاحب۔“ تھوڑا رکا پھر پیچ و تاب کھاتے ہوئے بولا۔ ”خدا کی قسم صاحب! جب تک عائشہ بی بی کو بازیاب نہ کروایا تب تک مجھے چین نہیں آئے گا۔“

اور پھر ان کے مشورے کے مطابق وہ گھر آ گیا ایک دو دن آرام کیا پھر اگلے اسٹیپ کے تحت معلومات کے لیے نکل کھڑا ہوا، بابا سائیں منع کرتے رہ گئے مگر وہ مجرم پیشہ اور بری شہرت پر اتنا بھی اعتبار نہ کرتا تھا تبھی جب سے عائشہ اغوا کی گئی تھی اس کا ایک بہت قریبی دوست حسن ان مجرموں کے درمیان عائشہ کا خود ساختہ محافظ بنا ہوا تھا۔ حسن

کو اس نے اپنے خاص آدمی کے طور پر بھیجا تھا مگر حسن بھی میک اپ ہی میں تھا اور کالج کے زمانے کی اسٹیج کی سرگرمیاں اور اداکاری کا شوق اس کے بے حد کام آ رہا تھا سو وہ حسن کی سلامتی اور عائنہ کے تحفظ کے لیے اس معاملے کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا تھا پھر اس واقعہ کا پانچواں دن تھا جب پولیس نے رات کی خاموشی میں ریڈ کیا اطلاع حسن نے دی تھی ائنہ حاکم ڈری سہمی بیٹھی تھی۔ باہر گولیوں کی دھائیں دھائیں ہو رہی تھی کہ ایک نقاب پوش اندر چلا آیا۔

جلدی نکل چلو یہاں سے۔ وہ مجرم تمہیں بھی زندہ نہ چھوڑیں گے۔ تم نے کھسیانی بلی کے کھمبا نوچنے کی مثل سنی ہے ناں تو چلو فوراً، میرے پیچھے چلی آؤ۔"

وہ اندھیروں کا سفر کرتا اسے روشنی میں لا کر غائب ہو گیا۔ وہ مین اسٹاپ پر کھڑی تھی اور با آسانی اپنے گھر جا سکتی تھی۔ اس لیے اسے تھوڑی سی تسلی ہوئی اور اپنی روٹ بس میں بدقت سوار ہو گئی۔ ٹیکسی یا رکشے کا وہ اتنی رات گئے رسک نہیں لے سکتی تھی کہ وہ دودھ سے جلی ہوئی تھی۔ رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے جب وہ گھر میں داخل ہوئی۔ بابا سائیں نے کھینچ کر اسے سینے سے لگا لیا اور ماما اس کے ملگجے کپڑوں، اس کے انداز سے آنے والے کسی عذاب لمحے کو دل پر دستک دیتے ہوئے محسوس کر رہی تھیں۔ پھر پولیس پارٹی ناکام و نامراد آئی تو انسپکٹر راحیل سے بات بھی نہ ہو پا رہی تھی۔

"آئی ایم ساری سائیں! ہم نے اتنی احتیاط کی لیکن پھر بھی پتا نہیں وہ عائنہ بی بی کو ادھر ادھر کرنے میں کیسے کامیاب ہو گئے۔"

"عائنہ وہ، وہ تو گھر آ گئی ہیں؟ آپ نے پہلے بتانا تھا ناں۔ پلیز ان سے ملاقات ہو جاتی تو بہتر تھا۔ دراصل یہ ایک بہت بڑا گروہ تھا جس کے فرنٹ سائیڈ پر ہم نے اٹیک کیا۔ وہ اگر کچھ معلومات بہم پہنچا دیں تو ہمارے لیے آسانیاں ہو جائیں گی۔ اور مجرموں کی شناختی پریڈ بھی تو ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے، سب ہو جائے گا۔ مجھے اس سے انکار نہیں مگر بچی ابھی لوٹی ہے۔ خوف زدہ ہے، تھکی ہوئی ہے۔ آپ کل آ کر اپنی کارروائی مکمل کر لیجیے گا۔"

انسپکٹر راحیل اظفر سر ہلا کر آگے بڑھ گیا اور دوسرے دن وہ معلومات میں صرف ان مجرموں کو شناخت کرنے کے علاوہ کوئی اور کارگر بات نہ بیان کر سکی اپنی گفتگو خلاصی میں اس نے جو واقعہ بتایا اسے انسپکٹر کی ذہانت نے آسانی سے ہضم نہیں کیا، اس کی آنکھوں میں شکوے تھے، جیسے لڑکی کسی کی شخصیت کو پردے میں رکھنا چاہتی ہے مگر عائنہ حاکم کی آنکھوں میں اتنی سچائی تھی کہ وہ زیادہ رد و قدح کر ہی نہ سکا اور کارروائی مکمل کر کے اٹھ گیا اور خود عائنہ حاکم تھی کہ "عظمت اللہ" کی دیکھ ریکھ میں لگ گئی تھی، اتنی محبت سے کہ کبھی عثمان حیدر کے اندر تبدیلی کسی منہ زور لہر کی طرح اس طرح بیدار ہوتی کہ اسے اپنے اوپر اختیار نہیں رہتا۔ مگر والٹ کھول کر ماں کی تصویر دیکھتا تو اس میں چھوٹے ڈبک جاتے۔

"ابھی تو کچھ نہیں کیا، ابھی تو سمندر روں آنسو ہیں جو آنکھوں میں بھرنے ہیں، دکھ ہیں جو تمہارے نام کا الہوں گے حاکم صاحب۔

"یوں مت سوچا کرو بچے! فیصلے درست اور غلط اس قدر ہماری زندگیوں پر اثر انداز نہیں ہوتے جتنا ہماری مت اثر انداز ہوتی ہے۔ تم نے جینئس افراد کو تاریکی میں ڈوبتے اور کسی گمنام کی شہرت کی بلندی پر پہنچتے نہیں دیکھا

ہوگا، مگر میں گواہ ہوں ایسے کئی لمحوں کا۔ سو بھول جاؤ جو فیصلہ ہمارے حق میں نہ ہوا اسے ہمارے لیے اسی حالت میں تخلیق کیا گیا تھا۔ یہی زندگی کا چکر ہے کیا سمجھے۔“

وہ خاموشی اختیار کر لیتا۔ زیر لب آئی مسکراہٹ دبا لیتا اور جب اپنی انیکسی میں لوٹتا تو حیران ہو ہو جاتا۔ کرا ہر وقت لشکارے مار رہا ہوتا اور تازہ گلاب محبتوں کے موسم کی طرح ارد گرد ہلکورے لیتے رہتے مگر ہر جذبہ ٹکرا کر اس ٹ سینڈھ لگائے بغیر آگے بڑھ جاتا اور وہ آئینے میں خود کو دیکھ کر اپنی مضبوطی پر خود ہی کو داد دیا کرتا مگر تھکن نجانے کیوں وجود میں چنگاری کی طرح تیرتی پھرتی۔ کسی برکھا رت کی آرزو کرتی، کسی نخلستان کی دعا مانگتی اور نظر پتہ نہیں کیوں عاصم لبا کے ارد گرد بٹ بٹ جاتی۔ ایسے کہ ان کی یاد دل پر اور گہرا اثر چھوڑتی اور اس کا بھی من کرتا کہ وہ بھی ابیشہ اور عائ حاکم کی طرح ان کے گلے سے جھول کر فرمائش کرتا ان کی گود میں سر رکھ کے اپنی تھکن اتارتا مگر وہ یہاں محبتیں شیئر کرنے ہی کب آیا تھا جو واقعی اس راہ لگتا۔ نفرتیں جو دل میں لیے سینت سینت کر رکھی تھیں وہ نفرتیں ان میں انڈیلنے آیا تھا اور آج کل جھنجلا اس لیے بھی گیا تھا کہ سلمان نے اس کا بائیکاٹ کر رکھا تھا پہلے تو اس نے یہی سمجھا یہ عام سی ناراضگی ہے مگر جب بات کرنے کو ترس گیا نہیں وہ عام باتیں تو ہر کسی سے کر سکتا تھا بلکہ ٹائم پاسنگ والی کئی دوستیاں اس نے یہاں مختصر قیام کے دوران ہی بنالی تھیں مگر خاص اور دل کی باتیں تو کسی ایک اور خاص ترین بندے ہی سے کی جا سکتی تھیں اور بس یہی کمزوری تھی اس جیسے مضبوط بندے کی کہ سلمان حیدر اس کا خاص ترین تھا زیادہ دن برداشت نہ کر سکا تو اس نے فلیٹ پر دھاوا بول دیا۔ سلمان حیدر ٹس سے مس بیٹھا رہا ایک لفظ نہیں بولا اور ضمان حیدر جانے کتنی سے اسے تکتا چلا گیا۔ اس نے پھر بھی توجہ نہ دی تو چلا اٹھا۔

”تمہیں معلوم ہے تمہاری ناراضگی میری ذات کا سب سے بڑا ویک پوائنٹ ہے اس لیے ہی تم مجھے کچوکے دے رہے ہو۔“ اس نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا پھر آہستگی سے بولا۔

”پاپا کہا کرتے تھے صرف دو انسان زیادہ چلایا کرتے ہیں، ایک وہ جنہیں علم ہو کہ جو وہ کہہ رہے ہیں۔ا حقیقت نہیں سو وہ بات میں دم پیدا کرنے کے لیے شور کرتے ہیں اور ایک وہ جن کے اندر باہر سے زیادہ شور ہو اور ا اندر کی نفی کرنے کے لیے لاؤڈ ہوتے ہیں اور تم! مجھے تم دوسرے شخص لگتے ہو۔“

”بکواس مت کرو۔ ایسا کچھ بھی نہیں۔“ سلمان نے کوئی ردعمل نہیں دیا اور کتاب اٹھا لی اور جیسے کتاب سے مخاطب ہوا۔ ”ہمیں یا تو سچ مان لینا چاہیے یا جھوٹ بولنا اتنی مہارت سے آنا چاہیے کہ ہم سچ کو اتنی ہی فورس سے جھٹلا سکیں۔“

”تم ان ڈائریکٹ کیوں بول رہے ہو، ڈائریکٹ بات کیوں نہیں کرتے مجھ سے؟“

اس نے ماما پاپا کی تصویر پر نظریں اور ٹکا دیں آہستگی سے بولا۔ ”جنہیں ہم اہم سمجھتے ہیں کوشش کرتے ہیں ان کو کانٹا چبھنے کی بھی تکلیف برداشت نہ کرنی پڑے مگر اس کو کیا کہیں گے اگر کوئی شخص اپنے ہاتھوں سے اپنی راہ میں خار بچھائے اور ٹوٹے ہوئے کانچ پر چلنے کی سعی کرے کیا کہتے ہیں اسے……؟“

ضمان تھک کر صوفے پر گر سا گیا اور سلمان حیدر بیڈ سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا پھر فضاؤں کو مخاطب کر کے بولا۔

”میں نے بہت چاہا۔ میں تمہیں روک لوں مگر تم نہیں رکے اس خار خار راستے پر چلنے سے پھر اب کیوں آئے

ہو میرے پاس زخم دریدہ ٹوٹے ہوئے؟" مڑ کر اسے دیکھا پھر پوری سچائی سے بولا۔

"دل کے موسموں سے بغاوت کرنے والے زیادہ دیر پیروں پر نہیں چلا کرتے ضمان! ایسے لوگ بہت جلد زندگی کے صحرا میں بے دم ہو کر گر جایا کرتے ہیں اور کوئی نہیں ہوتا جو ان کے پیاسے حلق میں محبت کی چھاگل سے رس ٹپکائے۔ محبت دوا نہیں مگر پھر بھی محبت دل میں کسی جوہڑ کی طرح ٹھہری رہے۔ جمی رہے تو کائی بن جاتی ہے پھر اس کا ہر قطرہ سم بن جاتا ہے مگر افسوس تم نے یہ سچائی تسلیم کر کے ٹھکرا دی۔"

ضمان حیدر اسے دیکھتا رہا پھر جوشیلے انداز میں اٹھا اسے دونوں کاندھوں سے تھام لیا اور چلایا۔

"صرف میرا قصور ہے اس سارے معاملے میں؟ کیا صرف میرا جرم، میری خطائیں ہیں مانی! بولو! کیا واقعی میں ایسا ہی تھا جیسا کہ اب ثابت کر رہا ہوں؟"

سلمان لے کر کھڑکی سے ٹیک لگا کر دھیرے سے بولا۔

"جرم کسی کا بھی ہو ضمان حیدر! مجرم خطاکار تم بھی ہو۔ تمہیں کیا پتہ بھائی کا لفظ محض لفظ نہیں، امید، تمنا اور خواہش ناتمام کا ایک تسلسل ہوتا ہے۔ دعا ہے۔ دعائے نیم شبی کی قبولیت کا سا مزا رکھتا ہے۔ اس معاشرے میں عورت کے لیے تحفظ کا ایک ناقابل تسخیر قلعہ ہوتا ہے۔ لڑکیاں جس قدر بھی بہادر بن جائیں، کتنی ہی خود مختار ہوں مگر انہیں بھائی، بیٹے باپ اور شوہر کے نام کی اس ناقابل تسخیر فصیل کی ضرورت ہوتی ہے مگر تم نے، تم نے بھی یہ مان توڑ دیا۔ تم جو ان کی روح کو کانٹوں میں کھینچ لیا۔ لہولہان کر دیا، محض ان کے باپ کی کسی غلطی کی سزا میں۔ تم نے کبھی سوچا ہے ضمان! وہ لڑکی جو چار پانچ دن بعد بازیاب کرائی گئی ہے۔ اس کے متعلق اخبارات نے کیا کیا لکھا اور اس کے لیے لوگ کیا کیا کہتے ہیں۔ اسے کالج سے مائیگریٹ کرنا پڑا ہے مگر یہ طعنے ساری زندگی اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ وہ ساری زندگی خوشی کو پورے نہیں کر سکے گی۔ وہ میری کچھ نہ سہی پر تمہاری تو بہن تھی مگر تم نے، تم نے کیا کیا اس کے ساتھ۔ اسے دنیا کے سامنے ایک اذیت بنا دیا ہے۔ تم پھول کھلا سکتے تھے گلاب مگر ضمان! تم نے ببول اگا دیے ہیں اور وہ پھر بھی تمہیں اپنا بھائی اور جانے کیا کیا تسلیم کرتی ہے بہنیں بہت کمزور، بڑی پیاری سی عنایت ہوا کرتی ہیں ضمان! لیکن تم نے خود تو اس نعمت کا کفران کیا۔ مجھ سے بھی اس دھوپ زندگی میں موجود سایہ چھین لیا۔ تم نے اپنا نہیں میرا بھی نقصان کیا ہے ضمان! پھر بھی کہتے ہو میں تم سے خفا نہیں ہوں۔ کیا واقعی مجھے احتجاج کا بھی حق نہیں......؟"

کہتے کہتے اس کی آواز رندھی ہو گئی اور وہ اسے دیکھے گیا۔ جواب ایک بات کا بھی نہ تھا۔ سو فلیٹ سے نکلتا چلا گیا، پھر بابا سائیں کا بھتیجا تھا جس نے اس حادثے کے چھ ماہ بعد بابا سائیں کے سامنے عائنہ حاکم کے لیے اپنا انتخاب لا رکھا۔

"یہ شخص کون ہے صاحب؟" اس نے مشورہ لینے پر آمادہ حاکم صاحب کو سوالیہ نظروں سے دیکھا اور وہ تفکر سے بولے۔

"میرا بھتیجا ہے، مگر عظمی! میں نے اس کے متعلق کچھ زیادہ اچھی خبریں نہیں سن رکھیں۔"

"پھر کیا ارادہ ہے آپ کا اس بابت؟"

"پتہ نہیں۔ میری تو عقل ٹھپ ہو گئی ہے بیچے! اس کی شخصیت کی کجی کو، دیکھتا ہوں تو دل نہیں چاہتا مگر عائنہ کے اغوا کے بعد کی صورت حال دیکھتا ہوں اور آئندہ کا منظر نامہ تخلیق کرتا ہوں تو یہ انتخاب زیادہ بہتر لگتا ہے۔ گھر کا لڑکا

ہے۔ خاندان کی عزت کو عزت سمجھے گا۔ ایک بار دھوپ میں ڈالے گا تو ایک بار چھاؤں میں بھی رکھے گا۔“

”یعنی آپ فیصلہ کر چکے ہیں، پھر آپ مجھ سے کیا مشورہ چاہتے ہیں؟“

”پتا نہیں، میں کوئی فیصلہ کر چکا ہوں یا کرنا چاہتا ہوں، یا اس بات کا خواہاں ہوں کہ تم مجھے اس فیصلے سے سختی سے منع کر دو۔ سچ پوچھو تو بچے! اس لمحے واقعی مجھے ایک بیٹے کی کمی کی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ اگر میرا کوئی دست راست ہوتا تو شاید یہ دردناک واقعہ ہوتا ہی نہیں اب بہنوں کا کوئی ایک بھائی بھی ہوتا ناں تو میں سکون سے آنکھیں بند کر سکتا کوئی ہوتا جو ان کا تحفظ بن جاتا۔“

”مطلب آپ بیٹیوں کے مقابلے میں بیٹوں کو ترجیح دینے والے ہیں۔“ بابا سائیں نے نظر اٹھا کر دیکھا پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

”یہ سچ ہے عظمٰی! میں اس سے منکر نہیں ہو سکتا، نہ یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھے عظمت کے سنگھاسن پر بیٹھا کر پوجو اور سمجھو میں انسان کے روپ میں فرشتہ تھا۔ فرشتے دنیا میں کہیں نہیں ہوتے کیونکہ ہم سب انسان ہیں عام سے، کمزور سے انسان اور میں، میں ان عام انسانوں میں سے زیادہ عام انسان تھا۔ میری نظر میں زندگی محض لذت کام و دہن اور وجود سے آگے کچھ تھی نہ اسکے بعد کچھ۔ میں نے زندگی کو جی بھر کر انجوائے کیا تھا کہ اچانک مری زندگی میں عاصمہ داخل ہوگئی، خوشبو کی طرح پر تاثر اور سبک عاصمہ میں نے زندگی کے اصل لمحے ان دنوں گزارے، میں جیا بھی ان ہی دنوں تھا مگر اسکے بعد دیگرے بیٹیوں کی آمد نے مجھے اس سے متنفر کر دیا لیکن اب سوچتا ہوں تو یہ سب میرے دل کی ایک مبہم برائی کی ہلکی سی رمق تھی جس نے عاصمہ کا اور مری بچیوں کا چہرہ کملا دیا۔ عظمٰی! یہ سچ صرف میں تم سے شیئر کر رہا ہوں کہ اگر عاصمہ صرف بیٹیاں مرے ذمہ نہ لگاتیں میں تب بھی اتنا ہی برا ہوتا۔ برائی مرے ڈی این اے میں شامل تھی کیونکہ ہمارے خون کا یہی تو خاصا تھا زور ہو، طاقت ہو حکمرانی ہو، تو کون کافر ہوگا جو اپنے دماغ میں رہے گا۔ بس یہی اختیار اور طاقت کا کھیل تھا جو میں نے سدا کھیلا۔ کتنے چہرے میری زندگی میں آئے مگر کوئی بھی ان میں سے نہ مجھے بیٹا دے سکا نہ مجھے باندھ سکا۔ عاصمہ کو بھی محض اس لیے میں نے طلاق نہیں دی تھی کہ شاید مجھے لگتا تھا عاصمہ نے مجھے محبت کی مدھ چکھائی تھی۔ پتہ نہیں میں جن دنوں محبت کو خرافات اور خلل دماغی گردانتا تھا تب بھی میں نے محبت پر جب بھی سوچا عاصمہ ہی میری سوچ کے کینوس پر پھیلتی چلی گئی۔ دل کے کہیں اندر اسپارکنگ کرتی ہوئی، نہیں معلوم اس نے اس انسیت، محبت کی وجہ یہ تھی کہ وہ میری پانچ بیٹیوں کی ماں تھی یا شاید یہ کہ زندگی کے اولین دنوں میں، میں نے جس چہرے کو غور سے دیکھا اور صنفی کشش سے ہٹ کر کچھ بہت اچھے جذبے اس کے نام کیے وہ عاصمہ تھی اور مرد ہو یا عورت پہلی محبت توجہ بھری نظر کبھی نہیں بھولتا سو میں بھی اس نظر سے بندھا یہاں چلا آیا۔ میں سرتاپا بدل گیا ہوں، بدل گیا تھا عظمٰی! بیٹے، بیٹی کا تقابل اور خواہش بھی کہیں اندر جا سوئی تھی مگر اس نئے سیٹ اپ میں میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی واقعی ہوتا میرا دست و بازو بننے والا انہیں تحفظ دینے والا ان کا ماں جایا کوئی ہوتا۔“

وہ خاموش ہو گئے تو اس نے آنکھیں جھکا لیں۔ پتہ نہیں ان آنکھوں میں آج پھر سے سرخی کیوں دوڑ گئی تھی۔ وہ جو سلمان کی باتوں سے پگھل گیا تھا، پھر سے اس بات پر کیوں چٹان ہو گیا تھا کہ اس داستان میں اس کی ماں کا تذکرہ تو ایکس وائی زیڈ کی حیثیت سے بھی نہ کیا تھا حاکم صاحب نے اور ایک اس کی ماں تھی کہ حیدر کے نام کی مالا

اوڑھ کر بھی کبھی کبھی خاموشی سے اس سنگ دل انسان کے لیے رویا کرتی تھی شاید ان کی بھی یہی مجبوری تھی کہ اس شخص کا چہرہ ان کی زندگی کا اولین چہرہ اور محبت کا پہلا احساس لیے ہوئے تھا؟“

وہ سر جھکائے سوچے جا رہا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہوا کہ اچانک بابا سائیں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”بولو بھی عظمی! تمہاری صائب رائے کیا ہے، تمام حالات تمہارے سامنے ہیں۔“ اس کا دل چاہا کہے۔

”عائشہ اب اتنی بھی ارزاں نہیں کہ ”ہاشم نصیر“ کو اس کی زندگی اور قسمت کا مالک بنا دیا جائے جو جرم اس کا تھا نہیں اس کی سزا بھی اسے کیوں ملے دنیا میں ہر شخص کے لیے اس کا دوسرا گمشدہ حصہ بھی تخلیق کیا گیا ہے۔ سب کے جوڑے بنائے ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ عائشہ حاکم کی زندگی کا اصل ہم سفر اس کی حاجت لیے اس کے در پر دستک نہ دے۔ یہ انتظار جاں گسل ضرور تھا مگر ناممکنات میں سے نہیں تھا۔ انتظار شرط تھی اور عائشہ حاکم جیسی پیاری لڑکی کے لیے انتظار ہی بہتر تھا۔ کبھی نہ کبھی تو زندگی مہربان ہوتی۔“

وہ بڑھ کر یہ بھی کہنا چاہتا تھا۔

”بابا سائیں ادھر دیکھیے میری طرف میں آپ کے عمل کے رد عمل میں کس قدر برا بن گیا ہوں کہ اب خود کو نہیں پہچان سکتا مگر دیکھیے آپ کی طرح اب تک میں بھی نیک نام ہوں۔ ملنے جلنے والوں، دوستوں میں کولیگز میں معتبر اور با اعتبار ہوں اور ایک وہ معصوم لڑکی ہے، وہ کتنی بے اعتبار اور کتنی ارزاں کر دی گئی ہے، مجرم ہم دونوں ہیں سزا صرف اسے تنہا ملے گی؟ ہم دونوں کو پھانسی ملنی چاہیے۔ قتل وجود کا ہو، ذات کا ہو، قتل تو قتل ہوتا ہے ناں۔“

مگر وہ یہ سب سوچ کر بولا تو دل کے برخلاف اچانک ہی ماں کی آنکھیں اس کے دل پر آنسو ٹپ ٹپ کر کے برسانے لگی تھیں۔ وہ آنسو تھے کہ چنگاری۔ جہاں قطرہ ٹپکتا وہیں دل کی سرزمین پر ایک داغ پڑ جاتا دھواں اٹھنے لگتا اور اس دھوئیں میں اس معصوم لڑکی کا چہرہ فیڈ آؤٹ ہو گیا اور وہ مدھم انداز میں بولا۔

”ٹھیک کہتے ہیں صاحب! آپ کا فیصلہ راست فیصلہ ہے، اس سچویشن میں اور کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا۔“

بابا سائیں نے تھکے تھکے انداز میں اسے دیکھا جیسے مان لینے کا جو ارادہ باندھا تھا دل نے، اس سے ہٹ کر دیے جانے والے مشورے نے انہیں دھچکا پہنچایا تھا مگر یہی حالات کے پیش نظر بہتر تھا سو انہوں نے حامی بھر دی۔

ماموں نے سنا تو تڑپ کر رہ گئے۔

”یہ کیا کر رہے ہیں بھائی صاحب! عاصمہ! تم انہیں سمجھاؤ۔ اس فیصلے سے انہیں روکو یہ سب ہونے سے کہ تم سے زیادہ بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔ روح کی درماندگی اور ناپسند زندگی گزارنے کی اذیت اپنی محبت کے بدلے نفرتیں پانے کی ذہنی اذیت۔ عاصمہ! سمجھاؤ انہیں۔“ کہتے کہتے رکے پھر آبھر کر بولے۔

”کاش اس وقت میرا کوئی بیٹا ہوتا تو عائشہ بیٹا کے لیے میں سینہ سپر ہو جاتا لڑ جاتا اس کی خوشیوں کے لیے مگر وائے افسوس۔

دکھ یہاں سے وہاں لہجے کی طرح آنکھوں میں بھی در آیا۔ عاصمہ حاکم نے بھائی کی باتوں اور اپنی طویل ازدواجی زندگی کی خزاں رسیدہ شاموں سے جو اذیت کشید کی اس کا حساب کتاب لگایا تو برملا حاکم صاحب کے سامنے ڈٹ گئیں مگر ان کی ایک نہ چلی فیصلہ وہی ہوا جو بابا سائیں نے کیا اور آئینہ جو تھی اس کو جھوڑ کے بار بار یہی کہتی تھی۔

''تم لڑو عائشہ! اپنے حق کے لیے لڑو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے، کہاں کا انصاف؟''

اور عائشہ حاکم ہتھیلی آگے پھیلائے اس سوال پر گم صم رہ جاتی۔ انصاف تو سدا سے یہی رہا ہے۔ لڑکیوں کے نصیب تو چھدری چادر ہیں کہ دھوپ چھن چھن آتی ہے۔ پیوند لگائے، تب بھی کوئی نہیں جو ان کی ذات کے کاسے میں اعتبار، بھرم اور مان کے سکے اچھالے۔ وہ ساری زندگی یونہی تہی دست رہتی ہیں، خالی ہتھیلی کی طرح خالی، تن من دونوں سے مسافتیں سمیٹ کر کسی جاہ کسی منزل پر پہنچ جائیں تب بھی انہیں اپنے لیے کوئی لمحہ قرار، لمحہ معتبر نہیں ملا کرتا۔ سامنے دھول اڑاتا راستہ ہوتا ہے اور پیچھے زخم زخم راستے کی یادیں اور ساتھ ہوتا ہے دریدہ و درماندہ لہولہو وجود۔

''تم چپ کیوں ہو عائشہ پڑھی لکھی ہو، بابا کے سامنے جاؤ اور لڑ کر کہو تمہیں یہ فیصلہ منظور نہیں۔ جس جرم میں تمہارا قصور نہیں اس کی سزا بھی تمہیں کیوں ملے۔ تم ہاشم نصیر جیسے بے سمت اور بے مہر انسان کے لیے نہیں بنی ہو، تمہارے لیے تو کوئی بہت پیارا انسان آئے گا۔ ہاں عائشہ! سچ کوئی بہت پیارا انسان، جس کے پاس تمہارا پتہ ہوگا اور تمہاری طلب مگر جسے ابھی تک تمہارے گھر کا راستہ نہیں ملا ہوگا مگر وہ محو سفر ہے اب بھی، ایک تمہاری آس کو دل میں بسائے تمہاری طلب میں محو سفر ہائے گاؤ'' وہ اس کا چہرہ اپنی طرف موڑ موڑ کر اسے یقین دلاتی رہتی لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ کالج جانا چھوٹ چکا تھا۔ وجہ بابا سائیں نہیں تھے۔ وہ شہرتیں تھیں جو اخبارات کے ذریعے۔ سارے کالج میں منہ میں انگلی ڈالے ہر وقت اس پہ کف افسوس ملتی رہتیں اور تذلیل کے نئے نئے انداز سے اس پر زہر افشانی کرتیں۔ اب اس کی زندگی صرف گھر کچن یا گارڈن تک محدود ہو کر رہ گئی تھی کتابیں اور آگے پڑھنے کا عزم اس نے الماری کے سب سے نچلے خانے میں مقفل کر دیا تھا اور چابی لاپروائی سے گم کر دی تھی اور گھنٹوں سوچا تھا کہ کاش اذیت انگیز یادوں کو بھی ایسے ہی کہیں مقفل کر کے چابی گم کر دینا آسان ہوتا تو زندگی کتنی سہل ہوتی مگر یہ طے تھا اسے یہی مشکل زندگی گزارنی تھی۔ سو اس نے خود کو اس زندگی کے لیے ریزہ ریزہ کر کے پھر سے جوڑ لیا۔

بابا سائیں نے منگنی کی رسم کی تاریخ دے دی تھی اور امی بھرے دل سے اس کے لیے شاپنگ کر رہی تھی بقول بابا کے منگنی سہی حاکم صاحب کی پہلی اولاد کی خوشی تھی اور وہ اپنے سب ارمان نکالنا چاہتے تھے۔ یہ اور بات کہ سارے گھر میں ماتمی فضا طاری تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے منگنی کا دن بھی آ گیا۔ عائشہ حاکم سفید کامدار شرارہ سوٹ میں اداس کہانیوں کا اداس روپ بن بیٹھی تھی اور ستون کے پیچھے کھڑے عثمان حیدر کا دل یکدم ہی اس کے ملیح و پرملال حسن پہ اندر ہی اندر تھرتھرانے لگا تھا۔ ایک بوجھ سا تھا جو دل پر آ گرا تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا اور کھڑی ماں کہیں قریب ہی اس کی سوچ پر کف افسوس مل رہی تھیں۔

''میری محبت میں میری ہی جنف پر قہر نا کی کیوں؟ یہ میری نہ تکی پہ ہے تو تیری بہن، اور بہنوں کے قدموں اور راستوں میں آنے والے خار تو بھائی پلکوں سے چنا کرتے ہیں مگر عثمان! تو نے یہ کیا کیا؟ کیوں کیا؟''

دل گھبرانے لگا تو وہ باہر آ گیا۔ گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ دل ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ عین اسی وقت لینڈ کروزر پورچ میں رکی۔ تین چار باڈی گارڈز اور دو دوستوں کے ساتھ ہاشم نصیر اتر رہا تھا۔ لمبا چوڑا ہاشم نصیر جس کے چہرے پہ سختی درشتی اور کردار کی خامی خود بخود منعکس ہو رہی تھی۔ چہرہ واقعی دل کا آئینہ ہوتا ہے۔ مگر وہ عائشہ حاکم اس کا کیا قصور تھا چھوٹی سی معصوم سی عائشہ حاکم کا کیا ہوگا، وہ اس شخص کے لیے تو نہیں بنی اس کے لیے تو کوئی بہت پیارا انسان

ہونا چاہیے کوئی بہت ہی پیارا انسان۔”

وہ واپس پلٹا مگر رسم کا اعلان ہاشم نصیر کے بیٹھتے ہی ہو چکا تھا۔ وہ ستون پہ بے ساختہ مکا مارتا رہ گیا اور عائشہ حاکم تھی کہ سراپا حسرت بنی اس کو تک رہی تھی۔

“تم میرے محافظ تھے، میرے بھائی تھے مگر تم نے ہی مجھے وار چڑھا دیا۔”

“نہیں، یہ کیسے ممکن ہے۔ اس سے کس نے کہا میں اس کا بھائی ہوں؟ اسے کیونکر علم ہو سکتا ہے کہ اس کا میرا خون کا رشتہ ہے؟”

پشت موڑ کر سوچا مگر وہ سوال، وہ شکوہ تھا جو اس کی پلکوں میں آ اٹکا تھا۔

“عائشہ حاکم! میں کتنا برا ہوں ناں۔”

مڑ کے اس نے دیکھا مگر عائشہ حاکم کا سر جھکا ہوا تھا، شاید یہ سر اب ہمیشہ ایسے ہی جھکا رہے گا۔ لوگ تو محبت میں کبھی کبھی خدا ہوتے ہیں مگر یہ شخص جو اس کے برابر بٹھا دیا گیا، ایک اس کی انتقامی کارروائی کے تاوان میں، یہ شخص تو سرتا پیر فرعون ہے۔ تو کیا عائشہ حاکم کا سر کبھی سجدے سے اٹھے گا ہی نہیں روپہلی زنجیریں اس کے پیروں میں، ہاتھوں میں اور روح کے گرد حصار ہو چکی تھیں اور یہ سب کچھ بہت دیر تک دیکھنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ سو وہ گھر سے باہر نکل آیا۔ سگریٹ پیتا پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سڑکوں پہ مٹرگشتی کرتا تھک گیا تو رکشہ کر کے واپس فلیٹ لوٹ آیا۔ سلمان حیدر نے دروازہ کھولا مگر توجہ تک نہیں دی۔ آہستگی سے ایک طرف ہو گیا۔ وہ اندر چلا آیا۔ سارا فلیٹ اسی طرح قرینے سے تھا بس ایک اس کی زندگی بے قرینہ ہو گئی تھی۔

“کیسے ہو تم؟” اجنبی بن کر کسی اپنے سے ملنا جس قدر بھی اذیت انگیز سہی مگر کم اذیت انگیز یہ بھی نہیں کہ جب کوئی اپنا اجنبی سا بن کر بھی آپ کو جواب دینا ضروری نہ سمجھے، کتنے لمحے تک دل سنبھالتا ہے نا آپ کی حساسیت۔ سو وہ بھی بت بنا کتنی دیر تک سلمان حیدر کو تکتا رہا پھر ڈھیٹ بن کر آگے بڑھا اور اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کے بولا۔

“ناراض ہو ابھی تک؟” سلمان حیدر نے پھر کچھ نہ کہا۔ واپس بیڈ پر آ بیٹھا۔ ضمان حیدر کی روح آنکھوں میں کھنچ آئی ایک طرف عائشہ حاکم ناراض کھڑی تھی اور ایک طرف یہ شخص روٹھا بیٹھا تھا جو دنیا میں اسے بہت عزیز تھا۔

“سلمان! او مانی! ادھر دیکھ کیا واقعی ناراض ہے؟”

“نہیں، بہت عرصہ ہوا، یہ درد سر میں نے اپنی زندگی سے نکال دیا۔ ہر شخص یہاں اپنے اصولوں ضابطوں پہ چلتا ہے پھر میں کون ہوتا ہوں جو تم سے تمہاری زندگی پہ سوال جواب کروں۔”

“بکو مت۔ ایک تم ہی تو ہو میرے اپنے۔”

“ہاں، یہ خوش فہمی تھی کبھی مگر اب یہ بھی نہیں۔ تمہارا کیا ہے ضمان حیدر! خدا جانے تم کب بدل جاؤ۔ کب تمہیں اپنی محبت حماقت لگنے لگے اور تم میرے لیے بھی ایسے ہی خار بھرے راستے تجویز کر دو جس پہ مجھے برہنہ پا چلنا پڑے۔ تمہاری دشمنی قبول کی جا سکتی ہے مگر تمہاری دوستی تو ضمان حیدر! نو۔”

اس نے کمبل اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا اور روکھے لہجے میں بولا تو وہ بیڈ پر اس کے قریب چلا آیا پھر چہرہ اپنی طرف موڑتے ہوئے بولا۔

"ادھر دیکھو، کیا واقعی میں اتنا برا ہوں۔"

"آئی ایم ساری، میں نے عرصہ ہوا اچھے برے ہونے کا پیمانہ توڑ ڈالا ہے ڈیر! میں اب کسی کو اس کسوٹی پر نہیں پرکھتا کیونکہ یہ دنیا جادو کا کھلونا ہے یہاں ہر اچھا شخص برا بھی ہو سکتا ہے اور برا شخص اندر سے اچھا بھی نکل سکتا ہے اور مجھے! مجھے ماسک پر سے ماسک اتارنے کا فن نہیں آتا۔

"طنز کر رہے ہو؟ کیا واقعی میں اتنا برا ہو گیا ہوں مانی؟" وہ رونکھا ہو گیا۔

مگر سلمان نے پھر ایک لفظ نہیں کہا اور وہ پھر سے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ دل چاہ رہا تھا وہ ہاتھ تھام کے روک لے مگر اس نے بڑھ کر دروازہ اس کے احتجاج سے پہلے ہی کھول ڈالا تو دل زلزلے کی زد میں آ گیا۔ اسے محسوس ہوا وہ اس فلیٹ سے ہی نہیں اس کے دل سے بھی نکلتا چلا گیا ہے ہمیشہ کے لیے اور اب اسے یونہی خاک بسر دربدر پھرنا تھا، بے خانماں برباد سا۔ اس نے بند ہونے والے فلیٹ سمیت دل کے دروازے پر حسرت سے نظر ڈالی، آنکھوں میں آ جانے والے آنسوؤں کو اندر ہی اندر دھکیلا اور واپس کوٹھی لوٹ آیا اور بابا سائیں تھے کہ اس سے پوچھ رہے تھے وہ کہاں چلا گیا تھا۔

"میں یہیں تھا صاحب! بس کچھ طبیعت میں گرانی سی تھی اس لیے باہر چہل قدمی کے لیے نکل گیا تھا۔"

بابا سائیں مطمئن ہو گئے تھے اور وہ ملازمین کے سر پہ کھڑا گارڈن کی آرائشی اشیاء گاڑی پر لوڈ کروا رہا تھا کام سے نمٹا تو انیکسی کی طرف جاتے ہوئے بے سبب اس کے قدم عائشہ حاکم کے کمرے کی طرف بڑھتے چلے گئے ہلکی ہلکی مدھم روشنی باہر جھانک رہی تھی اس نے ہولے سے دروازہ کھولا مگر وہ متوجہ نہیں ہوئی، لمبے بال اس کی پشت پہ بکھرے ہوئے تھے اور اردگرد گجروں کے سرخ پھول پتی پتی بکھرے پڑے تھے۔ اسے لگا جیسے دل ریزہ ریزہ کے ٹکڑے ہوں اور وہ مگن تھی کینوس پر رنگوں سے لکیریں کھینچنے میں دل چاہا پکارے "عائشہ حاکم ادھر دیکھو۔ کیا تمہیں لگتا ہے تمہارے اس بھائی کے ہوتے ہوئے کوئی تمہیں اندھے کنوئیں میں دھکیل سکتا ہے۔"

مگر نظر واپس اپنی طرف لوٹی تو آواز اندر ہی کہیں کھو سی گئی کہ اس کے ہوتے ہوئے کیا خود اس نے عائشہ حاکم کو اندھے کنوئیں کی صدا بنا دیا تھا جس کی تھاہ تھی نہ منزل، وہ الٹے پیروں واپس لوٹ آیا۔ بستر پہ لیٹا تو ساری رات خود سے لڑتا رہا سو صبح جاگا تو شکست خوردہ سا وجود لیے ہوئے تھا بستر سے ہلنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ ہر چیز بری لگ رہی تھی جب ہی ایک ملازم اسے اٹھانے چلا آیا۔

"صاحب! بڑے صاحب بلا رہے ہیں۔ بچیوں کو اسکول نہیں لے کر جانا کیا؟" سوال بھی داغ دیا تو اس نے بند آنکھیں بدقت کھولیں۔

"میری طبیعت کہتے کہتے یکدم رک گیا۔ "چلو میں آتا ہوں۔" پھر اس کے جاتے ہی منہ ہاتھ دھو کر بخار میں پھنکتا ہوا وجود لیے پورچ میں جا کھڑا ہوا۔

ثمرہ نے دیکھا تو بڑے دلار سے سلام جھاڑا۔ "السلام علیکم عظمی بھائی۔" اور وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ ننھی عائشہ حاکم اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ ٹکائے محبت پاش نظروں سے اسے تکتے ہوئے۔

"کیا دیکھ رہی ہیں عظمی بھائی؟" دھیرے سے پوچھا تو وہ مسکرانے لگا بے سبب اور دل تھا کہ اندر روئے گیا تھا۔

"کتنے پیارے پیارے دن لوٹ گئے۔ تم نے کیا۔ گنوایا عثمان حیدر! صرف بددعائیں۔" اور ثمرہ اس کی خاموشی سے گھبرا کر اس کے قریب چلی آئی۔

"آر یو آل رائٹ عظمی بھائی۔" ہولے سے ہاتھ تھاما اور چیخ پڑی۔

"او مائی گاڈ۔ اتنا تیز بخار ہے آپ کو۔ آپ بستر سے کیوں اٹھے۔ آپ نے کوئی دوائی لی عظمی بھائی؟"

اس نے تھک کر نفی میں سر ہلا یا۔ سارے وجود میں سائیں سائیں تھی یا چیخیں تھیں جو گونجتی پھر رہی تھیں اسے بہت کم ہوش رہا تھا جب اس کی سماعت میں ثمرہ کی آوازیں پڑیں تھیں۔ اس نے ذرا کی ذرا دیر میں بابا کار مچا کر سب کو ہی بلا لیا تھا اور سب سے زیادہ پریشان ہونے والوں میں عائشہ حاکم پیش پیش تھی۔

"ثمرہ ٹھیک کہتی ہے عظمی بھائی! اتنا زیادہ ٹمپریچر ہے آپ کو۔ چلیے میں کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا لاؤں۔" اور وہ اسے دیکھے گیا بری شہرتیں اس کے نام تھیں وہ پھر بھی نیکی کے لیے ہمہ وقت پر تولے رکھتی تھی۔

"نہیں! میں خود چلا جاؤں گا۔" وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور کسی حوالے سے اس تقدس بھرے رشتے کو رگیدے، سو تیز قدموں سے نکلتا چلا گیا۔ عائشہ، بابا سائیں سب پکارتے رہے مگر وہ رکا نہیں پھر چیک اپ کے بعد وہ پھر سے واپس نہیں جانا چاہتا تھا مگر بدقت لوٹ آیا۔ عائشہ حاکم، اینہ حاکم، عاصمہ بی ثمرہ اور باقی سب لڑکیاں اس کے لیے محو انتظار کھڑی تھیں۔

"کیا کہا ڈاکٹر نے عظمی۔" عاصمہ بی نے بڑھ کر تفکر سے کہا تو اس نے آواز نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔ معمولی ٹھنڈ ہو گئی ہے بیگم صاحب۔"

"یہ معمولی سی ٹھنڈ ہے عظمی بھائی؟ شکل دیکھیے کیسی زرد ہو رہی ہے۔" عائشہ حاکم نے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے نسخہ لیا اور فوراً ملازم بھیج کر منگوایا اور یوں اس کی تیمارداری کا دور شروع ہو گیا۔ وہ سب کی توجہ کا مرکز تھا اور خود اسے اپنے آپ سے حد درجہ چڑ ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے جیسے اس کے اندر محبت کا دیپ روشن ہو رہا تھا ویسے ویسے اسے کیے گئے اپنے عمل سے دہشت ہو رہی تھی اس لیے اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ٹھیک ہوتے ہی اپنے جرم کا اعتراف کر لے گا اور ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلا جائے گا مگر ابھی وہ پوری طرح سے ٹھیک بھی نہ ہوا تھا کہ سلمان حیدر چلا آیا۔ اس کی جان آنکھوں میں کھنچ آئی پورٹیکو سے ہی اس نے تھام لیا۔

"پلیز ہانی! میں خود سب کہہ دوں گا تم یہاں میری پوزیشن آکورڈ نہ کرو۔"

"کیا مطلب؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟ آپ ہیں کون؟"

"ہانی....." حیرت کے شدید جھٹکے سے وہ ہل کر رہ گیا اور وہ ایک ناپسندیدہ سی نظر اس کے چہرے پر ڈالے اندر بڑھ گیا اس سے یہ سب ہضم نہ ہوا تو وہ ڈرائنگ روم کی سمت بڑھ آیا اور دیکھ کر حیران رہ گیا وہ سب لڑکیاں پہلے سے کان لگائے کھڑی تھیں اسے آتا دیکھا تو سب پزل ہو گئیں۔

"اوہ عظمی بھائی آپ۔" سب سے پہلے عائشہ حاکم نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور فرار ہونے میں عافیت سمجھی پھر ایک کے بعد ایک وہ سب غائب ہو گئیں اور وہ ڈرائنگ روم میں بابا سائیں کو ایک ماضی کی داستان سنا رہا تھا۔ ایک طلاق نامے کی کاپی، برتھ سرٹیفکیٹ البم سامنے دھرے تھے اور وہ کہہ رہا تھا وہ داستان جس میں بابا سائیں نے ایک رئیس

زادے کا رول پلے کیا تھا۔ ایک لڑکی سے شادی کی تھی پھر ایک ماہ بعد آنکھوں میں حیرت بھر کر کہا تھا۔

"کون شوہر؟ کیسا شوہر؟ نکاح نامہ ہے تمہارے پاس؟ گواہ لاؤ۔"

اور وہ لڑکی روتی رہ گئی تھی۔ اس کے پاس کچھ بھی تو نہیں تھا۔ اعتبار میں بہت بے دھڑک لوٹی گئی تھی مگر ماں باپ اور وہ خود اتنی غریب تھی کہ اس امیر زادے سے ٹکر نہ لے سکی اور متوقع بدنامی کے ڈر سے ہجرت کر گئی یہاں تک کہ اس کی زندگی میں ایک دوسرا شخص آیا، بہت ایماندار پر محبت ایسا کہ اس کے سارے دکھ چنتا چلا گیا اس شخص نے اس کے لیے قانونی جنگ لڑی اور حاکم سرور کو لکھ بھیجا کہ اگر تم اسے بیوی تسلیم نہیں کرتے تو اسے باندھے رکھنے کا فائدہ طلاق دے دو ورنہ خلع لینے میں تمہاری بدنامی ہوگی۔ سچ حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں۔ اس لڑکی کی جتنی بدنامی ہوئی تھی ہو گئی اور اگر مزید بھی ہوئی، اس سچ کو منظر عام پر لانے میں تو میں تب بھی اسے اپنا لوں گا۔ اس لیے کہ جو شخص صرف جیتنے کے لیے کھیلے اسے شکست دینا آسان نہیں۔ کیا سمجھے۔"

اور دوسری طرف سے خاموشی سے طلاق نامہ آ گیا۔ وہ لڑکی سمندروں روئی اس طلاق پر، خوشی سے عورت کے لیے یہ تازیانہ سہی مگر اس کے لیے تو اس کی پاک دامنی کا سرٹیفکیٹ تھا اس کے نفس اس کی صنف کے معتبر ہونے کی سند تھا سو اس نے اس طلاق نامے کو محفوظ کر لیا اور چند ماہ بعد ہی اس کی شادی اس شخص سے ہو گئی جو اس کے لیے جنگ لڑ سکتا تھا اس کے لیے سینہ سپر ہونا چاہتا ہی نہیں بلکہ ہو بھی گیا تھا۔ یہ تو بہت بعد میں پتہ چلا تھا اس امیر زادے کو کہ جسے اس نے سب سے کم مدت اعتبار کے سنگھاسن پر بٹھایا تھا وہی اس کے لیے وارث تخلیق کرنے کا سبب بنائی گئی تھی۔ خواہش کی تکمیل کا سبب تھی پھر بہت ڈھونڈا اس نے مگر وہ لڑکی نہ مل سکی تھی اور اب برسوں بعد ایک نوجوان بیٹھا تھا پرانی داستان سناتا ہوا، زندگی کا نیا کردار بنا ہوا بابا سائیں یک ٹک اسے دیکھ رہے تھے ماموں، ممانی، عاصمہ جی محو حیرت تھے اور وہ کہہ رہا تھا۔

"پھر سائیں کہیے ناں۔ پسند آئی آپ کو؟"

"کہانی؟ تم تم آخر ہو کون؟" بابا سائیں کتنی دیر بعد قوتیں مجتمع کر کے بولے اور وہ ہنس پڑا۔

"یہ نہ پوچھیں کہ میں کون ہوں یہ پوچھیں کہ آپ کا وارث کون ہے؟ میرے خیال میں ثبوت ناکافی تو نہیں۔" وہ کہہ کر کھڑا ہو گیا تو بابا سائیں باہر تک اس کے پیچھے آئے۔ وہ نہیں رکا نہیں تو، تھک کر چلتے عثمان حیدر ایک دم رک گیا۔ آنکھوں میں آئے آنسو وہ کسی طور نہ چھپا سکا اور بابا سائیں تھے ڈبڈبائی آنکھوں سے خارجی دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بے چارگی سے کہہ رہے تھے۔

"چلا گیا۔ عظمیٰ چلا گیا وہ لڑکا، وہ جو میری ساری کج روی کا سبب تھا اگر اسے جانا ہی تھا تو وہ آیا کیوں تھا، کیا مجھے انتظار کے جاں گسل احساس کا شکار کرنے مجھے علم نہیں تھا تو صبر تھا اب میں کیسے جیوں گا۔"

وہ کچھ نہیں بولا۔ انہیں سہارا دیتا بیڈ روم میں لے آیا پھر بابا سائیں اس غم کو لیے بستر کے ہی ہو کر رہ گئے۔

سلمان حیدر اکثر فون کرتا قہقہے لگاتا اور عثمان حیدر چیختا۔

"تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟ کیوں؟"

اور وہ لاابالی پن سے کہتا۔ "میری مرضی، تمہیں اداکاری کا شوق ہے کیا مجھے نہیں ہو سکتا۔"

یہ ڈرامے بازی یونہی چل رہی تھی کہ اچانک وہ لمحہ آ گیا جب اسے بہت شدت سے عثمان حیدر ہونا تسلیم کرنا پڑا۔ ہاشم نصیر، امینہ حاکم سے بدتہذیبی سے پیش آیا تھا۔ جب اچانک کسی کام سے اندر آتے ہوئے عثمان حیدر کے خون میں پارہ گردش کرنے لگا تھا گھر میں سوائے امینہ، غانیہ اور ثمرہ کے کوئی نہیں تھا بابا سائیں صرف اپنے کمرے تک محدود تھے اور عاصمہ بی ابھی تھوڑی دیر پہلے حاکم صاحب کو سکون آور دوائی دے کر پڑوس میں میلاد میں گئی تھیں کہ یہ شخص اچانک چلا آیا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے یہ؟" تڑخ کر اس نے سخت ترشی سے پوچھا اور اس شخص نے یوں ہاتھ ہلایا جیسے کان سے مکھی اڑائی ہو پھر خباثت سے ہنس کر بولا۔

"آ جاؤ، تم بھی آ جاؤ۔ یہ خانہ بے تکلف ہے۔ ہم دوستوں کے دوست ہیں اور پھر مال مفت سامنے ہو تو۔"

"شٹ اپ۔" پوری قوت سے تھپڑ اس کے چہرے پر کسی میکانکی عمل کے تحت ہی اس نے مارا تھا ورنہ وہ تو خود کو یہ باور کرا چکا تھا کہ ان میں سے کسی کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہیں، وہ صرف گارڈ ہے اور بس لیکن خون کا جوش رشتوں کی زنجیریں ایسی ہی ہوتی ہیں کہ توڑ دینے سے واقعی ٹوٹ نہیں جاتیں وہ خشمگیں نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اور عثمان حیدر کی آنکھوں میں قہرناکی تھی۔

"تم نے، تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تم جانتے ہو میں کون ہوں؟"

"تم کون ہو نہیں کوئی تھے، اسے یاد رکھو۔ آج کے بعد تم اس گھر کے لیے کچھ بھی نہیں ہو، یہ بھی مت بھولنا۔"

"بکواس مت کرو۔ تم کون ہوتے ہو فیصلہ صادر کرنے والے؟"

"میں، میں اس گھر کا محافظ ہوں اور حق رکھتا ہوں فیصلہ کرنے کا۔"

"ہاشم نصیر نے کینہ توزی سے دیکھا پھر شر انگیزی سے بولا "انکا محافظ تو میں بھی بن سکتا ہوں" وہ رکا پھر بولا۔

"اپنے اطراف خوبصورتی کسے بری لگتی ہے، مسٹر عظمت! ہاں بس لچھے دار باتیں بنانے کا ہنر آنا چاہیے۔ خوب عیش ہیں تمہارے، ایک نہیں بلکہ۔"

"آگے ایک لفظ مت کہنا، یہ سب میری بہنوں کی طرح ہیں۔"

"ہاہا۔ بہنیں۔" تمسخر سے کچھ اس طرح ہنسا کہ عثمان حیدر کا دماغ کنٹرول میں ہی نہیں رہا۔ وہ لڑ پڑا۔ دونوں جنگلی بھینسوں کی طرح ایک دوسرے کو رگید رہے تھے جب اچانک عاصمہ بی ہونق سی امینہ کے ساتھ گھر میں داخل ہوئیں۔

"ارے ارے یہ کیا کر رہے ہو؟"

"آپ ہٹ جائیے بیگم صاحب! میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ لڑتا رہا یہاں تک کہ عاصمہ بی کو حاکم صاحب کو جگانا پڑا۔ انہیں حقیقت کا علم ہوا تو ان کے منہ سے کف نکلنے لگا۔

"ٹھیک کیا عظمی نے، ٹھیک کیا۔ اسکے ساتھ اس سے بھی برا ہونا چاہیے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے اور آئندہ شکل مت دکھانا۔" انہوں نے ملازمین سے دھکے دے کر نکلوا دیا۔ ہاشم نصیر بڑی بڑی قسمیں کھاتا ہوا وہاں سے نکلا۔

وہ سوچنے پہ آیا تو سوچ گیا، وہ جلا بھنتا سیڑھیاں اترتا چلا گیا مگر جو دشمنیاں مول لے لی جائیں، وہ جلدی

فرد نہیں ہوئیں سو اس کا بھی سابقہ ہاشم نصیر کے آدمیوں سے پڑ گیا، وہ کافی دیر تک تو لڑتا رہا مگر پھر اس کی ہمت جواب دے گئی عام سا انسان تھا، وہ ہیرو نہیں اس لیے بے دم ہو کر گر گیا۔ سنسان سڑک پر وہ بے یار و مددگار پڑا تھا جب ک خدا ترس نے اسے ہاسپٹل کے گیٹ تک سہارا دیا اور گیٹ کے سامنے ڈال کر گاڑی آگے بڑھا لے گیا کہ تھانہ پولیس کون بھگتتا پھرے ہاسپٹل کی انتظامیہ نے اسے فوری طبی امداد دینے کے لیے ایڈمٹ کر لیا پھر جیب سے حاکم صاحب کا کارڈ نکل آیا تو سارے مسئلے حل ہوتے چلے گئے۔ ذرا کی ذرا میں وہ سب ہاسپٹل میں تھے۔ عائشہ حاکم اس کے ہاتھ تھامے رو رہی تھی۔

"کس قدر زخمی کر دیا آپ کو۔ پلیز عظمی بھائی! آپ، آپ اب ہمارے ہاں مت آیئے گا۔ آپ کو ہمارا راس نہیں ہمیں تو ساری زندگی یونہی رہنا ہے۔"

امینہ نے بھی آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھا پھر بولی۔

"عائشہ ٹھیک کہتی ہے عظمی بھائی! اب کے ٹھیک ہو جائیں آپ تو پھر لوٹ کے مت آیئے گا، کراچی بہت بڑا ہے کسی اور جگہ جاب کر لیجیے گا مگر ہماری گھر نہیں، جب ہمارے بھائی کو ہماری پروا نہیں تو آپ کیوں دردسری مول لیں ہماری۔"

اس نے بے چینی سے اسے دیکھا پھر تھکے تھکے انداز میں بولا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کیا کوئی مرد ہی حفاظت کر سکتا ہے عورت کی، کیا انسان جو مجبور محض ہے وہ اپنے بل بو کا محافظ بن سکتا ہے امینہ۔"

امینہ حاکم کچھ نہ بولی ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"یہ صرف ہمارے سطحی خیالات ہیں بے بی! کہ مرد ا عورت کا محافظ ہو سکتا ہے کتنے گھروں کو میں نے دیکھا ہے کہ اس کے محافظ کے باوجود اس گھر کو لٹنے سے کوئی نہیں بچا پایا۔ یہ معاشرہ ہمارا معاشرہ سہی مگر یہ سب سیٹ اپ بھی ہم ہی بنانے والے ہیں کچھ ہم خود اور کچھ تم لوگ جو ہمیشہ اس خیال میں ہی پروان چڑھتے ہو، ایک بھائی بیماری اور پریشانی کا حل ہے۔ بھائی ایک مضبوط حوالہ سہی مگر حفاظت کرنا حفاظت میں رکھنا تو سراسر خدا تعالیٰ کا شعبہ ہے ورنہ انسان کسی دوسرے انسان کو کب پریشانی سے نکالنے اور پریشانی سے بچا لینے پر قادر ہے۔"

"کبھی بھی نہیں، یہ انسان کے بس میں نہیں۔"

"پھر تم لڑکیاں کیوں ہو کہتی ہو اس نعمت کے لیے، اگر نہیں ہے تب بھی صبر کرنا چاہیے۔"

"صبر! صبر ہم کر سکتے ہیں مگر ہمارے والدین، وہ جو ہمیشہ بیٹے کو اپنے بڑھاپے کا سہارا سمجھتی ہیں۔ ہاں ان والدین کا کیا ہو جو ایسا سمجھتے ہیں، جو صرف بیٹے کو وارث گردانتے ہیں بیٹیوں کو رد کر دیتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بیٹیاں تو دعا اور خوشی کا روپ ہوتی ہیں۔" اس نے بابا سائیں کو دیکھا۔

"آپ! صاحب کیا آپ اب تک اولاد نرینہ کو ہی وارث سمجھتے ہیں؟"

بابا سائیں نے قہقہہ لگا کر یوں دیکھا جیسے اس نے کوئی بچکانہ بات کہی ہو مگر اسکے چہرے پر سنجیدگی چھائی رہی تو بولے۔

"بھئی عظمی! میرا کیا صدیوں سے لوگوں کا یہی خیال ہے وارث اولاد نرینہ ہی کہلاتی ہے۔"

"حالانکہ یہ ہی سب بڑا دھوکا ہے صاحب! میرے بابا کہا کرتے تھے۔ وارث، صرف نرینہ اولاد نہیں آپ کے اچھے برے اعمال بھی ہوا کرتے ہیں۔ جب تک آپ جیتے ہیں۔ آپ کا حوالہ رہتے ہیں اور آپ کے مرنے کے بعد آپ کے نام کا حصہ بن کر رہتے ہیں۔ یہ تو ہم کوتاہ نظر ہیں جو انسان جیسی بے ثبات اور فانی چیز کو اپنی لافانی خوشیوں پر حاوی کر لیتے ہیں ہمارے نیک اعمال، برے وارث کی طرح جگہ جگہ ہمیں رسوا کرتے ہیں پھر کیا یہ درست ہے ہم اپنے رب کی حکمت اور فیصلے سے ٹکرائیں؟"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو، یہ درست نہیں مگر ہم میں سے کون ہے جو اس باریک نکتے کو سمجھے گا پھر ہم کیوں وقت برباد کریں جبر اپ۔"

بابا سائیں آگے بڑھ گئے تو وہ اپنی اینکسی میں اٹھ آیا پھر رونا نہیں چاہتا تھا مگر رونے لگا اچھی طرح دل کا غبار نکال چکا تو بستر آ لیٹا کمرے کی بتی بند کر دی تھی اس نے مگر یکدم ہی لائٹ آن ہو چکی تھی اور سلمان حیدر اس کے بیڈروم کی دہلیز پر جما کھڑا تھا اسے محویت سے دیکھتا ہوا اس نے استغراق دیکھا تو پوچھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو مانی؟" سلمان اندر چلا آیا پھر بالکل اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تو بولا۔

"دیکھنے آیا تھا کوئی شخص کتنا سنگ دل ہو سکتا ہے۔ کیا تم واقعی اتنے پتھر دل ہو یا پوز کرتے ہو؟"

"کیا مطلب؟" وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

"مطلب یہی کہ اتنی ڈھیر ساری خوشیوں سے منہ موڑ کے تم آخر کسے مزا دینا چاہتے ہو؟" کچھ دیر رکا پھر بولا۔ "میں سمجھتا تھا کہ میں تمہیں سمجھتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ اب تمہارا پیمانہ صبر چھلک پڑے گا۔ تم برملا چلا کر کہو گے ضمان حیدر میں ہوں مگر میں دیکھ رہا ہوں تم اس سچ کو کہنے کے بجائے اسے چھپانے پر کمربستہ ہو آخر کیوں؟"

"میرے شب و روز سے واقف ہو کر بھی پوچھتے ہو کیوں؟ کیا تمہیں نہیں پتا میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں۔ بڑا! جو کچھ میں نے کیا ہے اس کی مجھے اس سے بھی کڑی سزا ملنی چاہیے تھی میں نے خود پر ان خوشیوں کے در بند کر کے خود کو بہت زیادہ مارجن دیدیا ہے میں کسی بھی حوالے سے سہی ان سب کے درمیان تو رہوں گا۔ کوئی تو ہو گا، ان کا بھائی نہ سہی بھائی جیسا ہی سہی، کیا یہ کم ہے۔" وہ رکا پھر خود ہی تائید میں بولا۔

"نہیں یہ کم نہیں۔ یہ تو میری امید سے بڑھ کر ہے مانی! اور مجھے اس انجام سے کوئی شکایت نہیں کیونکہ تم اس شخص کے جذبات جان ہی نہیں سکتے جو سب کچھ لٹا چکا ہو مگر بھولے بھٹکے سے اس کے پاس ایک سکہ پھر بھی بچ گیا ہو۔ ہتھیلی پر رکھ کر دیکھو تو وہ سکہ کھوٹا لگے گا مگر کسی تہی دست کے لیے کھوٹا سکہ بھی کتنا قیمتی ہو سکتا ہے۔ یہ تم نہیں جان سکتے سوائے میرے یا کسی تہی داماں شخص کے، جس نے واقعی سب کچھ گنوا دیا ہو۔"

سلمان حیدر پھر کچھ نہیں بولا مگر وہ اس طرح خاموشی سے بھی نہ بیٹھا ایک نئی کہانی گھڑ کر اسے واپس اپنے حصار میں کھینچ لیا، پہلے تو اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا مگر جب عائنہ حاکم نے کہا۔

"ہمیں پتا ہے آپ کتنے بڑے اداکار ہیں ضمان بھیا۔" تو وہ خوف زدہ ہو گیا۔

"کیا؟ بس یہ خوشیاں چھننے والی ہیں لیکن یہ سزا تو بڑی کڑی ہے۔" اور اینہ اس کے کاندھے سے جھول کر بولی۔

"ہمیں مانی بھیا نے سب بتا دیا ہے غلطی بھائی! اوہ میرا مطلب ہے ضمان بھائی! آپ نے ہمیں کتنے

بنوں بیوقوف بنایا ناں۔"

"کیا پتا چل گیا آخر؟" دل و دماغ میں دھڑ کنے لگا تو اس نے خشک زبان تالو پر پھیری پھر بھرائے لہجے میں بولا۔

"کیا پتا چل گیا اینہ؟"

اور ثمرہ مزے سے بتائے گئی۔ "یہی کہ آپ ہی ہمارے بھائی ہیں۔ آپ یہاں گارڈ بن کر اس لیے آ تا کہ یہاں کے حالات اور لوگوں کے مزاج آشنا ہو سکیں کہ بابا سائیں آپکو قبول کر سکتے ہیں یا نہیں لیکن یہاں کے حالات دیکھ کر سینہ سپر ہو گئے۔ حقیقی گارڈ بن کر ہماری حفاظت کرنے لگے اور یہ ہم ہی جانتے ہیں کہ آپ نے ہمارے لیے کتنی تکلیفیں جھیلی ہیں۔"

اس نے طویل سانس لے کر سر جھکا لیا اور بابا سائیں نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ دھر کر کہا۔

"عثمان! آج مجھے دوہری خوشی ملی ہے۔ مجھے دو بیٹے مل گئے ہیں۔ سلمان کو میں نے عائنہ کے لیے منتخب کیا ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"نہیں۔ نہیں تو بابا سائیں۔" اس نے بے ساختہ بابا کے سینے سے سر ٹکا دیا۔ وہ اب تہی داماں نہیں رہا تھا۔ پورے اعتماد سے مسکرا سکتا تھا اور عائنہ حاکم کے لیے دعا کر سکتا تھا کہ اس کا ہم سفر اعتبار اور اعتماد کی دولت سے مالا مال ہو اور یہ سوغات بخشنے میں سخی ہو۔

❁……❁

اندھیروں میں سحر ڈھونڈتے رہے

میری نظریں مسلسل جس چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس چہرے پر میرے لیے قطعاً گرم جوشی کے اثرات نہ پائے جاتے تھے لیکن پھر بھی میں ہر روز اس کمرے میں آ کر اپنے وقت کا بہت سا حصہ یہیں گزارتا ہوں حیرت انگیز ہے ناں یہ بات، لیکن صرف آپ کے لیے کیونکہ آپ نے اس چہرے کو ایک بار بھی نہیں دیکھا اور میں ہر روز دیکھتا ہوں۔ عام سے نقوش، سانولا سا رنگ، عام سی لڑکی ہے یہ مگر پتا نہیں مجھے ہر روز کیوں خاص لگا کرتی ہے اور میں جو دنیا کے لیے بہت خاص ہوں، یہاں آ کر بہت عام سا کیوں ہو جاتا ہوں۔ ہاں میں لوگوں کے لوگوں کی دھڑکن، سب کا پسندیدہ کمپیئر اور گلوکار عیسیٰ عمید پتہ نہیں اس لڑکی کو کیا گرآتا ہے۔ مجھ سمیت ہر چیز اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہے ایسے جیسے دنیا کی طرح یہ بھی کوئی نادریافت شدہ سیارہ ہے اور سب اس کے گرد چکر لگا رہے ہیں مسلسل بے تکان اور ان لوگوں میں میں بھی شامل ہوں۔ میں جو تین ہفتے پہلے اس حالت میں جانے سے پہلے اس لڑکی کو نام کی حد تک بھی نہ جانتا تھا اور اب اگر مجھ سے کوئی اس کے متعلق پوچھے تو میں اس کی معمولی سے معمولی تمنا، خواب تک برملا ڈسکس کر سکتا ہوں۔

''ہے ناں نادینہ؟'' میں نے بے ساختہ مڑ کر اس کی طرف دیکھا ہے کیونکہ اس وقت میں اس کے کمرے میں لگے گلدان میں نیا گلدستہ سجا رہا ہوں مگر اس لڑکی نے پھر بھی میری طرف نہیں دیکھا، یہ پتا نہیں ناراض ہے یا دنیا کی خوبصورتی سے انتقام لے رہی ہے۔ بینا ہوتے ہوئے ہر وقت آنکھیں میچے رہنا انتقام نہیں تو اور کیا ہے؟ میں اسے یہ ہر روز سمجھاتا ہوں مگر یہ بے وقوف لڑکی میری کسی بات کا جواب نہیں دیتی ہاں میری کسی بات کا جس کا ایک ایک لفظ لوگ دم سادھے سنتے ہیں۔ سر دھنتے ہیں، واہ عیسیٰ عمید کیا بولتے ہو، دل رکنے لگتا ہے۔ بے جان لفظ جاگ اٹھتے ہیں۔ تم تو واقعی اسم بامسمّیٰ ہو۔''

اور میں کبھی غرور سے تن جایا کرتا تھا ان لفظوں پر لیکن اب یہ لفظ مجھ سے سرخوشی کا راگ نہیں چھیڑتے۔ پتا نہیں کیوں میں بالکل خالی ہو گیا ہوں حالانکہ کبھی میں گلے گلے تک بھرا ہوا تھا۔ انا خودی کے زعم میں میری کیمسٹری میں سارے عناصر سے زیادہ انا خودی، گوندھ دی تھی اس رب نے۔ میں نے کبھی سر جھکا کر نہیں دیکھا تھا۔ لوگ کہتے تھے۔

''عیسیٰ عمید کتنا بھی گریٹ کمپیئر اور گلوکار سہی مگر اس کی گردن میں راڈ پڑی ہوئی ہے۔ بہت خود سر ہے وہ،'' پھر بھی پتا نہیں اتنے غرور کے باوجود اس قدر کامیاب کیونکر ہے اسے دیکھ لو تو بزرگوں کی کہی اور لکھی باتیں سب جھوٹ

دونوں بیوقوف بنایا ناں۔"

"کیا پتا چل گیا آخر؟" دل و دماغ میں دھڑکنے لگا تو اس نے خشک زبان تالو پر پھیری پھر گھبرائے لہجے میں بولا۔

"کیا پتا چل گیا امینہ؟"

اور ثمرہ مزے سے بتانے لگی۔ "یہی کہ آپ ہی ہمارے بھائی ہیں۔ آپ یہاں گارڈ بن کر اس لیے آ تاکہ یہاں کے حالات اور لوگوں کے مزاج آشنا ہو سکیں کہ بابا سائیں آپکو قبول کر سکتے ہیں یا نہیں لیکن یہاں ک حالات دیکھ کر سینہ سپر ہو گئے۔ حقیقی گارڈ بن کر ہماری حفاظت کرنے لگے اور یہ ہم ہی جانتے ہیں کہ آپ نے ہمار لیے کتنی تکلیفیں جھیلی ہیں۔"

اس نے طویل سانس لے کر سر جھکا لیا اور بابا سائیں نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ دھر کر کہا۔

"ضمان! آج مجھے دوہری خوشی ملی ہے۔ مجھے دو بیٹے مل گئے ہیں۔ سلمان کو میں نے عائزہ کے لیے منتخب ک ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"نہیں۔ نہیں تو بابا سائیں۔" اس نے بے ساختہ بابا کے سینے سے سر ٹکا دیا۔ وہ اب تہی داماں نہیں رہا تھ پورے اعتماد سے مسکرا سکتا تھا اور عائزہ حاکم کے لیے دعا کر سکتا تھا کہ اس کا ہم سفر اعتبار اور اعتماد کی دولت سے مالا ہو اور یہ سوغات بخشنے میں سخی ہو۔

❀……❀

ہے۔ اس کے کاندھے سے سر ٹکا کر میں روتا ہوں اور میرے کاندھے سے سر ٹکا کر وہ اپنا غبار نکالتا ہے۔ غم مٹاتا ہے اور ہمارے درمیان یہ لڑکی ہے۔ کمرے کے وسط میں اس بستر پر خاموش لیٹی ہماری بے بسی کے بے چارگی اور محبت کا لطف لیتی ہے اور ڈاکٹر ہیں۔ کہتے ہیں۔ آپ خواہ مخواہ ان کی تکلیف بڑھا رہے ہیں یہ اب نہیں جاگیں گی۔ یہ دماغی طور پر بھی آہستہ آہستہ مرتی جا رہی ہیں ایک فیصد جو چانس تھا وہ بھی اب ختم ہو چکا ہے مگر آپ لوگ۔"

"تمہارا دفتر کیسا چل رہا ہے۔" سوچتے دماغ کو ڈراپ کر کے میں نے جمیل احمر کو خود سے الگ کرتے اسے لنچ تھماتے ہوئے سوال کیا تو وہ میری والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ٹھیک ہے۔ سب ہی ٹھیک چل رہا ہے مگر مزہ نہیں آتا اب، اب تو کسی بھی چیز سے دلچسپی نہیں رہی یوں جیسے کوئی شخص عمر کے نقشے میں بس وقت بھرتا جائے۔ آپ سنائیے، آپ کی مصروفیات کیسی چل رہی ہیں۔"

کہتے کہتے اس نے سوال بھی کر ڈالا تو میں سوچنے لگا۔ کیا کہوں کہ سب ہی کو آج کل مجھ سے بے شمار شکایتیں پیدا ہو رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا میں اپنے میوزک اور کمپیئرنگ کو بالکل وقت نہیں دیتا، پتا نہیں مجھے بھی کیوں لگتا ہے، جیسے میں بھی عمر کے نقشے میں صرف وقت بھرے جا رہا ہوں بے مصرف خالی وقت۔

"جائیے کچھ دیر آرام کر لیجیے عیسیٰ میں ہوں یہاں۔" جمیل احمر نے زبردستی مجھے باہر دھکیلا۔ میں نے بدقت خود کو اس روانگی کے لیے راضی کیا پھر ویٹنگ روم کے قریب سے گزر رہا تھا کہ۔

"عیسیٰ بھائی! کوئی تبدیلی، کوئی اچھی خبر؟" آواز سوال سمیت میرے سامنے مجسم ہو گئی تو میں نے بدقت نظریں اونچی کیں۔

"سوری سلمان! کنڈیشن ابھی تک ویسی ہی ہے۔"

"مجھے معلوم تھا!" خالی نظروں سے اس نے مجھے دیکھا، پھر کھڑکی سے باہر نظر ٹکا کر کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر مدھم آواز میں کہا۔

"مگر پھر بھی پتا نہیں ایک آس تھی کہ شاید! پتہ نہیں بھائی یہ نادیہ آپی کو ناراض ہونا وہ بھی اتنی سنجیدگی سے ناراض ہونا کیسے آ گیا بچپن سے تو وہ ایسی نہیں تھیں ایک لمحے جھگڑا کرتیں اور دوسرے لمحے پھر ہنسنے بولنے لگتیں اور ہم سب کہتے آپ کبھی ناراض ہونا سیکھ ہی نہیں سکتیں۔ ساری عمر ایسی ہی بونگی رہیں گی آپ!"

ناراضگی لیکن آج۔ آج پورے تین مہینے سے وہ ناراض منہ لپیٹے پڑے ہیں اور کوئی انہیں منا نہیں سکا، شاید اس لیے کہ وہ خفا نہیں ہوئی تھیں کبھی سو ہمیں طریقہ ہی نہیں آتا انہیں پھر سے اپنی طرف موڑنے کا۔"

میں نے کچھ نہیں کہا۔ ہولے سے اس کا کاندھا تھپکا۔ لفٹ کی طرف بڑھتا چلا گیا مگر سارے راستے ایک ہی سوال تھا۔

"کیا آس اور امید کے ہم معنی وہ لڑکی واقعی کبھی نہ مانے گی!" مگر کہیں سے اس بات کا جواب نہ آیا اور میں نے ساری توجہ ونڈ اسکرین پر ٹکا دی۔

☆

"مسٹر جمیل احمر پلیز، یہ انجکشن لا دیجیے۔ بہت ضروری ہیں مریضہ کے لیے۔" میں کرسی پر ابھی بیٹھا ہی تھا

ایک نرس نے یہ نیا حکم مجھے سنا دیا۔

"لیکن کیسے! میں اسے تنہا چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں۔" میں نے پہلو تہی کی تو نرس نے قدرے سخت لہجے میں مجھے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

"یہاں میں ہوں ناں اٹینڈنٹ۔ آپ جائیے پلیز۔" میں سر جھٹک کر باہر نکلا۔ میرا ارادہ فوری واپس آنے کا تھا لیکن ڈاکٹر راحت کو دیکھ کر میں نے انجکشن ایک وارڈ بوائے کو پکڑا کر ان کے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

"سنیے کیا آپ بھی میرے گھر والوں کی طرح یہی سمجھتے ہیں۔ میں زندگی سے منہ موڑ چکی ہوں اور یہ جو ہارٹ بیٹ اٹھاتا گراتا ای سی جی کمپیوٹر ہے۔ یہ محض دھوکا دے رہا ہے۔ میری زندگی کا ہلکا سا مارجن بیان کرتا ہے تو یہ محض خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں۔ ایک منٹ ذرا رکیے، مجھے باہر قدموں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ شاید کوئی اندر آنا چاہ رہا ہے۔

اوہو بیٹے! میری آکسیجن کی نلکی سے پیر ہٹاؤ، سانس لینے میں دقت ہونے لگی ہے۔ سنو کہانی سننی ہے ناں تو پلیز آرام سے بیٹھو۔ یوں تو مجھے کہانی سنانے کا بہت بچپن سے شوق ہے مگر جب سے لکھنا شروع کیا ہے تب سے میرے اندر اتنے اتنے لفظ ہیں کہ ہر وقت کسی پریپ کلاس کی طرح کا شور غوغا مچا رہتا ہے۔ ایک لفظ کہتا ہے مجھے دیکھو دوسرا کہتا ہے۔ نہیں پلیز مجھے اور میں ان سب لفظوں کو تھپکی دے دے کر سلاتے ہوئے تھک چکی ہوں۔

"ہاؤ اسٹوپڈ لڑکے! تم یہاں کیسے آئے۔" دروازہ کلک کیے بغیر جھٹکے سے کھل گیا سو میں بڑبڑا کر ہونٹوں پر انگلی رکھے اس نرس کو دیکھنے لگی یہ نرس یوں ہے تو بہت اچھی لیکن اس کے انداز میں بڑی بے زاری ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہہ رہی تھی۔

"یہ بی بی پتا نہیں کیوں اٹکی ہوئی ہے، اللہ اس کی مشکل آسان کیوں نہیں کر دیتا۔" لو بھلا میں کیا مشکل میں تھی کہاں جو آسانی ہوتی، او ہاں! ارے تو اس نرس کا یہ مطلب تھا یعنی میں مر کیوں نہیں جاتی لو بھلا میں کیوں مر جاؤں ابھی میں نے دیکھا کیا ہے۔

"تم بہت برے ہو لڑکے! ابھی ایک سیکنڈ کی دیر ہو جاتی تو یہ بی بی تو گئی تھی ناں، تمہیں یہ آکسیجن کی نلکی پر پیر رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"سوری سسٹر! مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ اس نلکی پر پیر رکھنے سے مر جائیں گی مجھے تو نہیں لگتا یہ مر سکتی ہیں۔"

"بکومت تمہیں نہیں پتا، یہ کس قدر روتیج ہو چکی ہیں۔"

ایک دم جھوٹ ہے یہ میں بالکل ٹھیک ہوں اچھے لڑکے! دیکھو میں تمہیں سن سکتی ہوں۔ چاہوں تو دیکھ بھی سکتی ہوں مگر آج کل بڑی کسلمندی سی ہے۔ آنکھیں کھولنے کو دل نہیں چاہتا ویسے مجھے یقین ہے۔ تم آواز کی طرح بہت پیارے ہو گے۔ اس وقت تو مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم نے میرا ساتھ دیا۔ واقعی مجھ جیسی زندہ لڑکی کیونکر مر سکتی ہے۔"

"چلو جاؤ تم یہاں سے! پتا نہیں کیسے ماں باپ ہیں، اولاد پیدا کر کے یونہی بے بہرہ ہو جاتے ہیں تاکہ دنیا کا ناک میں دم آیا رہے۔ یہ اسپتال کم ہے زندگی سے نفرت کروانے کے لیے جو تم بھی چلے آئے ہو چلو جاؤ جس پیشنٹ کے ساتھ ہو وہاں جا کر بیٹھو۔"

"اوکے سسٹر!" بچے نے افسردگی سے بستر پر لیٹی لڑکی کو دیکھا اور دوبارہ آنے کا عہد کر کے کمرے سے باہر

نکل گیا پھر نرس اس کا ٹمپریچر چارٹ بنا رہی تھی، جب اچانک کمرے کا دروازہ کھلا۔

"کیسی ہے یہ اب؟" دروازے پر اس کے بڑے بھیا کھڑے تھے۔

"ویسے ہی ہیں سر! بلکہ حالت پہلے سے زیادہ گرتی جارہی ہے۔"

"بکواس۔ میں بالکل ٹھیک ہوں بڑے بھیا۔" میں نے کہنا چاہا مگر بڑے بھیا نے میری طرف نہیں دیکھا اور نرس میری ڈرپس میں وارڈ بوائے کے لائے ہوئے انجکشن شامل کرنے لگی یہ نرس تو مجھے ہٹلر نانی لگتی بلکہ ہٹلر سے دو جوتے آگے ہے۔ جب دیکھو میری اذیت کے سامان میں اضافہ کرتی چلی جاتی ہے، یہ نہیں سوچتی کہ میں تھوڑا سا تھک کر اگر سونے لیٹ ہی گئی ہوں تو یہ مجھے تنگ نہ کیا کرے مگر نہیں اس نرس کو جب تک میری کلائیاں چھیدنے، ڈرپس دائیں بائیں کرنے کا موقع نہ ملے تو اسے سکون ہی نہیں آتا۔

"کیسی ہو نادی! مجھے پتا ہے۔ تم سب سن رہی ہو، بس بولتی نہیں ہو۔"

"آہم تو بھیا جان گئے میری چار سو بیسی خیر مجھے کیا میں نے اتنی جلدی تو ناراضگی ختم نہیں کرنی پچیس برس کی حسرتیں اور منا منا کر تھکنے کی اذیت بس تین ہفتے میں ختم تو نہیں۔ جی ایسا نہیں ہوگا ابھی تو اور ستاؤں گی۔"

"ڈاکٹر کہتے ہیں تم کوما کی سب سے کامپلیکیٹڈ کنڈیشن کا شکار ہو تم ڈیڈ ہوگئی ہو پوری کی پوری اور اب تمہارا دماغ بھی مرنے لگا ہے تل تل کر کے تھوڑا تھوڑا مگر پتہ نہیں مجھے یقین کیوں نہیں آتا۔ نادی تم سن رہی ہو ناں بیٹا؟" بڑے بھیا نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہوئے روتے ہوئے سوال کیا۔

مگر دوسری طرف خاموشی چھائی رہی کلک...... دروازہ کھلا سامنے جمیل احمد کھڑا تھا، دھواں دھواں چہرے سمیت۔

"کبیر بھائی آپ! آپ کب آئے؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ تم سناؤ تم کہاں تھے۔"

"میں وہ میں کہیں بھی نہیں۔" جمیل احمد نے نظریں چرائیں تو بڑے بھیا نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ "ڈاکٹر راحت سے مل کر آرہے ہو ناں؟"

"جی۔ جی میں ان ہی کے پاس تھا۔" اعتراف کرتے ہی بن پڑا اور سو وہ دھیرے دھیرے ایک دوسرے کو ڈھارس دینے اور دکھ چننے میں لگ گئے اور وقت بیتتا چلا گیا۔

☆

اور پھر میں بظاہر گھر آگیا ہوں لیکن وہ سوئی ہوئی لڑکی کی خاموشی اس وقت بھی میرے قدموں سے گرد کی صورت چمٹی ہوئی ہے۔ اس گھر میں پہلے کتنی چہچہاہٹیں تھیں۔ کس قدر خوبصورتی تھی لیکن اب یہی گھر مقبرہ بن گیا ہے یہ نہیں ہے کہ تنہا ہو گیا ہوں یہاں، بس یہ ضروری ہے کہ اب تنہا رہنے کو دل چاہتا ہے۔ تنہائی ہی غم گسار لگتی ہے۔

"سر! کافی پئیں گے۔" یکدم بیڈروم کا دروازہ کھولتے دیکھ کر ملازم نے مجھے للچایا پہلے کافی ہو اور بہت سی ہو کا مقولہ کتنا اچھا لگتا تھا مگر اب کافی سے ہی چڑ ہوگئی ہے۔

"نہیں کچھ نہیں چاہیے۔" میں نے کھردرے لہجے میں منع کر کے بیڈروم میں قدم رکھا تو سامنے رائٹنگ ٹیبل پہ ہر روز کی طرح نظر ٹھہر گئی۔ پوری میز نئے پرانے خطوط سے بھری پڑی تھی۔ یہ میرے پرستاروں کے خطوط نہیں تھے

صرف ایک لڑکی کی داستان الم تھی جو وہ لکھتی رہی اور پوسٹ نہ کر سکی۔

میں ٹھہر ٹھہر کے آگے بڑھا اور ہر روز ہی میرا اگلا قدم یہی ہوتا ہے مگر یہ لفظ ہیں چیختے چلاتے ہوئے اسی طرح اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

”عمید لالہ پلیز سنیے تو عمید لالہ کیسے ہیں آپ۔“ یہ سب خط میں نے کئی کئی بار پڑھے ہیں مگر پھر بھی سیرابی نہیں ہوتی اور اس لڑکی کی داستان جاننے کے لیے آپ کو بھی ان ہی خطوط کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ چلیے میں سناتا ہوں ترتیب وار۔ یہ پہلا خط بہت شکستہ اور پیلا سا کاپی کا صفحہ ہے، اس میں لکھائی بھی بہت شکستہ ہے شاید ساتویں کلاس کی کسی لڑکی نے لکھا ہے۔

بہت پیارے لالہ!

سلام خلوص

کے بعد کیا عرض کروں کہ میں کون ہوں، دراصل میرا نام نادیہ حسن ہے۔ لیکن آپ مجھے کیا جانیں۔ اس لیے چلیے میں آپ کو اپنا پورا بیک گراؤنڈ بتاتی ہوں۔ ہم مڈل کلاس سے تعلق رکھتے ہیں میرے پاپا ایک جنرل اسٹور چلاتے ہیں، ہم پانچ بہنیں اور چار بھائی ہیں۔ میرے پاپا بہت خوددار اور حق حلال کی روزی کمانے والے ایک اچھے انسان ہیں۔ یہ میں نہیں ان سے ملنے، ان کو جاننے والا ہر شخص کہتا ہے۔ کچھ اس طرح کہ مجھے پاپا کا پورا نام حسن کمال اچھے انسان ہی سنائی دیتا ہے ویسے لالہ میرے پاپا ہیں بڑے بہادر، جینئس گھر میں سب سے چھوٹے تھے اور ان کے نی پاپا کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ جب وہ اسکول میں نہیں پڑھ سکتے تھے، اس لیے انہوں نے اسکول نہیں پڑھا مگر آپ ان سے مل لیں ناں تو حیران رہ جائیں۔ وہ بڑے شائستہ لہجے میں بولتے ہیں۔ ہاں بس کچھ غصے کے تیز ہیں مگر مجھے تو پھر بھی بہت اچھے ہیں۔ سچ بھیا! میرے پاپا نے اتنی محنت کی ہے اتنی کہ انہیں اب آرام کی عادت نہیں رہی ہے۔ کہتے اگر میں آرام کروں گا ناں تو تھک جاؤں گا سو میری دعا ہے وہ کبھی نہ تھکیں، میں نے صحیح دعا کی ہے نا بھائی؟

اچھا باقی باتیں اگلے خط میں۔ اب اجازت چاہوں گی۔

فقط بزعم خود آپ کی بہن

نادیہ

یہ دوسرا خط ہے۔ لکھتی ہے۔

بہت پیارے لالہ!

سلام خلوص

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے لیکن سنیے مجھے یہاں آپ کی سخت مدد کی ضرورت ہے۔ آپ سوچتے ہوں گے بھئی وہ کیوں تو پیارے بھائی آپ مجھے سپر مین لگتے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ میرے لیے بڑی سے بڑی مشکل مول لے سکتے ہیں۔ آپ سب سے میرے لیے لڑ سکتے ہیں آپ پاپا کے لیے بھی جنگ کرنے میں ہراول دستہ بن کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ آپ کو نہیں پتا بھائی آج کل پاپا بہت پریشان ہیں ان کے دوست نے ان سے دھوکہ کر دیا ہے بہت سارے پیسوں کا سامان منگوا کر پیسے ہی نہیں دیئے کہتا ہے کسی کی گواہی لاؤ۔ تم نے کاغذ لکھوایا ہے۔ پر پاپا تو

سدھے ہیں ناں، انہوں نے کچھ بھی نہیں کیا بس پریشان ہیں شاید آپ حیران ہو رہے ہوں گے جنرل اسٹور اور یہ سامان کی برآمد کیا ہے تو پاپا درآمد برآمد کا کاروبار بھی کرتے ہیں۔ جنرل اسٹور پر شام کو بیٹھتے ہیں یونہی دوستوں سے گپ شپ کے لیے۔ آپ کو تو پتہ ہے ناں اماں پاپا کے دوستوں سے چڑتی ہیں ان کا خیال ہے پاپا کے دوست ان کا وقت ضائع کر رہے ہیں سو پاپا حتی الامکان اس الزام سے بچنے کے لیے دوستوں سے دور بھی نہیں رہ سکتے۔ دوستی اور محبت تو پاپا کی گھٹی میں رچی بسی ہے، شدید محبتیں کرنا اس وقت تک بنا صلے کے جب تک ان کی محبتوں کا مرکز شخص خود ان کا ہاتھ نہ جھٹک دے۔ ان سے دور نہ ہو جائے۔ پاپا دوری اختیار نہیں کرتے بلکہ بعد میں بھی اس شخص کو بہت محبت سے پیار کرتے ہیں ویسے آپ کو کچھ پتا ہے بھائی یہ پاپا کے ساتھ بلکہ ہر خاص شخص کے ساتھ دھوکا کیوں ہوتا ہے۔ لہجے اور رویے اتنی جلدی کیوں بدل جاتے ہیں کہ اتنی جلدی تو شاید موسم اور لباس تک تبدیل نہیں کیے جاتے اور پاپا ہیں اسی زمانے میں رہتے ہیں اور کہتے ہیں۔ یہ محبت اور مسکراہٹ وہ فیشن ہے جو کبھی آؤٹ نہیں ہو سکتا۔‘‘

اماں اس بات پر پاپا کو خوب یاد دلاتی ہیں وہ سارے لوگ وہ ساری محبتیں جنہوں نے ماں کو دھوکا دیا تو پاپا ہنس پڑتے ہیں اور کہتے ہیں۔

’’او بھلی لوک کیا پتا اچھا نہیں رہا کہ کسی بھی معاملے میں میں نے کسی سے برا نہیں کیا۔ سمجھو تو یہی اصل سوجھ بوجھ کی بات ہے کہ بندہ اچھا نہ کر پائے تو کسی کا برا بھی نہ چاہے۔ رب خوش ہوتا ہے۔‘‘

ہوں شاید آپ کہیں پاپا بہت اللہ لوک ہیں تو آپ نے درست پہچانا واقعی میرے پاپا اللہ لوک ہی ہیں۔ بس دعا کریں۔ میرے پاپا کے ساتھ برا نہ ہو کبھی۔

فقط بزعم خود آپ کی بہن

نادیہ حسن

اور یہ اس سے اگلا خط ہے لکھنی ہے۔۔

بہت پیارے لالہ!

سلام خلوص کے بعد عرض ہے کہ میں آپ کو ہر خط لکھنے سے پہلے سوچتی ضرور ہوں کہ آپ کو کیا نام دوں مگر پھر اتنا اچھا کوئی نام سمجھ میں نہیں آتا جو آپ پر فٹ بیٹھے۔ سو میں آپ کو صرف لالہ کہہ کر مخاطب کرتی ہوں میں جانتی ہوں آپ صرف میرا تخیل ہیں۔ میرے دماغ کی تمنا بھری ازاری ہیں مگر یہ سچ ہے مجھے یقین ہے آپ کہیں نہ کہیں اسی دنیا میں ہوں گے ضرور اور یہ تو طے ہے دنیا میں انسان جو کچھ سوچتا ہے جو کچھ کرتا ہے۔ وہ سب کچھ اس کا عکس ہوتا ہے جو پہلے سے لوح محفوظ پر لکھ دیا گیا بالکل اسی طرح کہ ابن صفی انکل نے ’’فولادی‘‘ کا تجرباتی ناول لکھا تو وہ اس کا ایک خاکہ ہی تو تھا جسے سائنس والوں نے ربوٹ کا نام دیا۔ آپ نے پڑھی ہے وہ کہانی پتا نہیں آپ کے پسندیدہ مصنفین کون ہیں مگر مجھے تو فی الحال اخلاق احمد اور ابن صفی انکل پسند ہیں ان کے لفظوں میں جو ملک سے محبت اور قانون کی بالادستی کی خواہش ٹھاٹھیں مارتی ہے۔ مجھے ان کا یہ جذبہ بہت سپر لگتا ہے۔ آپ کو پتا نہیں کیا اچھا لگتا ہو لیکن مذہب اور ملک پر میں بہت حساس ہوں میری فرینڈ کہتی ہیں تم ایک دم پاگل لڑکی ہو۔ کسی کے سامنے ٹھیک طرح سے اپنا مطمع نظر نہیں بیان کر سکتیں۔ کلاس ٹیچرز تمہیں بونگی اور نالائق سمجھتی ہیں مگر مذہب اور ملک کی بات آئے تو تم بڑی تقریریں کرنے

اٹھ کھڑی ہوتی ہو۔ تم جو ہمیشہ پچھلی نشست پر بیٹھتی ہو۔ تم کیا جانو مذہب اور ملک کس چڑیا کا نام ہے۔ آپ بتایئے بھائی کیا واقعی میں پچھلی نشست پر بیٹھ کر ملک اور مذہب پر اپنی رائے نہیں رکھ سکتی۔ کیا یہ صرف اگلی نشست پر بیٹھنے والی کلاس فیلوز کا حق ہے۔ آپ کو نہیں پتہ بھائی ہماری کلاس میں بڑی بری عادت ہے ٹیچرز کی کہ کم فہم بچوں کو زیادہ توجہ دینے کے بجائے اٹھا کر بالکل پیچھے دھکیل دیتی ہیں اور جنہیں ذہانت کے بل پر نمایاں ہونے کا خود موقعہ وہ رب دیتا ہے ان کو اور ہی اور خلعت عطا کر کے تاج بھی رکھ دیتی ہیں اور ہم جو شکلاً بھی ان کے باندیاں لگتے ہیں حقیقتاً ان سے ہر ہر قدم پر لیٹ ڈاؤن ہو جاتے ہیں آپ کو پتا ہے میری دادی جو پاپا کی پھوپھی ہوتی ہیں مجھ سے اس لیے خفا رہتی ہیں کیونکہ میں باغی اور ضدی ہوں۔ ان کی ایک اور بھی پرابلم ہے کہ وہ مجھے دیکھ کر ہمیشہ حادیہ کو یاد کرنے لگتی ہیں۔ ارے آپ کو نہیں پتا، حادیہ میری ٹوئن سسٹر تھی مگر دو برس کی عمر میں اس کی ڈیتھ ہوئی اور دادی کہتی ہیں، یہ بھی میری غلطی ہے ان کا خیال ہے وہ بڑی حسین و جمیل تھی شاید کسی پرستان کی کوئی شہزادی جس طرح اللہ میاں نے مجھے دل کھول کر بے رونقی دی ہے اسی طرح وہ ہمارے گھر کی رونق تھی سو پرستان کی شہزادی کو تو جانا ہی تھا چلی گئی مگر دادی یہ حقیقت اس طرح نہیں مانتیں ان کا خیال تھا اگر کسی کو جانا تھا تو وہ میں کیوں نہ ہوئی حالانکہ ڈاکٹرز کہتے تھے میں بھی مر جاؤں گی مگر میں بچ گئی اور دادی بیگم نے کہا۔

”ایک نمبر کی ڈھیٹ مٹی ہے یہ لڑکی۔ کیا آپ کا خیال ہے ایسے موقع پر قسمت کی دھنی ہونے والا محاورہ بولنا چاہیے تو پیارے بھائی وہ تو بہت اچھے، دل کو پیارے لگنے والوں کے لیے بولا جاتا ہے ناں اور میں یہاں کس کی پیاری ہوں؟“

ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو مگر میرے اندر بہت سی تنہائی بھر گئی ہے۔ خود بخود آپ ہی آپ اور مجھے یقین ہے، جس دن مجھے آپ مل گئے، یہ تنہائی خود بخود دور ہو جائے گی جیسے کسی اچھے شہزادے کے آنے سے مظلوم لڑکی جاگ اٹھتی ہے۔

لیکن عمومی کہانیوں کی طرح یہ کہانی مختلف ہے، اس لیے کہ اس میں ایک بہن اپنے لیے ایک چھایا بن جانے والے اس پر فخر کرنے والے بھائی کی مناجات کر رہی ہے، اس کے باپ کے پاس جاگیر نہیں خود وہ تہی داماں ہے مگر پھر بھی اس کو یقین ہے اس کے آئیڈیل پہ پورا اترنے والا ایک بھائی دنیا میں ضرور ہوگا۔

آگے کیا لکھوں۔ پاپا نے ہمیشہ کی طرح یہ نقصان بھی اچھے انسان کی سیلوفین پیکنگ میں لپٹا ہوا تقدیر کا پوسٹ کیا ہوا وصول کر لیا ہے۔ باقی باتیں پھر لکھوں گی۔

فقط بزعم آپ کی بہن
نادیہ حسن

ایک منٹ سنیے کیا یہ بہتر نہیں کہ ہر خط کے بعد میں یہ کہوں یہ اگلا خط ہے۔ آپ خود ہی خط تسلسل کے ساتھ پڑھتے جائیں، یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں تا کہ آپ کا ردھم نہ ٹوٹے۔ ٹھیک ہے اب میں ایسے ہی لکھوں گا۔

بہت پیارے لالہ!

سوچتی ہوں کہ آپ بھی سوچتے ہوں گے۔ یہ بونگی لڑکی ہے کہ اپنے اردگرد بستی آب جو کے ہوتے ہوئے بھی پیاس کا رونا روتی ہے۔ شاید مجھے ناخوش رہنے کی عادت ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن لالہ جس طرح زندگی کو میں نے پایا ہے، جس طرح میں اسے مکمل حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ یہ مجھے اس طرح کبھی نہیں ملی۔ بظاہر میرے چار بھائی ہیں مگر ان میں وہ نرم خوئی، توجہ اور شفقت نہیں جو میں نے ہمیشہ بھائیوں کے وجود میں باقی سارے عناصر سے زیادہ

دیکھنی چاہی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی بے مہر یا سخت گیر نہیں لیکن چھوٹی چھوٹی تمناؤں اور خواہشوں کا جس طرح ادراک میں چاہتی ہوں انہیں ہو وہ ہمارے احساسات سینت سینت کر رکھنے اور پورا کرنے والے بنیں وہ اسے فضولیات گردانتے ہیں پاپا کے اندر جتنی توجہ ہے، بھائیوں میں اتنی ہی لاپروائی ہے اور اسی بات سے مجھے چڑ ہوتی ہے۔ یہی نقطہ تو ہے جو مجھے اکساتا ہے کہ میں ایک آئیڈیل بھائی کا مجسمہ تراشوں اور پھر سارے عناصر میں سے محبت اور توجہ دل کی صورت رکھ دوں پھر چاہے تو کوئی بھی میرے ہاتھ تراش لے۔ میں تاج محل کے خالق کی طرح اف تک نہیں کروں گی اور یہ طلب ہی تو ہے جو مجھے تخیل کی لمبی لمبی اڈاریاں بھرنے کے لیے کمربستہ رکھتی ہے۔ مجھے تھکنے نہیں دیتی اور میں سوچتی ہوں وقت نے کیا واقعی کوئی ایک لمحہ، ایک موڑ ایسا رکھا ہے جہاں پر میں آپ کو لحظہ بھر دیکھ سکوں اور برملا چلا کر کہوں۔

''میں نے پالیا۔'' اور جاتے سمے اگر وہ لمحہ، لمحہ آخر ہو تب بھی مجھے اپنے جانے کا دکھ نہ ہو کیا واقعی ہم کبھی اس زمانے اور اس جہاں میں ملیں گے پیارے بھائی؟

فقط بزعم خود آپ کی بہن

نادیہ حسن

بہت پیارے لالہ!

سلام خلوص

کے بعد کیا لکھوں سوائے اس کے کہ اگر آپ اس وقت مجھے دیکھ پاتے تو جان لیتے کہ خوشی کیسے میری رگ رگ میں دیا جلائے چلی جاتی ہے۔ آپ حیران ہوں گے کیا مجھے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہے تو میں کہوں گی۔ میں نے اس سے بڑھ کر پالیا ہے آج بالآخر میری تلاش مکمل ہو گئی۔ میں نے آپ کو پرائیویٹ چینل پر دیکھ لیا۔ میں پروگرام شروع ہونے کے بعد ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔ اس لیے آپ کا نام تو نہیں جان سکی مگر آپ کو پانے کی خوشی اس نام کے آگے کچھ بھی نہیں میں نے بھلا آپ کو نام دینے کی آرزو کبھی کی ہی کہاں تھی جو یہ تمنا بے مہار ہوتی میں نے تو آپ کو پانے سے پہلے ہی اپنا پیارا سا بھیا تسلیم کر رکھا تھا۔ ناں سو ہمارے لیے آپ ہمارے پیارے سے لالہ ہی رہیں گے۔ تاہم ایک بات بتاؤں آپ ہیں بڑے اسمارٹ سے۔ سونیا کہتی ہے کوئی خاص نہیں ہیں آپ مگر ہماری نگاہ سے دیکھے تو آپ اسے دنیا کے خوبصورت ترین انسان محسوس ہوں گے۔ چہرے کی خوبصورتی دھوکا ہو سکتی ہے مگر اچھا انسان ہونا اولین شرط ہے اور پھر ہمارے بھائی ہو کر آپ عام ہو ہی نہیں سکتے ہاں جی خاص لوگوں کے خاص تو خاص ترین کہلاتے ہیں ناں بس دعا کریں ہم آپ کا نام جان جائیں۔

فقط بزعم خود آپ کی بہن

نادیہ حسن

بہت پیارے عمید لالہ!

سلام خلوص

دیکھا کیسے پہچان لیا آپ کو بالآخر ہم نام دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئے اور وہ جو ایک خالی جگہ تھی آج وہ بھی فل ہو گئی واہ عمید لالہ آپ تو اپنے نام کی طرح اسم بامسمی ہیں۔ ''معنی عمید تو وہ کچھ یوں ہے کہ جس شعر کو پڑھ

ڈالے۔ وہ امر ہو جاتا ہے۔ مردہ سے مردہ شعر میں محض اس کی آواز دل بھڑکا دیتی ہے اور ہم یہ سب سن کر اپنا فرضی کالر مزید اکڑا لیتے ہیں جیسے یہ ساری داد ہماری جھولی میں ڈالی جا رہی ہے۔ سچ کبھی کبھی سوچتی ہوں کاش میں آپ کو اپنے کسی بھائی سے ایکسچینج کر سکتی۔ آپ واقعی ہمارے سگے والے بھائی بن سکتے، لیکن خیر اب بھی آپ کون سے غیر ہیں۔ ہماری دل سے پوچھیے آپ کیا ہیں ہمارے لیے بائی گاڈ! آپ کے پروگرام کے وہ دو گھنٹے ہمارے لیے زندگی کی تلخیوں سے جان چھڑانے کے بہانے ہیں۔ آپ کا پروگرام دیکھ کر بے سبب بے مزا زندگی بھی جاندار لگتی ہے اور دل کہتا ہے جس دنیا میں ہمارے پیارے عمید لالہ ہوں، وہ دنیا بے کار اور فضول کیسے ہو سکتی ہے۔ ہے نا؟ آپ بس سدا یونہی ہنستے مسکراتے شعر غزل پڑھتے ہوئے مائی چوائس کرتے رہیے گا۔ ہم اب آپ کو کھونا نہیں چاہتے۔

فقط بزعم خود آپ کی بہن

نادیہ حسن

بہت پیارے عمید لالہ!

سلام خلوص

کے بعد عرض ہے کہ آپ نے اپنے پروگرام میں جو سوال پوچھا ہے کہ

آپ کے خیال میں لڑکیوں کو کنویں کے مینڈک کی طرح رہنا چاہیے؟

یا زندگی سے قدم سے قدم ملا کر چلنا چاہیے۔

تو اس کے جواب میں میں یہی کہوں گی۔ لڑکیوں کو بین بین چلنا چاہیے۔ وقار، بردباری اور نسوانیت کے بھرم کے ساتھ وہ جس شعبے میں چاہیں آگے بڑھ سکتی ہیں۔ بے مہار کسی بھی قسم کی آزادی ہو، وہ تباہی لاتی ہے سو توازن بہر حال کامیابی کی پہلی سیڑھی گردانا جائے گا کیونکہ جو لوگ تیز تیز سیڑھیاں پھلانگتے ہیں، وہ بہت جلد ٹاپ سیڑھی سے پھسلتے ہوئے نیچے آ رہتے ہیں۔

کیسے ٹھیک جواب دیا ناں میں نے؟

آہاں! آپ کی مسکراہٹ بتا رہی ہے، میں نے پچاس میں سے بیس مارکس تو لے ہی لیے ہیں، ویسے یہ سونیا مجھ پر بہت ہنس رہی ہے کہتی ہے عمید لالہ نے اگر تمہاری یہ حالت دیکھ لی تو وہ کنویں کا مینڈک کی اصطلاح کے بجائے تالاب کا مینڈک کہیں گے۔ ویسے کھامڑ ہے یہ لڑکی کنویں کے مقابلے میں تو تالاب زیادہ بڑا ایریا ہوتا ہے ناں مگر اسے یہ سب کیا پتا اسے تو بس میڈیکل کی کتابوں کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا آپ کو بتایا تھا ناں سونیا اور غانیہ، دونوں ٹوان ہیں۔ ارے نہیں بتایا تھا تو اب بتا دیتی ہوں اس میں کیا پرابلم تو جناب۔ یہ دونوں ٹوان ہیں اور پری میڈیکل میں پڑھ رہی ہیں۔ کیا اب آپ یہ پوچھیں گے۔ میں کس ایئر میں ہوں تو ڈیرسٹ لالہ! میں نے انٹر کیا ہے۔ آہم یقیناً سب کی طرح آپ پوچھیں گے میں نے گریجویشن مکمل کیوں نہیں کیا تو اس میں حالات سے زیادہ حماقت کا دخل تھا۔ دراصل پڑھنے پڑھانے کا ہمیں شوق تو بچپن سے تھا لیکن غیر نصابی کتب کا! ٹارزن کی واہیات ٹائپ کی کتابوں سے کبھی آگے نہیں بڑھ سکے۔ سو جھنجلا کر کتابوں کی طرف ہی متوجہ ہونا تھا۔ لیکن عقلمندی یہ ہوتی تھی کہ ہم اپنی کتابیں سال کے پہلے مہینے میں پڑھ پڑھا کر مکا دیتے تھے پھر آپ جانیں پورے سال یہ کتابیں پڑھنی پڑیں تو کس قدر بورنگ فیل ہوگا۔

ہم چلاتے رہ جاتے۔ کورس بدلو کورس بدلو مگر کوئی نہ سنتا سو صبر برداشت سے میٹرک کر لیا لیکن انٹر کرنے تک ہمارا ضبط جواب دے گیا کیونکہ ہمارا چلن بھی یہی تھا اور زمانے یعنی ٹیکسٹ بک بورڈ والوں کا بھی۔ سو خیال پیدا ہوا ہوا۔ کیوں نہ درمیان میں گیپ دے لیا جائے تاکہ کچھ نیا پن لگے۔

سو گھر بھر کے شور کے باوجود ہم نے وقفہ لیا محض ایک سال کا اور پھر یوں ہوا کہ دل دوبارہ اس طرف مڑا ہی نہیں۔

زیادہ دلچسپ کتابیں ہمیں ممتاز مفتی، مظہر الاسلام، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، مستنصر حسین تارڑ، الطاف فاطمہ، رضیہ فصیح احمد اور خلیل جبران کی لگا کرتیں۔ سو ٹیکسٹ بک بورڈ کا پورا چینل یہاں ہم سے شکست کھا گیا اور ہم آگے نہیں پڑھ سکے پھر بابا کی ڈیتھ کے بعد تو سلسلہ اور ہی ٹھپ ہو گیا رہا ہمارا دبو پن تو عمید لالہ گھر میں ہر بات کا اس قدر ریکارڈ لگتا ہے کہ ہم جو افسانے لکھ لیتے ہیں۔ ٹیلی فون پر سن کر کسی کا فون نمبر تک نہیں لکھ پاتے۔ عجیب طرح کا دھڑکا رہتا ہے کہ شاید ہم یہ کام ٹھیک نہ کر سکیں اور وہی بے یقینی ہم سے کچھ بھی نہیں ہونے دیتی۔

آگے کیا لکھوں سوائے اس نوید کے کہ اگلے خط میں میں اپنی کچھ شاعری لکھوں گی اس امید کے ساتھ کہ اسے آپ اپنے پروگرام میں ضرور پڑھیں گے۔

فقط بزعم خود آپ کی بہن

نادیہ

بہت پیارے عمید لالہ!

سلام خلوص

ہاں آں تو اس نوید کا آپ پر کیا اثر ہوا کہ میں شاعرہ بھی ہوں بھلا آپ کو کیا کہ میں شاعرہ ہوں یا افسانہ نگار اوکے پھر بھی ہم آپ کو اپنی شاعری لکھنے سے پہلے اس کا پس منظر ضروری بتا دیں۔ دراصل یہ سب ہم نے اپنی فرینڈ کے لیے لکھا تھا، بھلے وقتوں کی ایک بہت اچھی سی فرینڈ کے لیے مگر اشاعت کے لیے بھیجنے سے اس لیے سدا گھبرائے رہے کہ وصال و ہجر کی اس کیفیت کو نجانے کیا کیا عنوان دیے جائیں گے۔

چلیے اس دفعہ صرف ایک شعر اور ایک نظم لکھ رہی ہوں آپ نے سراہا تو آئندہ بھی آپ کے پروگرام میں حصہ لیتی رہوں گی۔ میری طرف سے خدا حافظ۔

حاضر ہے۔

میں محبت تھا کبھی مگر اب صرف آہ ہوں
تیری روٹھ جانے والی نگاہ ہوں

جاتے برس کا دامن تھامے
میں نے کہا
سوغات مری؟
ہنس کر مجھ کو اس نے دیکھا
اور اپنے دامن سے

مجھ کو دان کیا

ہاں میرا سارا جیون

تیرے نام کیا

”آہم! کیسی لگی یہ شاعری؟ بتایئے گا ضرور۔

فقط بزعم خود آپ کی بہن

نادیہ

بہت پیارے عمید لالہ!

سلام خلوص

بالآخر میں نے آپ کا ٹیلی فون نمبر حاصل کر ہی لیا۔ میری ایک موسٹ ڈیرسٹ فرینڈ ہے نائلہ علی، اس نے پتا نہیں کس طرح جادو کر کے آپ کا نمبر حاصل کر لیا اور زندگی میں شاید پہلی بار میں نے کسی چیز کے لیے ہاتھ پھیلایا تھا۔ دیکھ لیجیے عمید لالہ محبتیں کیسے انسان کو فقیر بنا دیتی ہیں مگر آپ شاید یہ کبھی نہیں جان سکیں گے کیونکہ میں آپ کو یہ خط کبھی بھی پوسٹ نہیں کر پاؤں گی۔ مجھے ڈر لگتا ہے بھائی کہ اگر آپ کے اندر اتنا تجسس اور ہماری محبت کے جواب میں نہ جاننے والوں کی ڈھیروں ڈھیر آشنائی ہوئی تو؟

آپ نے دیکھنے کے باوجود نہ دیکھنے والوں کی طرح گزر جانا افضل جانا تو۔

ہمارا کیا ہوگا۔ ہم جو آپ کو بہت کم دنوں میں بہت سارا جاننے لگے ہیں جس نے آپ کا ہیولہ بہت بچپن سے تراش رکھا تھا تو کیا آپ اس پر یقین کریں گے کہ کوئی انسان اس قدر بھی فضول ہو سکتا ہے۔

آپ کی دنیا میں محبت کو فضول بات اور خلل دماغ ہی تو سمجھا جاتا ہے ناں سو میں یہ لیبل خود پر لگوانے سے ڈرتی ہوں۔ میں اس بات سے بھی ڈرتی ہوں کہ میں آپ کو بہت محبت سے کارڈ بھیجوں اور آپ اپنے [illegible] آئے ہوئے بے شمار کارڈوں میں سے انہیں بھی ایک کارڈ سمجھیں یونہی سا ایک کارڈ اور میں یہ بھی کہہ سکوں کہ میں نے کبھی یونہی سا بھی کسی کو کارڈ بھیجنے کو ہمیشہ فریب سمجھا ہے میں نے ہر فرینڈ کے خط کے آخر میں صرف تمہاری دوست لکھنے سے محض اس لیے اجتناب برتا ہے کہ یہ سراسر جھوٹ ہے، فارمل جملہ ہے لیکن مجھے پتا ہے میں یہ کبھی آپ کو باور نہیں کروا سکوں گی۔

فقط بزعم خود آپ کی بہن

نادیہ

بہت پیارے عمید لالہ!

سلام خلوص

کے بعد عرض کروں کہ آج کل دن کتنے بے رنگ سے گزر رہے ہیں میں اپنے ہاتھ میں آپ کا نمبر لیے بیٹھی رہتی ہوں۔ سونیا کہتی ہے میں آپ کو فون کروں۔ آپ سے آپ کی ڈیٹ آف برتھ پوچھوں۔ ویڈنگ اینورسری ڈیٹ دریافت کروں اور پھر کہوں۔ آپ نے ہمیں اگر اس بار ان تقریبات میں نہ بلوایا تو ہم آپ سے سخت ناراض ہو جائیں گے۔ لیکن پھر سوچتی ہوں اتنی بے تکلفی ہے ہی کب جو میں یہ پوچھوں خیالوں خیالوں میں آپ سے ڈھیروں باتیں کر

لہٰذا اور بات ہے بالمشافہ خواہ فون کے ذریعے ہی سہی بات کرنے سے جان جاتی ہے۔ ڈر لگتا ہے اس بات سے کہ کہیں کسی بات سے آپ ناراض نہ ہو جائیں۔

غانیہ کہتی ہے پھر آپی اس فون نمبر کا کیا مقصد؟

تو میں ہنس پڑتی ہوں لیکن یہ صرف آپ سے شیئر کر رہی ہوں عمید لالہ کہ آپ کا کانٹیکٹ نمبر میرے لیے امید کی کرن، اندھیرے میں جگنو کی طرح ہے۔ ایک یقین ہے کہ میں جب چاہوں آپ کی آواز سن سکتی ہوں مگر میں شاید کبھی یہ جسارت نہ کروں۔ سوائے اس کے کہ میری دعا رہے گی۔ آپ جہاں رہیں، خوش باش رہیں۔

فقط بزعم خود آپ کی بہن

نادیہ

اور یہ آخری خط۔

بہت پیارے عمید لالہ!

سلام خلوص

کیا؟ کیا خواب اتنے جھوٹے ہوتے ہیں، تمنائیں اتنی بودی ہوتی ہیں، جذبے اتنے بے اثر ہوتے ہیں کہ انہوں نے آپ پر معمولی سا بھی تاثر نہ ڈالا۔ ہم جو خاموشی سے آپ کو سوچتے رہے۔ ہر خوشی، ہر غم آپ سے شیئر کرتے رہے۔

آپ نے ہمیں نہیں پہچانا؟

اپنی نادیہ حسن کو جو بزعم خود آپ کی بہن بنی بیٹھی تھی۔

آپ نے مجھے نہیں پہچانا؟

میں نے آپ کے اسٹوڈیو سے آ کر سمندر بہا دیے ہیں آنکھوں سے، مگر دل کی ٹیس ہے کہ بڑھتی جا رہی ہے۔ میں نے آئینے کے سامنے خود کو ہزار بار دیکھا ہے۔ مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی مگر مجھے حیرت ہے پھر بھی آپ مجھے پہچان نہیں سکے۔ ایک ایک خال و خد شکوہ کناں ہے۔

ہنستا ہے مجھ پر نادیہ حسن تم جو دعوا رکھتی تھیں کہ تم آنکھیں بند کر کے بھی اپنے عیسیٰ عمید لالہ کے خال و خد کو دوہرانا چاہو تو تمہیں معمولی سی بھی دقت نہ ہوگی۔ کہاں گیا یہ زعم کہ عمید لالہ نے تمہیں نہیں جانا، تمہیں نادیہ حسن کو۔

سسکیاں کراہیں تھیں اس خط میں، میں نے واقعی کیوں نہیں پہچانا تھا اسے۔

”سر! کافی پیجیے گا؟“ یکدم کمرے میں ملازم نے داخل ہو کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا تو میں جو خود سے سوال کرنے والا تھا۔ خود کو کنفیشن باکس میں لا کھڑا کرنے کا عزم رکھتا تھا۔ یکدم چونک گیا۔

”سر! کافی؟“ ملازم نے پھر سے پوچھا تو میں نے سر ہلا دیا۔ وال کلاک کی طرف نظر ڈالی۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ سو میں نے صرف کافی ہی پی اور فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا، ملازم نے کہا بھی لباس ہی بدل لیجیے کہ دو دن سے آپ نے کپڑے نہیں بدلے تو میں نے اپنے زعم کو ہنکارا بھر کے دیکھا۔

”تمہیں کبھی زعم تھا ناں اپنی خوش لباسی، نفاست پہ تو تمہاری سزا ہے کہ تمہارے دل کی نہ کی جائے... بے نہ کبھی بھی نہیں۔“ سوچتے ہوئے میں نے گاڑی اسٹارٹ کی گیٹ سے نکل کر دوسری گاڑیوں کے ریل رواں میں پہنچ

ہاسپٹل پہنچنے میں ٹھیک گھنٹہ لگا صبح کے سات بج رہے تھے جب میں نازیہ حسن کے کمرے میں داخل ہوا جمیل احمر خواب آلود آنکھوں سے ابھی تک اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ بظاہر ڈاکٹرز کا خیال تھا۔ یہاں ہمارا ٹھہرنا غیر ضروری سا ہے لیکن ہم میں سے کوئی بھی اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ سو دن بھر میں جب وقت ملتا ہے وہ یہاں چلا آتا ہے۔ پہلے یہ لڑکی چاہتی تھی، ہر طرف محبت اور توجہ کا ارتکاز بکھرے رہے تو یہ تنہا تھی اور اب سب اس کی طرف متوجہ ہیں تو یہ منہ موڑے پڑی ہے۔

''ہیلو نازیہ کیسی ہو؟'' میں نے اس کا رخسار ہولے سے چھوا تو جمیل احمر کی آنکھیں جل تھل ہو گئیں۔

''آپ ایسے سوال مت کیجیے جن کے یہ جواب نہیں دینا چاہتی۔''

''کیوں نہیں دینا چاہتی یہ میرے سوال کے جواب میں۔ ایکس وائی زیڈ تو نہیں ہوں میں تو عیسیٰ حمید ہوں ناں اس کا حمید لالہ پھر۔'' بے سبب میری آواز رندھی ہوئی تو جمیل احمر میرا کاندھا تھپتھپاتا باہر نکلتا چلا گیا اور وقت کچھ اور بیت گیا۔

☆

اور پھر بظاہر میں اس یخ بستہ خاموش کمرے سے نکل آیا ہوں لیکن لگتا ہے میرا دل اندر سے خالی کمرہ ہو کر رہ گیا ہے جہاں آنسو اور سسکیاں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بے زر مسافر کی طرح سر جھکائے بیٹھے ہیں اور خوشگوار لمحات ہیں اس کمرے میں داخل ہونے کی جستجو میں شریر بچوں کی طرح اندر جھانک جھانک کر در آنا چاہتے ہیں مگر سخت گیر وقت ہے، بے مہری سے انہیں گھورے جاتا ہے اور خوبصورت لمحے ہیں سہمے ہوئے اسے تک رہے ہیں چاروں طرف خاموشی ہے کچھ فطری اور غیر فطری اور درمیان میں، میں ہوں سرد ہوا کی طرح اندر باہر بجتے در اور سائیں سائیں کرتی ہوا سے لرزیدہ لیکن میں آج جس موسم کا شکار ہوں میں شروع سے ان موسموں کا عادی نہیں تھا میں اپنے والدین کا لاڈلا بچہ نہ سہی پھر بھی والدین کی آنکھوں میں اولاد والی تھوڑی بہت محبت سے ہی دل اور روح گرمانے اور تسلی پا لینے والا ہر سمجھوتا کر لینے والا انسان تھا۔ میں نے کبھی ضد نہیں کی تھی کیونکہ میں سمجھتا تھا جو کچھ میرا نصیب ہے، وہ مجھے مل کر رہے گا۔ بابا کہتے میرا جمیل واقعی میرا بیٹا ہے میری طرح نرم، دھیما، آسودہ جس حال میں رکھو خاموشی سے رہ جائے۔'' اور اماں کہتیں

''آپ کو لگتا ہوگا ایسا ورنہ مجھے تو یہ چپ گھنا لگتا ہے، رنگ روپ اور مزاج میں آپ پر ہی تو گیا ہے ناں۔''

اور یہ واحد ایسا ٹاپک تھا کہ اماں بابا میں کبھی صلح نہیں ہوتی تھی، پتا نہیں اماں کو بابا سے اتنی پرخاش کیوں تھی۔ یوں لگتا، وہ لمحہ لمحہ کسی نادیدہ آگ میں جھلسے جاتی تھیں مگر پھر بھی زبان بندی کے حکم نامے پر سر جھکائے رکھنا اپنی مجبوری سمجھتی تھیں۔ وہ جو ہر معاملے پر آ کر جھک جاتی تھیں جنہیں بابا سے کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوتا تھا۔ پتا نہیں مجھ پر ان کی نظر ٹھہر جاتی تو انہیں ایسا کیا یاد آ کر رہ جاتا کہ پھر وہ ہر لحاظ اور مروت کو بالائے طاق رکھ دیتیں میں اماں کو ترحم سے دیکھتا۔ بابا کے سامنے ان کی حمایت کرتا تو پتا نہیں اماں میرے ہاتھ کیوں جھٹک دیتیں۔

''چل ہٹ۔ میں جانوں ہوں، تیرے دل میں میرے لیے کبھی محبت نہیں ہوگی۔''

''واہ، اماں! بھلا آپ کی محبت کے علاوہ یہاں دھرا کیا ہے۔'' میں اور قریب ہوتا تو اماں اور آگے سرک جاتیں۔

''مت بنایا کر مجھے! مجھے پتا ہے تیرے لیے میری کوئی اہمیت نہیں میں اپنا ماس بھی نوچ کر کھلا دوں ناں تب

بھی تجھے اپنا نہیں بنا سکتی۔''

اور بس اس لمحہ بابا لرزیدہ آنسو بن جاتے۔ اماں کا لفظی حملہ مجھ پر ہوتا مگر لگتے بابا نڈھال تھے پھر خاموشی میں ایک جملہ بکھرتا۔

''مجھے تمہاری قدر ہے عالیہ! ماضی کو چھوڑ کر دیکھو۔ تمہیں اطمینان تب ملے گا جس پر تمہارا حق نہیں تھا۔ اس پہ مصر کیوں ہو۔ مجھے دیکھو اب دیکھو، میرا حال، میرا مستقبل تم سے وابستہ ہے۔ تم آخر کیوں نہیں مان لیتیں یہ بات۔''

اماں ناک چڑھا کر دیکھتیں پھر ہنکارا بھر کر کہتیں۔ ''اس لیے کہ یہ جھوٹ ہے سفید جھوٹ۔'' بابا اپنے کمرے میں چلے جاتے اور میں اماں کی سرد مہری سہتا رہتا۔ دل میں خیال آتا۔ کیا پتا میں اماں کا سوتیلا بیٹا ہوں تو دماغ کہتا۔

''پھر کیا ہوا، اماں تو میری ہیں نا اب۔'' مگر یہ بات میں کبھی اماں کو نہیں بتا سکا کہ واقعی میں بھی دل و جان سے ان کا تھا۔ بابا کی سرد سی خاموشی میرے وجود پر چھا گئی تھی اور دل میں جالے بنتی رہتی تھی کہ اچانک میں نے بابا کے راز کو جان لیا۔

تو یہ تھی اماں کے دل کا کانٹا، مجسم گلاب لڑکی جو شاید اب تھی بھی یا نہیں یا کیسی تھی۔ اماں اس سے لڑتی رہتی تھیں۔ ایک ہیولہ سے جو ان کا پاسنگ بھی نہیں تھی، خوبصورت ترین تو اماں بھی کہاں تھیں مڈل کلاس کی ایک عام سی عورت لیکن یہ لڑکی تو ان سے بھی زیادہ عام تھی، موٹے سے نقوش، بوٹا سا قد۔ ہاں بس اگر اس میں کچھ ہوتا تھا تو وہ اس کی آنکھیں تھیں۔ متوازن آنکھیں، جن میں پتا نہیں خواب اتنے چمکیلے تھے یا ان آنکھوں کی چمک ہی فطری تھی بنا کسی وجہ کے ہوتی ہیں ناں بعض آنکھیں جو بس کسی وجہ کے جل اٹھتی ہیں معمولی سی باتوں سے اور ان سے بھی معمولی سی باتوں سے بجھ جانے والی۔

''مگر بابا کا ان سے کیا تعلق؟'' سوال کیا خود سے، پھر ڈائری ہاتھ لگ گئی سال خوردہ سی ڈائری اور تب پتا چلا اس لڑکی کا ایک نام بھی تھا۔

''آئینہ امین۔'' اور یہ کہ وہ آئینہ دھندلا ہو گیا تھا۔ گرد میں اٹ گیا تھا۔ بہت حادثاتی بابا کی پسند رد کر دی گئی تھی اور وہی عمومی کہانی کہ بابا نے خاندان کی لڑکی سے شادی کر لی اور یہی بات آئینہ امین کے دل میں خراش ڈال گئی جیسے کسی شریر بچے نے آئینے پر پتھر پھینکا اور شیشہ چور چور ہو گیا مگر بکھرا نہیں بس کسی ایک ٹھیس کا منتظر رہا اور وقت سا ضدی بچہ اور کون ہو سکتا ہے سو وہ ٹھیس بھی لگا دی۔

جب اماں نے شادی کی دعوت دینے پر آئینہ امین کو کھری کھری سنا دیں۔ ان کے کردار پہ جو دل چاہا کہہ ڈالا اور وہ جو اچھے کولیگ کی حیثیت سے ان کی خوشی میں دل پہ ضبط کے پہرے بٹھا کر بیسٹ گرل کا تمغہ لینے آئی تھیں دل پر داغ لے کر گئیں اور پھر زیادہ وقت نہیں لگا کہ انہیں یہ غم مٹی میں ملا آیا۔ اپنی تذلیل، اپنی عزت نفس کی تذلیل پر وہ زندگی کا سودا نہ کر سکیں اور سارا خسارہ ان کے حساب میں آیا اور بس اماں اس لیے چڑتی تھیں۔ ان کا خیال تھا، وہ بظاہر مر چکی ہیں مگر بابا کے دل میں آج بھی زندہ ہیں اور مجھے دیکھ کر انہیں یہ ماضی کبھی نہیں بھولتا۔ وہ بابا کا بدلہ مجھ سے لینے لگتی تھیں۔ میرے خال و خد میں ماضی کے احمد حسن سے لڑتی تھیں۔ لڑتی ہی چلی جاتی تھیں پھر تھک جاتیں تو رونے لگتی تھیں اور میں بابا کے ماضی کا مداوا کرنے کے لیے ان کے لیے خاک بن کر ان کے قدموں میں بچھا رہتا۔ ان کی جا سنتا ان کی بے جا

بھی ہنستا اور بہن بھائی کہتے۔

"یہ جمیل تو احمق ہے اس کی اپنی پسند ناپسند اور سوچ نہیں۔ اماں کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اماں کے کانوں سے سنتا ہے نہ انا ہے نہ معصوم سی ضد۔" اور میں ہنس پڑتا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اماں کی آنکھوں میں کتنے آنسو تھے اور بس ان کے آنسوؤں کو مسکراہٹ میں بدلنے کے لیے ان کے سامنے سرنگوں رہتا۔ میں جو چھ فٹ کا بھرپور مرد تھا۔ میں جو اپنے شروع کیے کاروبار کو بہت فہم فراست سے چلا سکتا تھا۔ میں جو باہر نہایت روڈ اور لیے دیے رہنے والا شخص تھا، پتا نہیں اماں کے سامنے کیوں ہار جاتا تھا۔ میں چاہتا تو اور بہن بھائیوں کی طرح اماں کی باتوں سے ان سے دور ہو جاتا۔ محض اپنی مگن زندگی گزار سکتا تھا لیکن میں پھر بھی بغاوت کا علم بلند نہیں کر پاتا تھا جیسے بہت سے دل سخت ہوتے ہیں۔ ان پر کچھ اثر نہیں کرتا جیسے بہت سے بچے ہوتے ہیں۔ عموماً مست الست، ہر طرف سے لاپرواہ۔ میں اس طرح چاہنے کے باوجود نہیں بن پاتا تھا میرا دل پتا نہیں کیوں اتنا موم تھا کہ پگھلے ہی چلا جاتا اور اماں کے آنسو دیکھ لیتا تو پانی ہی پانی ہو جاتا۔

پھر یوں ہوا، میں نے اماں کے دل میں کچھ جگہ بنا ہی لی پھر میں سمجھا، میں نے ممتا کو جیت لیا ہے۔ اماں میری مرضی منشا کے بنا ایک گھر میں مجھے ہار آئیں۔ وہ میری اپنی پسند سے شادی کرنا چاہتی تھیں مگر مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ کس قدر کڑا امتحان لیں گی میرا۔ میں پہروں اس لڑکی کی تصویر کو دیکھتا۔

"یہ لڑکی اماں! کیا نظر آیا اس لڑکی میں آپ کو۔ وہی موٹے نقوش وہی بونا سا قد اور یہ کتنی صحت مندی بھی تو لگتی ہے۔"

"تو کیا ہوا، شادی ہو جائے گی تو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لینا۔ پڑھی لکھی ہے کوئی جاہل تو نہیں۔" اور میں چپ رہ جاتا۔

باؤلا ہوا ہے جمیل! محض اماں کی ضد پر قربان ہو رہا ہے۔"

بھائی کہتے "زندگی ایک بار ملتی ہے جمیل! کیوں گنوا رہے ہو اسے۔ تم سے بندے کے لیے تو کوئی تم سی لڑکی ہونی چاہیے ویل ایجوکیٹڈ ویل آف لیکن یہ ہرگز نہیں۔"

مگر وہ جو ہرگز نہیں تھی، وہ سب کچھ بنی میرے ہمراہ آ بیٹھی تھی۔ سب نے کف افسوس ملا تھا۔ "کس قدر ہیرا سا لڑکا تھا مگر پتا نہیں عالیہ نے کیوں مٹی میں تول دیا۔"

سب نے سوچا وہ کہا اور مجھ میں احساس بے بسی بڑھتا چلا گیا اور پھر مظلومیت حد سے بڑھے تو یا تو مٹی کر دیتی ہے یا باغی اور میں باغی بن گیا تھا۔ مجھے اس لڑکی سے چڑ تھی جو میری سب کچھ بنا دی گئی تھی اور وہ لڑکی ہر وقت میرے اردگرد گھوما کرتی پہلے سے بہت حد تک بدل گئی تھی، اس نے وزن بھی کم کر لیا تھا۔ میک اپ سے خود کو بھی سنوار لیا تھا مگر میں نے ایک بار اسے رد کر دیا تو بس رد کر دیا تھا مجھے اپنا احساس زیاں مارے ڈالتا تھا اور اماں تھیں پہلے سے زیادہ مجھ پر مہربان ہو ہو جاتی تھیں۔ میں وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ اس لیے اماں کی طرف دوڑتا اور بابا دبے لفظوں میں مجھے سمجھائے چلے جاتے۔

"ظلم ہے یہ اس بچی کے ساتھ۔ وہ بھی کسی کی بیٹی ہے۔ اس کے بھی کچھ ارمان ہوں گے۔"

اور میں سر جھٹک کر اس کے ارمان جھٹلائے جاتا اور حیران ہوتا اس بونے سے قد کی لڑکی کی تو خواہشیں بھی

بوٹی بوٹی سی تھیں۔

"کتابوں کا ریک بنوا دیں"

"ایک شعر سن لیں۔"

"یہ کہانی کیسی لگی آپ کو؟"

وہ رسالے بڑھائے جاتی اور میں نخوت سے اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ وہ اکساتی بھی تو اتنا ہی کہتا۔

"کیا یہ کم نہیں میں نے تمہارے لکھنے پڑھنے پر کوئی پابندی نہیں لگائی پھر شکر کیوں نہیں کرتیں یہ بہت بڑی مراعت ہے۔ تمہیں جو کوئی شوہر نہیں دیتا۔"

وہ آنسو بھر کے مجھے دیکھتی تو میں کمرے سے نکل جاتا۔ آنسو دیکھنے کی تو مجھ میں ہمت ہی نہیں تھی ہاں۔ چاہے وہ آنسو کسی کی بھی آنکھ سے نکلے ہوئے۔ سوچا کتا رہتا۔ تھک کر آتا تو وہ پچھلا رویہ بھول کر پھر سے میری پیشوائی کرتی۔ خوش آمدید کہتی مجھے دن بھر گھر کے کام نمٹاتی رہتی اور رات کو جب سب سو رہے ہوتے تو وہ لونگ روم میں ٹیبل پر کاغذات بکھرائے اپنا کوئی نہ کوئی افسانہ لکھ رہی ہوتی۔

اس کے دو ہی تو کام تھے ایک افسانہ لکھنا۔ دوسرے خط لکھنا اور مجھے حیرت ہوتی کہ وہ اتنے تواتر سے آخر کسے خط لکھے جاتی ہے۔ میرے گھر کے پتے پر آج تک اس کا کوئی خط نہیں آیا تھا مگر وہ پھر بھی خط لکھ کر لفافے بند کیے جاتی۔

"کس کے ہاتھ پوسٹ کرواتی ہے؟ کس کے لیے لکھتی ہے؟" تجسس ہوتا مگر میں ضد اور انا میں لدا پھندا کھڑا رہتا۔

میں جس قدر نرم تھا۔ اس کے لیے اتنا ہی سخت بن گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے اپنے اعصاب یوں لگتے جیسے بان کی کوئی چارپائی بارش کی بوندوں میں چھوڑ کر بھول گیا ہو اور دھوپ پڑنے پر چارپائی کے اندر ٹیڑھ پیدا ہو گئی ہو۔ کوئی پایا زمین پر ٹھیک لگتا ہی نہ تھا۔ ایک طرف زور دے کر بیٹھو تو دوسرا پایا خود بخود آؤٹ آف کنٹرول ہو کر الف ہو جائے سو میں بھی پورا کا پورا آؤٹ آف کنٹرول تھا اور اس کے آنسو تھے کہ مجھ پر، میرے اعصاب پر ہر رات گرتے مگر پھر بھی یہ ٹیڑھ نہ دور ہوتی اور اماں تھیں میرے کاندھے تھپکے جاتیں۔

"ٹھیک کر رہا ہے عورتوں کو زیادہ سر چڑھانا ٹھیک نہیں ان کو ان کی اوقات یاد رہنی چاہیے۔"

میں سر جھکا لیتا اور بابا شکوے سے اماں کو دیکھے جاتے۔ وقت چیونٹی کی رفتار سے گزرتا گیا، یہاں تک کہ بابا ایک دن بس بہت اچانک سفر عدم کے لیے چل پڑے تو گھر بھر میں امی کے بعد وہ تھی جو بلک بلک کر رو رہی تھی۔ گھر کے سب بچوں کے لیے تو بابا بہت پہلے کب کے مر چکے تھے۔ سارے فیصلے یا تو بچے خود کرتے یا اماں کرتیں سو بابا کا لگ بندھا سایہ بھی ڈھل گیا تو نیا تو کچھ نہیں ہوا تھا۔ بس دلوں کو جھٹکا لگا تھا مگر کوئی اس طرح نہ رویا تھا۔

اماں کا تو سہاگ تھا، اماں اس کے لٹنے پر نوحہ کناں تھیں مگر یہ نادیہ کیوں زمین آسمان ایک کر رہی تھی۔

"دنیا دکھاوا ہے، یہ بہوئیں تو یونہی ڈرامہ کیا ہی کرتی ہیں۔" میت میں شریک خواتین کی زبان روانی چل رہی تھی۔ میں سب کے جملے اندر اتارتا رہا تھا مگر پھر رات گئے کمرے میں آیا تو اسے روتے دیکھ کر بجھ گیا۔

"تمہارا کون مرا ہے جو ڈرامے کر رہی ہو۔ وہ میرے بابا تھے، میرے۔" میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے جتایا تو وہ گنگ مجھے دیکھے گئی۔

‘‘وہ صرف بابا تھے، آپ کے اور میرے، کیا بات ہوئی۔’’

میں لاجواب ہونے لگا مگر جب وہ اپنے بابا کی باتیں سنانے ان کے عکس کو بابا کے عکس میں دیکھنے کی بات کرنے لگی تو مجھے شرمندگی مٹانے کا موقع ہاتھ لگ گیا اور میں نے ہنکارا بھرا۔

‘‘یوں کہو ناں۔ تم میرے بابا کے نام پر اپنے بابا کو رو رہی ہو۔ بی بی! یہ اکیسویں صدی ہے یہاں ہر چیز کے ہونے کے لیے وجہ اور ہر وجہ کے لیے واقعہ چاہیے۔ ہم اسی دنیا کے لوگ ہیں ناں، سو ہم خوشیوں پر تو ہمیشہ تنہا اپنے لیے خوش ہوتے ہیں مگر دکھ پر ہم پتا نہیں کس کس کا لیبل لگا کر روتے ہیں۔ سچ بتاؤ۔ کیا واقعی تم۔’’

میں نے جملہ پورا نہیں کیا اور وہ کمرے سے باہر چلی گئی اور یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ وہ مجھے جب بھی غصے میں دیکھتی یا اسے مجھ پر کسی بات پر غصہ ہوتا۔ وہ میرے سامنے سے ہٹ جاتی مگر دوسرے ہی دن وہ میرے لیے پھر سے مصروف دکھائی دیتی۔ اسی ناراضگی پتا نہیں بھاتی نہیں آتی تھی یا اس کی یادداشت کمزور تھی۔ وہ بہت دیر خفا نہیں رہتی تھی اور اس کا بھائی نعمان تھا کہتا تھا۔

‘‘آپی میں اگر کوئی اچھائی ہے تو صرف ایک کہ وہ ناراض ہونا تو جانتی ہیں مگر دیر تک ناراض رہنا ان کی خو نہیں جھگڑتی ہیں مگر بہت جلد نرم پڑ جاتی ہیں۔’’

اور میں اس کی طرف نظر کرتا تو سوچتا۔ کیا واقعی یہ لڑکی کبھی لڑتی بھی ہوگی پوچھنے کو آگے بڑھنے لگتا تو ذرا اماں کسی نہ کسی حوالے سے ہمارے درمیان آ جاتیں اور یوں میں اس کی شخصیت کی گتھی کی گرہ کھولتے کھولتے رہ جاتا۔ پھر ایک دن اچانک وہ بہت خوش دکھائی دی۔ اس گھر میں وہ جب سے آئی تھی میں نے پہلی بار اسے اتنا خوش دیکھا تھا۔ سو بے ساختہ میں نے سوال کر ہی ڈالا۔

‘‘خیریت کیا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہے۔’’

وہ مجھے دیکھتی رہی پھر بالکل میرے کاندھوں سے جھول گئی۔ آنکھیں موندے اثبات میں سر ہلا کر مجھے دیکھے گئی یوں جیسے مجھ سے خوشی شیئر کرنے اور نہ کرنے کے بارے میں خود سے کوئی فیصلہ لے رہی ہو اور میں فارغ تھا، سو اس کے چہرے کے رنگوں میں کھو سا گیا۔ یہ عام سی لڑکی آج پتا نہیں۔ اتنی خاص کیوں لگ رہی تھی۔ شاید خوشی انسان کے اندر ایسے ہی دیے جلاتی ہے۔ میں دیکھے گیا۔ دیکھے گیا، پھر تھک کے تکیے پر سر ڈالے پوچھ بیٹھا۔

‘‘آخر کیا خبر ہے تمہارے پاس، اتنا مسکرا کیوں رہی ہو نادیہ۔’’

وہ میرے قریب آ بیٹھی پھر آہستگی کے ساتھ بولی۔ ‘‘آپ میرے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں؟’’

میں نے چونک کر اسے دیکھا پھر اس میں زمانے بھر کی خامیاں ڈھونڈنے لگا لیکن خامیاں گن کر ابھی کہنے والا تھا کہ زبان بے سبب دغا دے گئی۔

‘‘ظاہر ہے، بہت اچھی رائے ہے تمہارے لیے۔’’

‘‘آپ کو مجھ پر اعتبار ہے ناں پورا اعتبار۔’’

‘‘ظاہر ہے بھئی، لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو۔’’

‘‘صرف اس لیے کہ میں حمید بھائی کو ڈنر دینا چاہتی ہوں۔’’

“عمید کون ہیں یہ ذات شریف؟ کیا کوئی کزن؟”

“نہیں، وہ میرے کچھ بھی نہیں لگتے مگر میرے لیے سلمان اور کبیر بھیا کی طرح ہیں۔”

“ہمم۔ اتنے اہم ہیں تو اتنے عرصے سے متعارف کیوں نہیں کروایا۔”

میں نے عام سے لہجے میں کہا اور وہ سر جھکا گئی۔ “بس ڈر لگتا تھا پتا نہیں آپ کیا سمجھیں اور اماں کس انداز میں اس حوالے کو دیکھیں۔”

جھماکا ہوا۔ “ہاں یہ بھی تو ہو سکتا ہے یہ لڑکی کون سے داؤ گھات کر رہی ہو۔ پتا نہیں کون ہے یہ عمید اتنے خاص انداز سے کہنا کچھ تو معنی رکھتا ہے۔”

سر اٹھا کر اس کے معصوم چہرے کو دیکھا تو دل اپنے خیال کی نفی کرنے لگا۔ سو میں نے “دیکھیں گے” کہہ کر بات ختم کر دی پھر جن دنوں وہ میری شبہ پا کر، میری نرمی پا کر اپنے عمید لالہ کی باتیں کیے جاتی تھی بالکل انہی دنوں الماری میں ضروری فائلیں کھنگالتے ہوئے میرے ہاتھ ایک ڈائری لگ گئی۔ سرخ مخملیں ڈائری اور یہ قطعاً غیر اخلاقی حرکت تھی مگر میں نے پھر بھی وہ ڈائری کھول لی۔ این ایس خان کی شاعری جا بجا بکھری پڑی تھی۔ نظمیں اور اصلاح پذیر غزلیں کچھ غزلیں تو اس قدر پرفیکٹ لگتی تھیں کہ بس لفظ دائیں سے بائیں کر دینے سے نکھر سکتی تھیں اور تب میرے اندر کا شاعر شخص جسے میں نے بہت عرصہ پیشتر اماں کی نفی پر سلا دیا تھا۔ یکدم آنکھیں مل کر جاگ گیا۔ میں بہت روشن دماغ انسان تھا، خود بھی کتابیں پڑھنے والا انسان تھا مگر میں محض اس لڑکی کو ستانے کے لیے بڑا ہی بے ادب بنا پھرتا تھا لیکن یہ شاعری، اس کا محور کون ہو سکتا تھا؟ میں نے نہیں چاہا تھا ایسا سوچوں مگر اماں نہ ہوتے ہوئے بھی اس لمحے میرے اندر گونجیں۔

“یہ لڑکیوں کا مجھے افسانے لکھنا پسند نہیں۔ تو اسے منع کیوں نہیں کرتا۔ کیا بالکل غلام ہو گیا ہے بیوی کا۔” اور میں اماں کو دھیمے سے انداز میں منع کر دیتا۔

“کچھ بھی سہی اماں! وہ سب کام نمٹا کر گھر کو ڈسٹرب کیے بغیر اگر لکھتی ہے تو کوئی حرج نہیں اس میں۔”

“تجھے سمجھ نہیں ہے جمیل! بیویوں کو اتنا سر نہ چڑھانا چاہیے۔ تجھے پتا ہے اس کی تنخواہ بھی آتی ہے۔” “وہ اعزازیہ ہوتا ہے اماں! اگر وہ اپنی ضروریات زیادہ احسن طور پر پوری کر لیتی ہے تو کیا برا ہے۔”

میں جلتے پر آگ لگائے جانے پر بھی بھڑک کر بلاسٹ نہ ہوتا تو اماں منہ بنانے لگتیں، لیکن اسوقت اماں اپنے بستر پر محو خواب تھیں مگر میرے اندر بولے جا رہی تھیں۔

“لڑکیوں کے لکھنے لکھانے سے مجھے چڑ ہے جمیل! یہ بڑی کمزور چیز ہوتی ہے۔ تو دھیان رکھا کر اپنی بیوی کا۔” میں مڑ کر بیڈ پر آ بیٹھا۔ الماری یونہی کھلی ہوئی تھی کہ اچانک وہ کمرے میں داخل ہوئی۔

“اُف جمیل! یہ الماری کیوں کھول رکھی ہے۔ کچھ ڈھونڈ رہے تھے کیا؟” وہ الماری بند کر کے مڑی اور وہیں ساکت ہو گئی۔

“کون تھا، ؟” میں نے ڈائری جھٹکے سے بند کر کے غصے سے اسے دیکھا تو وہ ہکلا گئی۔

“میری فرینڈ تھی ایک!”

“فرینڈ یہ آج کل تمہاری صنف کی بہت بری عادت ہے۔ یہ فرینڈ کیا ہوتا ہے کیا لغوی معنی ہیں اس کے۔

دوست ہیں ناں کون تھا وہ دوست؟''

''دوست نہیں۔ میری سہیلی تھی وہ۔''

''ہاں آ سہیلی۔ اس کے لیے اس قدر طوفانی اور عشقیہ شاعری؟ کیا واقعی کسی سہیلی کے لیے ایسی شاعری کی جاسکتی ہے۔'' میں سخت گیر ممتحن کی طرح اس سے جواب طلب کر رہا تھا اور وہ سہمی کھڑی تھی کسی بچے کی طرح۔

''بتاؤ کون تھا وہ؟ کون کزن، کوئی راہ میں ملنے والا خوشبو بھرا جھونکا یا محلے کا کوئی حسین خواب۔''

میں نے تلخی سے پوچھنا چاہا مگر لفظ پھر بھی حد ادب سے گریز نہ کرسکے پتا نہیں کیوں؟ اور وہ روئے جا رہی تھی وہیں الماری سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ پتا نہیں بیٹھی کہ تھک کر گر گئی مگر میں تنا کھڑا رہا۔

''تمہارے آنسو مجھ پر قطعاً اثر نہیں کر رہے بتاؤ کس کے لیے ہے یہ سب؟''

میں نے ڈائری بیچ سے کھولی اور اس کی ایک نظم جارحانہ انداز میں پڑھی

آئینہ آج کل رقیب ہو گیا ہے

جب سے جانم

میری آنکھوں میں تم آ بسے ہو۔

مجھ کو مجھ سے تم کر گئے ہو۔

وہ کچھ کہے بغیر مجھے دیکھے گئی اور میں اس کی خاموشی سے بپھر گیا، ہوتا ہے ناں جب آپ کو پتا ہو آپ کسی چیز کے مالک کل ہیں تو آپ میں خود بخود حاکمیت سر اٹھاتی ہے۔ یہاں تو معمولی سی کرسی پر بیٹھنے والا کلرک تک عام انسانوں کے لیے بابو صاحب بن جاتا ہے تو پھر میں کیسے اس خناس سے بچ سکتا تھا میں جو اس کا مجازی خدا تھا اور وہ کسی باندی کی طرح میرے سامنے سرنگوں تھی۔ عادتاً فطرتاً یا شاید مردتاً۔

''بولو، تم بولتی کیوں نہیں ہو نا دینہ کون تھا وہ

''کوئی نہیں تھا بائی گاڈ! وہ میری سہیلی تھی۔''

''بکواس کرتی ہو۔'' الٹے ہاتھ کا تھپڑ بھی جڑ دیا تو وہ بلک بلک رونے کے بجائے ساکت ہو گئی جارحانہ انداز میں اٹھی میں سمجھا وہ بدتمیزی کرنے والی ہے مگر اس نے میرے سامنے ایک خطوط کا پلندا اور ایک البم لا پٹخا۔

''یہ ہے وہ لڑکی، یہ ہیں اس کے خطوط، دراصل ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے شاعری کیا کرتے تھے بعض دفعہ محض شرارتاً ہم ایک دوسرے کی غلطیاں خود درست کیا کرتے۔ خود ہی سمجھ کے ردیف قافیہ ٹھیک بٹھایا کرتے تھے مشہور شاعروں کی غزلوں اور نظموں پر بریکٹ میں اپنے کا کمنٹ دیا کرتے تھے۔ اپنی نظموں کے عنوان ایک دوسرے سے رکھنے کی ریکوسٹ کرتے تھے۔ بائی گاڈ یہ سب میں نے اس کے لیے لکھا تھا۔''

''مگر مردانہ اسٹائل ہی میں کیوں؟ تم کیا چھپانا چاہتی تھیں اس طرح؟''

''بات محض شرارتاً شروع ہوئی تھی۔ میں اپنی فرینڈ کو این ایس فاروقی کے نام سے غزلیں بھیجا کرتی تھی محض یہ دیکھنے کے لیے کہ معروف شعراء کے ساتھ لکھی اس نظم یا غزل کو وہ کتنے مارکس دیتی ہے۔ ہم ٹاپ ٹین کیا کرتے تھے۔ مقابلے بازی میں ایک دوسرے سے اچھی سے اچھی چوائس پیش کرنے کے لیے پھر یوں ہوا میں نے اسی اسٹائل کو

اپنا لیا۔ مجھے ڈر لگتا تھا زمانے سے، وقت سے کون مانتا کہ یہ سب میں نے محض اپنی سہیلی کے لیے لکھا ہے، سب اس ہجر وصال میں کسی مرد ہی کو تلاشتے یہ جانے بغیر کہ طوفانی محبت کے لیے تو صرف جذبہ محبت کا ہونا ضروری ہے۔ وہ کسی سے بھی کی جا سکتی ہے خود سے۔ اپنی کسی دوست سے اور شاید ایکس وائی زیڈ سے، کسی سے بھی اور میں جانتی تھی میں یہ ثابت نہیں کر سکتی سو اس شاعری کو ہمیشہ چھپا کر رکھا۔“

وہ کہے گئی اور میں اس کا ایک خط پڑھے گیا۔ کوئی یقین کرنے والی تھی پندرہ صفحوں کا خط اور اس قدر شدید جذبات کہ نام پڑھے بغیر شک سا ہو کہ شاید یہ کسی مرد کی ہی جذباتیت ہے۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا

”کہاں رہتی ہے یہ لڑکی؟ کسی دن بلواؤ، میں بھی تو دیکھوں اس مشینی دور میں کون ہے ایسا لیلیٰ مجنوں۔“ انداز سرسری سا کرنا پڑا تھا مگر لہجے کی چبھن اب بھی قائم تھی اور وہ میرے سامنے پھر سے گومگو کی کیفیت میں جمی بیٹھی تھی۔

پھر رک کر ہکلا کر بولی۔ ”وہ جمیل! دراصل بات یہ ہے کہ یہ والی سہیلی مجھ سے ناراض ہو گئی ہے۔ وہ نعمان ہے ناں، ایک بار اسلام آباد گیا تھا تو بس عادتاً کچھ ہنگامہ مچا آیا تھا۔ تب سے۔ تب سے اس کا مجھ سے رابطہ ٹوٹا ہوا ہے۔ دو برس ہو گئے۔“ اس نے سانس اس طرح کھینچی جیسے دو صدیوں کی تھکن طاری ہو گئی ہو۔

اور یہ سب کچھ اتنا مشکوک تھا کہ میں جو سنبھالا لینے لگا تھا پھر سے تپ گیا۔ میں نے خطوط اور البم اس کی سمت اچھالے اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ ٹیرس پہ آ کر لمبے لمبے سانس کھینچے مگر اندر کی گھٹن کم نہ ہوئی میں لونگ روم میں صوفے پر جا لیٹا۔ صبح آنکھ کھلی تو میں اپنے بستر پر لیٹا تھا۔ کمرے کے پردے ابھی تک برابر تھے۔ صبح کے نو بج رہے تھے اور آج حقیقتاً مجھے دفتر سے دیر ہو چکی تھی۔

”چائے“ وہ لان کے ہلکے رنگ کے سوٹ میں کپ تھامے سامنے آ کھڑی ہوئی تو میں نے منہ پھیر لیا۔

”مجھے نہیں پینی تمہارے ہاتھ کی چائے۔“ تولیہ لے کر میں شاور لینے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا اور حسب توقع اپنے ڈریس کو ہینگر کے پایا وسیع و عریض باتھ روم میں ہر چیز سلیقے سے رکھی گئی تھی۔ اس قدر خیال کیوں رکھتی ہے یہ لڑکی! میں نے غصے سے سوچا۔ مجھے اس کی توجہ سے بھی خار چڑھ گئی تھی کہ غصے میں تو اچھی چیز بھی بری لگتی ہے اور اس کی بدنصیبی یہ تھی کہ وہ مجھے پہلے ہی بری لگتی تھی۔ سو غصے میں وہ مجھے زہر لگنے لگی تھی۔ میں شاور لے کر باہر نکلا تو خوانخواہ اپنی بکھری چیزیں درست کرتا دیکھ کر اس پر چڑھ دوڑا۔

یہ سب کر کے آخر تم ثابت کیا کرنا چاہتی ہو، یہ اکیسویں صدی ہے نادیہ حسن! اس صدی میں پتی ورتا پن دینا بے معنی سا لگتا ہے۔“ میں تھا وہ کچھ کہہ بھی نہ پائی جواباً کہ میں نے پھر سے ہنکارا بھرا۔

”جب میں لونگ روم میں سویا تھا تو تم مجھے بیڈ روم میں کیوں لائی تھیں؟“ غصہ سارا اپنی بے ہوش نیند کا ماتا تھا کہ معمولی سا بھی نیند میں خلل نہ پڑا اور وہ بھی میری سوچوں کے برخلاف آہستگی سے بولی۔

”آپ بہت بے آرام لیٹے تھے پھر اماں اس طرح آپکو سوتا دیکھ لیتیں تو قیامت کھڑی کر دیتیں۔“

”قیامت؟ قیامت ضرور کھڑی ہو گی مگر ابھی نہیں۔“ میں نے کف بند کیے ٹائی کی ناٹ درست کی۔ بریف کیس لیے باہر نکل گیا وہ پیچھے سے پکارتی رہی۔

''جمیل! ناشتہ کر لیجیے۔ نہار منہ گھر سے نہیں نکلتے۔'' مگر میں نے کچھ نہ سنا دوپہر کو کھانے پر لوٹا تو حسب توقع اماں نے میرے سامنے اس کی خوب خبر لے ڈالی تھی اور وہ۔

''میں نے امی کہا تھا۔''

''بات یہ ہے امی۔''

جیسے ادھورے جملے کہہ کر وہ اماں کی طوفان میل کے سامنے کٹ کٹ گئی۔ آنکھوں میں میرے لیے حد درجہ خفگی تھی مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ سویرے سے لنچ کر کے رہا پھر رات گئے لوٹا تو اسے ٹی وی آن کیے نہایت مگن بیٹھے دیکھا۔

''کھانا لاؤ نادیہ۔'' میں نے تھکن سے چور آواز میں پکارا کوٹ صوفے پر پھینکا مگر اس نے ذرا بھی متوجہ ہونے کی کوشش نہیں کی۔

''اس قدر محویت۔'' میں نے ترخ کے پوچھا اور اس کی بدقسمتی کہ اسی وقت اسکرین پر اسٹائل سے کھڑے شخص نے رخصت چاہی۔

''بشرط زندگی اگلے ہفتے پھر ملاقات ہوگی اپنے، کمپیئر اپنے میزبان عیسیٰ عمید کو اجازت دیں۔''

''عیسیٰ عمید'' جھماکا سا ہوا۔

''میں عمید بھائی کو ڈنر دینا چاہتی ہوں۔'' اک خواہش اس جھماکے میں شک کی طرح بپھری لہر بن کر ابھری اور وہ خوف سے زرد پڑ گئی میرے چہرے کی خشمگیں اس کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی، وہ پہلی ہی بابت میرا دل نہیں صاف کر پائی تھی اور ایک نئی صورت حال سامنے تھی وہ ہونق تھی ورنہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ سامنے عیسیٰ عمید کا ایک گانا پروگرام کے اختتام پر چل رہا تھا مگر وہ اسے چھوڑ کر مجھے تک رہی تھی، وہ اتنی زرد ہو رہی تھی کہ مجھے لگا وہ ابھی بے ہوش ہو کر گر پڑے گی۔ سو میں نے توجہ اس کی طرف سے ہٹا لی۔ نجانے یہ دھڑکا مجھے اپنی اصل کیفیات چھپانے پر کیوں مجبور کیے دے رہا تھا۔

دل نے کہا ''کیا مجھے اس سے محبت ہوگئی ہے؟''

تو دماغ نے نفی کر دی۔ ''محض انسیت، محض انسیت۔''

اور میں کپڑے بدلنے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا، دوسرے دن جاگا تو وہ پہلے کے سے انداز میں کام میں لگی ہوئی تھی آج اتوار تھا اس لیے موقع ملتے ہی میں نے پوچھا۔

''عیسیٰ عمید کو کب سے جانتی ہو؟'' بظاہر یہ ایک سوال تھا لیکن درحقیقت اس میں الزام چھپا تھا جو اس کو پارہ پارہ کیے دے رہا تھا مگر مجھے اس سے کیا، اس نے میرے دل کی کب رکھی تھی جو میں اس کے من کی کرتا۔

''پھوٹو جلدی سے۔ کب سے جانتی ہو عیسیٰ عمید کو۔'' میں سامنے جا کھڑا ہوا تو وہ رونے لگی۔

''کبھی سے نہیں۔ عمید لالہ تو بس یونہی میرا تخیل تھے۔ میری قسمت کہ وہ درحقیقت بھی مجھے مل گئے۔''

''جھوٹ بکتی ہو تم اتنے ہجر و وصال سے بھری شاعری تمہارے افسانوں میں محبتوں کی اس قدر باریک بینی بنا محبت کیے کیسے ممکن تھی۔ تم تم نادیہ!''

''نہیں پلیز ایسا مت کہیں۔ وہ میرے لیے صرف بھائی ہیں۔ میں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں۔''

درمیان ہی سے اس نے مجھے ٹوک دیا مگر میرے اندر اطمینان نہیں اترا۔

"ایک جذبوں سے بھری لڑکی بنا محبت کے رہے۔ ناممکن ہے کبھی تو پسند کیا ہوگا کسی کو۔ کسی نے تمہیں بولو۔"

"جھوٹ ہے یہ میں نے ہمیشہ اپنی ساری محبتیں اس شخص کے لیے رکھی تھیں جو حقیقتاً میرا کیا جاتا۔ میں شادی سے پہلے کی محبتوں کو بددیانتی سمجھتی تھی بائی گاڈ جمیل! پائیدار محبتیں صرف ہم سفر سے کی جا سکتی ہیں۔"

"مگر محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔ کیا تمہیں واقعی کبھی کوئی چاہنے کے قابل لگا یا کسی نے تمہیں خود نہیں چاہا۔" میں نے خاصا تمسخرانہ دیکھا اور جتایا۔ بھلا اس موٹے نین نقش اور موٹے سے قد کی گہرے سانولے رنگ کی لڑکی کو کون چاہ سکتا ہے اور وہ واقعی ہار کر جھک گئی، پھر سسک کر بولی: "آپ نے ٹھیک سمجھا، میں اس قابل تھی ہی نہیں کہ کوئی میری طرف بڑھتا۔"

پھر سر اٹھا کر عزم سے بولی۔

"لیکن اگر ایسا ہوتا، میں تب بھی اس کے قدم وہیں روک دینے پر قادر تھی۔ کیونکہ مجھے خالی ذہن بن کر جینے سے چڑ تھی۔ میں اپنے سارے جذبات صرف اپنی شریک سفر کے لیے ہی رکھتی تھی اور رہی اچھا لگنے کی بات تو کئی چہرے اچھے لگتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم ہر چہرے کے عشق میں مبتلا ہو جائیں محبت نفس کی پاکیزگی کا نام ہے۔ جمیل اور نفس کا اعتبار اسے سدا آنچ پر رکھنے پر ہے نہ کہ قدموں کی دھول بنا دینے میں۔"

"یہ لفظوں کا جادو ہے محض جادو۔ مجھ پر نہیں چلے گا۔" میں نے جان کر اسے رد کر دیا۔

اماں نے یہ انداز ناشتے پر دیکھا تو بہت مسرور ہو کر میری بلائیں لے ڈالیں اور میں نے اسے جاننے کو زیادہ ہی اماں کو کمپنی دے ڈالی۔ وہ کام ختم کر کے کپڑے دھونے کے لیے تھرڈ فلور پر چلی گئی تھی میں نیچے بیٹھا رہا دل گھبرا گیا تو بابا کے کمرے میں چلا آیا۔

بابا کی کتابوں کو چھو چھو کر ان کا احساس کرتا رہا پھر بس اچانک ان کی رائٹنگ ٹیبل کی دراز سے بابا کی ڈائری ہاتھ لگ گئی۔ کچھ حسابات تھے اور صفحے دن بھر کی مصروفیات سے بھرے پڑے تھے۔ بابا کی لکھائی بہت ہی خوبصورت تھی جیسے موتی پروئے گئے ہوں۔ میں محو تھا کہ بس اچانک ان موتیوں کی مالا میں ایک دکھ کہیں سے شامل ہو گیا انگارہ سا دکھ میں نے پلکیں بھینچ بھینچ کر آنسو روک کے پھر پڑھا۔ لکھا تھا۔

بہت پیاری بچی ہے جمیل کی دلہن، ہمہ وقت گھر کو سجانے سنوارنے کا شوق رکھتی ہے۔ پڑھنے لکھنے کا تو اسے جنون ہے۔ اسے دیکھتا ہوں تو اپنا وقت یاد آ جاتا ہے۔ پہلے کبھی مجھے بھی ایسا ہی خفقان تھا۔ پڑھائی کا جو کچھ ہاتھ لگتا جاتا۔ پڑھ ڈالنا مجھ پر فرض تھا۔ مگر بعد کو کھلا یہ میری چھٹی حس تھی جس نے مجھے آنے والے وقت سے آگاہ کر دیا تھا زیادہ سے زیادہ پڑھنے کی ہوک شاید اسی لیے تھی کہ آئندہ مجھے کتابوں ہی سے دور رہنا تھا ایک ہی سہی صفحہ پڑھے بغیر نہیں رہتا تھا۔ اب دنوں کتابوں کو چھوتا نہیں ہوں پتا نہیں یہ کتابوں کا رشتہ ہی اتنا مشکوک ہے یا خود میری ذات مگر دیکھتا ہوں۔ لکھنے پڑھنے والوں کو ہی ہمیشہ باد مخالف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آگہی کا اس سے بڑھ کر اور کیا خراج ہوگا کہ آپ کی ذات، آپ کی محبتیں اور آپ کے لفظ تاابد مشکوک اور بے وزن دکھائی دیتے ہیں لیکن اس اسرار کا راز مجھ پر منکشف ہو کر بھی مجھے پرسکون نہیں کرتا۔ میں اس لڑکی کے لیے دکھی رہتا ہوں جو میری طرح دار پر چڑھائی جا رہی ہے اس کی

آگہی اس کی جزا ہے اس کا مزاج ہے۔ عالیہ میرے ماضی کا بدلہ لینے کے لیے اس لڑکی پر مشق ستم کرتی ہے اس لڑکی کے خال وخد میں آئینہ امین کی ایک جھلک بھی نہیں مگر وہ اس کے نقوش اور بوٹے قد سے آئینہ کا انتقام لے رہی ہے میں نے سدا اس کے سامنے زبان بند رکھی مگر وہ پھر بھی تجیل کے زور طاقت پر ایک مفتوح لڑکی کو غلام بنانے کی آرزو رکھتی ہے یہ جانے بغیر کہ جو دل محبت کے سامنے جھک گیا ہو۔ اس پر حکمرانی کرنے کے لیے طاقت کا نشہ اور زور درکار ہی نہیں ہوتا۔ محض اک مسکراہٹ محبت کی ایک نظر بہت رہتی ہے مگر تجیل کو یہ کوئی نہیں بتا سکتا، وہ میرا بیٹا ہو کر بھی میرا بیٹا نہیں رہا ہے وہ پورا کا پورا اپنی ماں کو آزردہ نہیں دیکھ سکتا یا ممکن ہے وہ سمجھتا ہو اس کی ماں سے میں نے انصاف نہیں کیا۔ اس لیے میری کوتاہی کے لیے وہ خود کو قدم قدم پر جھکائے چلا جا رہا ہے اور عالیہ جیسے میری خاموشی اور آئینہ امین کی موت پر بین ڈالتے ڈالتے تھک گئی تھی سو خراش زدہ ہے کاش میں اس لڑکی کے لیے کچھ کر سکتا۔ ہاں اس لڑکی کے لیے جو میری بیٹی نہ سہی پھر بھی بیٹیوں سے بڑھ کر لگتی ہے۔“

صفحہ ختم ہو گیا تھا اور میں نم آلود آنکھوں سے بابا کے تجزیے کو دوہرا تھا تو یہ اولین وجہ تھی اس ناپسندیدہ لڑکی کو پسندیدہ بنا کر لانے کی تاکہ میں۔ میں جو بابا کا پرتو تھا۔ اس لڑکی کو قدم قدم پر نظر انداز کرتا نفرتیں کرتا اور اماں اس کے بوٹے سے قد اور عام سے نقش والی لڑکی میں آئینہ امین کے عکس کو بے اثر و باعث نفرین ہوتے دیکھ کر اپنی انا کو تسکین پہنچاتیں۔ وہ جو سمجھتی تھیں۔ آئینہ امین بابا کے دل سے کبھی نہ نکل سکی تھی۔ وہ اسی آئینہ امین کو مجسم کر کے بابا کے دل سے باہر نادینہ کے بہروپ میں سمیت لائی تھیں اور اب اسے گھر میں رہتے ہوئے بھی بے گھری، دربدری کی مار مار رہی تھیں اور میں اس فعل میں ان کے ساتھ تھا بابا نے کتنا گہرا تجزیہ کیا تھا۔ بابا جو سائیکاٹرسٹ نہیں تھے مگر اندر تک اترنے کا فن جانتے تھے۔ کس قدر اصل اور دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ گئے تھے۔ میں ان کا قائل تھا اب معتقد بھی ہو گیا تھا مگر میں ان کی منشا نہیں کر سکتا تھا، یہ میری مجبوری تھی ورنہ اس تجزیے اور بابا کی تمنا پر میں خود کو بدلنے کی اپنی کوشش ضرور کرتا اماں کی اس نفسیاتی جنگ کا اختتام کرتا۔ انہیں قائل کرنے کی ناممکن سعی کرتا اور اس لڑکی کے لیے سازگار ماحول بناتا، ہاں اس لڑکی کے لیے جو مجھے قطعاً پسند نہ تھی نہ میرے ساتھ سوٹ کرتی تھی مگر میں اسے قبول کر کے خوش ہوتا شاید اس کے سرنڈر کرنے کی خو، اس کی نرم خوئی اور ہر لحظہ متوجہ رہنے کی عادت کے باعث مگر اس کی قسمت کی خرابی تھی یا خود اسی کی ذات کی کہ وہ میرے لیے اتنی مشکوک شخصیت ہو چکی تھی کہ میرے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہونا فی الحال ناممکن تھا۔

”سوری بابا!“ میں نے بالآخر سوچتے ہوئے دراز بند کی۔ واپس لوٹا تو اسے ٹیلی فون پر محو گفتگو پایا وہ بہت ہراساں سی پوچھ رہی تھی۔

”کیوں کیا ہوا انہیں؟ کون سے ہاسپٹل میں ہیں اچھا؟“ لمحہ بھر کو رکی پھر تاسف سے بولی۔

”ٹھیک ہے رائنہ! بہت شکریہ تم نے مجھے کال کیا۔“

”نہیں یار! میں کیسے آ سکتی ہوں۔ تجیل کو فرصت کہاں ہے ہاسپٹل جا کر لوٹو تو بتانا ضرور عمید لالہ کی اب طبیعت کیسی ہے، ہوں دعا مانگنی ہے، وہ تو میں کہیں بیٹھ کر بھی مانگ سکتی ہو ٹھیک ہے خدا حافظ۔“

فون رکھنے کی آواز سنائی دی۔ میں اندر داخل ہونا چاہتا تھا کہ اس کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ شاید وہ خود سے مخاطب تھی۔

”عمید لالہ! کیا آپ جان سکیں گے کبھی کہ اس شہر میں ایک لڑکی ہے جو مناجاتوں دعاؤں میں آپ کے لیے ہر وقت خوشیوں اور لمبی عمر کی دعائیں کیا کرتی ہے۔ جس کو آپ سے کچھ طلب نہیں سوائے اس کے کہ وہ آپ کو تا دیر زندہ دیکھنا چاہتی ہے۔ کسی بھی حوالے سے نہ سہی دنیا کے کسی بھی منکشف حوالے سے نہ سہی لیکن عمید لالہ! میرے دل سے کوئی یہ یقین نہیں چھین سکتا کہ آپ میرے بھائی ہیں۔ شاید آپ کو خبر بھی نہ ہو کہ کوئی لڑکی بزعم خود آپ کی بہن بنی بیٹھی ہے اور اسے آپ سے کچھ طلب بھی نہیں۔“

آتے آتے آواز مدھم ہوگئی تو میں اس کے قدموں کی چاپ سن کر برابر کے کمرے میں گھس گیا۔ وہ سیڑھیاں چڑھتی واپس اوپر لوٹ گئی تو میں نے رائمہ کا نمبر انڈکس میں دیکھا۔ پہلی بیل پر ہی فون ریسیو کیا گیا اور اٹھانے والی رائمہ ہی تھی۔ میں نے پہلے تو سلام دعا کی پھر اچانک عیسیٰ عمید کے متعلق پوچھ بیٹھا اور وہ باتونی لڑکی شروع ہوگئی۔

”کوئی خاص پریشانی کی بات نہیں ہے۔ عیسیٰ صاحب بس بہت زیادہ محنت اور تھکن کی وجہ سے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوئے ہیں۔ وہ کچھ دنوں آرام کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے خبر رپورٹ ہوتے ہی اسے کال کر لیا تھا، دراصل وہ بہت پگلی ہے ناں عیسیٰ صاحب کے لیے۔ پاگل لڑکی ہے اس لیے میں نے اسے بتانا ضروری سمجھا۔“ اور اس نے پتا لکھوانے کیساتھ ساتھ مجھے کریدا۔

”کیا آپ وہاں جائیں گے جمیل بھائی؟“ پتہ نہیں اس نے مجھ سے پوچھا تھا یا یہ التجا کی تھی کہ مجھے وہاں ضرور جانا چاہیے تاکہ نادینہ حسن کی تسلی ہو سکے اور میں نے بڑے آرام سے نادینہ کی اس خواہش کو رد کر دیا تھا۔

فون رکھ کر میں پلٹ کر باہر لان میں کین کی کرسی پر آ بیٹھا۔ مسلسل میرا دماغ مصروف عمل تھا پھر ایک فیصلہ کر ہی لیا تو میں نے شام گئے تھکی ہاری نادینہ حسن کو تیار ہونے کا حکم دیا۔

”کہاں جائیں گے؟“ پوچھنے میں بھی اتنی تھکن تھی کہ میرے اندر دل کو کچھ ہوا مگر میں ہٹلر ثانی کے روپ میں تنا کھڑا رہا۔ اس نے معمولی سی بھی نرمی نہ دیکھی تو بجھے دل سے ڈریسنگ روم میں کپڑے بدلنے چلی گئی۔

واپس لوٹی تو گرے اور ریڈ کنٹراس کے کاٹن سوٹ میں بہت حد تک اچھی لگ رہی تھی مگر آنکھوں کی تھکن ہلکے پھلکے میک اپ میں بھی چھپانے میں ناکام رہی تھی۔ میں اسے دیکھ رہا تھا پتا نہیں اسے کبھی کبھی دیکھتے رہنے کو دل کیوں چاہتا تھا حالانکہ وہ میرے کسی خواب کی تعبیر نہیں تھی مگر میں اسے پھر بھی دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے پر میری طواف کرتی آنکھوں سے شفق تھی کہ انار کی طرح چھوٹی جا رہی تھی اوپر اور اوپر۔

”چلیے ناں۔“ بہت مدھم سا اس نے پکارا تو میں نے محویت کی خجالت مٹانے کو اس پر تنقید کے طور مار باندھ دیے اور وہ جو کام کی تھکن سے نڈھال تھی اور زیادہ ڈھے گئی اور مجھے تسکین سی ہوئی۔ اذیت پسندی میرا مزاج نہیں تھی مگر میں اسی روپ میں ڈھل گیا تھا پھر سارے راستے میں اور وہ خاموش رہے تھے۔ میں نے ہی ایک بکے خریدا تھا۔

”آپ جا کہاں رہے ہیں؟“ حد درجہ خاموشی پر اس نے بالآخر لب ہلائے اور عیسیٰ عمید کے نام پر یوں چونک کر مجھے دیکھا جیسے میرے سینگ نکل آئے ہوں اور میرا جو خیال تھا۔ وہ اس اطلاع پر پاگل ہو جائے گی۔ پہلے سے زیادہ دل گرفتہ دکھائی دینے لگی۔ کتنی دیر تک تو میں اسے دیکھتا رہا، پھر ہولے سے بولا۔

”تمہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی اس اطلاع سے، حالانکہ میرا خیال تھا تم عیسیٰ عمید سے ملنے کی خواہش کے پورا

ہونے پر دیوانی ہو جاؤں گی۔"

اس نے چبھتی نظروں سے مجھے دیکھا پھر گاڑی سے باہر نظریں ٹکا کر بولی۔ "شاید ایسا ہو سکتا تھا لیکن آپ مجھے وہاں میری معصوم تمنا میں تو نہیں لے جا رہے۔"

بظاہر عام سا لہجہ تھا اس کا مگر مجھے لگا جیسے کسی نے زہر میں بجھا ہوا تیر میری طرف چھوڑ دیا ہو۔ بڑی ٹھیس ہوئی تھی اس لہجے وہ آنکھیں بند کیے پشت سیٹ سے لگائے جادی بیٹھی رہی۔ پتا نہیں میں اس سے بات کرتے یہ کیوں بھول جاتا تھا کہ وہ ایک افسانہ نگار تھی۔ ایسی کتنی ہی بری صورت حال کو محض اس نے اپنے قلم سے سنوارا تھا۔ وہ لفظوں کے اندر اتر کر ان سے محبت اور نفرت کشید کرنا خوب جانتی تھی۔ پتا نہیں میں یہ کیوں بھول جاتا تھا اور وہ ہر بات یاد رکھتی تھی۔ تب ہی اس کی پلکوں تلے آنسو جم گئے جیسے دل سے آہ نکلے اور وقت کی بے مہری پر ٹھٹھک کر وہیں جم جائے نہ کسی کی سماعتوں، دلوں پر اثر کرے اور یہ لڑکی جو دلوں پر اثر کر سکتی تھی۔ اس لمحے مجھے بہت قابل رحم لگی لیکن بس اس ایک لمحے اس کے بعد میں نے اس طرف نگاہ موڑ لی اور خود کو حق بجانب سمجھا کہ اگر میں نے یہ جاننا چاہا کہ اچانک عیسیٰ عمید کے سامنے اسے لے جا کر یہ جانوں کہ ان کے درمیان شناسائی کس حد تک اور کتنی گہری ہے۔ میں انا پسند مرد بنا سامنے کھڑا تھا اس کے بالکل سامنے اور وہ بکے تھامے دروازے پر کھڑی تھی ڈاکٹرز نے ڈونٹ ڈسٹرب کا ٹیگ لگا رکھا تھا مگر میں نے دے دلا کر اندر جانے کی اجازت حاصل کر ہی لی۔ وہ اندر داخل ہوئی۔

"کون ہے؟" غصیلے لہجے میں عیسیٰ عمید پکارا اور میں اس کے لہجے کی کھنک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا میرا خیال تھا وہ اس سوال کے بعد نادینہ کو دیکھے گا تو خوش اخلاقی کا شاہکار بن جائے گا مگر اس کے تیور ہنوز بگڑے ہی رہے تو میں نے نادینہ کے شانے پر زور ڈالا اور وہ کسی روبوٹ کی طرح پکاری۔

"میں نادینہ حسن ہوں عمید لالہ، آپ کی بہن۔"

"واٹ! یہ کیا فضولیات ہے۔" اس نے بٹن دبایا۔

وارڈ بوائے تیزی سے اندر داخل ہوا اور اس نے چلا کر کہا۔

"واٹ نان سینس! کیا میں یہاں ان ہی فضولیات کے لیے آیا ہوں، میں آرام چاہتا ہوں مسٹر! آرام اور تم صبح سے یہ تیسرا وزیٹر بھیج چکے ہو اخباری رپورٹرزوں کے مگر یہ کون ہے اسے کیوں آنے دیا؟"

"سر! انہوں نے کہا تھا۔ یہ آپ کی بہن ہیں۔" وارڈ بوائے رشوت کی رقم ہضم کر کے مسکینیت سے بولا تو عیسیٰ عمید کا لہجہ پہلے سے زیادہ تلخ ہو گیا پھر بولے۔

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے، میری صرف تین بہنیں ہیں جو مختلف ممالک میں اپنے بچوں اور شوہروں کے ساتھ قیام پذیر ہیں، ان محترمہ سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ پلیز مجھے سکون سے آرام کرنے دیں اور آئندہ ہر ایرے غیرے کو میرے کمرے کا نمبر بھی مت دیں ورنہ میں آپ کے ایم ایس کی گوشمالی کر سکتا ہوں۔"

جھٹکے سے انہوں نے رسالہ کھول لیا اور نادینہ حسن بکے تھامے کھڑی رہی۔

"چلیے سر!" وارڈ بوائے نے اس کے استقامت سے کھڑے رہنے پر چونکایا اسے اور میں اس کی طرف دیکھے گیا لیکن وہ کسی کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

"یہ! یہ پھول لے لیں عمید لالہ۔" بے طرح مسکینی۔ سائلوں والی صدا تھی اس کی اور دل میں بے اختیار ہی اس کی تذلیل کا احساس جاگا تھا۔

"چلتی ہوں!" وہ مڑ کر کہتی پھر سے عیسیٰ عمید سے مخاطب ہوئی۔

"عمید لالہ! یہ پھول لگا دوں یہاں۔" اس نے گلدان کے قریب پہنچ کرتے ہوئے انداز سے پوچھا۔

"لگا دیجیے لیکن مجھے گلاب کے پھول پسند نہیں۔"

"لیکن گلاب کے پھول تو ہر کسی کو اچھے لگتے ہیں۔" وہ مہارت سے ریپر الگ کر کے پھول سیٹ کرتے ہوئے نہایت بے تکلفی سے بولی اور عیسیٰ عمید اتنی ہے بے رخی سے گویا ہوئے۔

"ہو سکتا ہے ایسا ہو لیکن مجھے ہر عام کام کرنے سے چڑ ہے میری زندگی کا ایک الگ راستہ اور طریقہ ہے اور اس پر میں نے آج تک سمجھوتا نہیں کیا انڈر اسٹینڈ۔"

"نازینہ! گھر چلو بہت ہو گئی۔" میں دیکھ چکا تھا کہ وہ کام سے فارغ ہو چکی ہے۔ سو اس کی مزید تذلیل ہونے سے پیشتر میں نے چاہا، وہ اس کمرے سے نکل چلے اور اس نے میری سنی بھی مگر مجھے گمان ہوا۔ اس کی آنکھوں میں بیزائی سے زیادہ آنسو بھرے ہوئے تھے ہونٹوں پر تنفر تھا پتا نہیں عیسیٰ عمید کے لیے میرے لیے یا خود اپنے لیے۔

بہر حال وہ چپ چاپ گاڑی میں آ بیٹھی اور میں نے اپنی تسلی کے تحت یا اس پر اعتبار لوٹنے کے حوالے سے بے تکلف ہو کر کہا۔

"تو یہ تھے تمہارے عیسیٰ عمید۔ عمید لالہ جن کا تذکرہ دن رات تمہارے لبوں پر ہوتا تھا۔ ہاں یہی ہیں عمید لالہ جن کا تذکرہ آج بھی میرے لبوں پر رہے گا۔"

"کیا بکواس ہے، اس قدر بداخلاقی پر بھی یہ شخص کیا یاد رکھے، چاہے جانے کے قابل ہے۔"

"پتا نہیں لیکن محبت میں صرف اپنے دل کے حوالے سے کیا کرتی ہوں۔ مخاطب کے افعال اور کردار کے حوالے سے نہیں بقول آپ کے محبت تو بس ہو جاتی ہے کی نہیں جاتی۔"

"لیکن تم تو کہتی تھیں تمہیں یہ اختیار حاصل ہے۔ ایسی محبت کو ٹھکرا دو پھر وہ شخص، کسی بھی طرح اس اعزاز کے قابل نہیں۔" میں جان گیا تھا وہ مجھ پر کھلا طنز کر رہی تھی مجھے جتا رہی تھی کہ اگر وہ شخص اس قابل نہیں تو تم بھی تو مختلف نہیں تھے مگر مجھے دیکھو، میں تمہیں بھی تو چاہتی ہوں۔" مجھے اس ریمارکس پر چراغ پا ہو جانا چاہیے تھا مگر اس کی سرد سی خاموشی کے آگے آج میں مکمل طور پر ہار چکا تھا اور وہ آج میری طرف سے بالکل بے پروا بنی بیٹھی تھی۔

"میں نے تم سے کچھ کہا تھا۔" میں نے جان کر اسے ٹہوکا دیا اور اس نے کھڑکی سے باہر مرکوز نظروں کو میرے چہرے پر گاڑ دیا اور نظریں کس قدر ظالم نظریں تھیں۔

"یوں کیوں دیکھ رہی ہو۔"

"کچھ نہیں۔ آپ کے لفظوں اور اپنے مان کا وزن کر رہی تھی۔ اپنے اختیار کو بے اختیار ہوتا دیکھ رہی تھی۔ محبت! وہ جو عزم سے ٹھکرانے کے دعوے کرتی تھی۔ اس محبت کے سامنے ہتھیار ڈالے بے نیل و مرام خود کو کھڑے دیکھ کر خود پر ہی طنز سے ہنس رہی تھی۔ آپ کو میری ہنسی کی آواز نہیں آئی۔" اس نے قہقہہ لگایا پھر دھاروں دھار رونے لگی

میں نے گاڑی ایک کنارے کھڑی کر دی۔ اسے چپ کرانے لگا۔ مگر وہ چپ ہونے کے بجائے گم صم ہو گئی۔

میں نے گھبرا کر اس کے کاندھے پر پہلی مرتبہ استحقاق سے ہاتھ رکھا۔ ”نادی پلیز حقیقتوں کا مقابلہ کرنا سیکھو، دنیا میں یہی سب کچھ ہوتا ہے ہوتا رہے گا۔ اس قدر حساس رہو گی تو زندگی کیسے گزرے گی۔“

”زندگی! احساس۔“ اس نے زمانے بھر کی حسرت بھر کر مجھے دیکھا پھر جیسے خود سے مخاطب ہوئی۔ ”نادیہ حسن! کبھی تمہیں خود پر کتنا گمان تھا کہ تمہارے ہتھیار تمہاری محبت ہے، تمہاری طاقت تمہارے اندر تک تھا تمہیں ازلی محبت ہے مگر نشہ اترا ہے خوابوں کا تو کھلا ہے محبت! محبت تو اس دنیا میں کسی بشر کی ضرورت اور مجبوری نہیں۔ لوگوں کو حاجت ہے اعلیٰ اسٹیٹس کی۔ اونچی سوسائٹی میں موو کرنے کے لیے کمزور سہاروں کی۔ بہت ڈھیر ساری دولت کی، جہاں رشتے بھی محض آگے بڑھنے سیڑھیاں بننے کے لیے بنائے اور توڑے جاتے ہیں۔ جہاں لفظوں کتابوں اور محبت کی باتوں کو خلل دماغی سے زیادہ کچھ نہیں سمجھا جاتا اور تم...... تم اس دنیا میں چلی آئی تھیں اس دنیا کے ریشم کو ہاتھ میں لے کر خواب کاڑھنے کی تمنا رکھتی تھیں۔ تم کتنی ناسمجھ تھیں، کس قدر غلط نقطہ پر وقت سے دنیا سے لڑ رہی تھیں۔“

کہتے کہتے رکی پھر سر اٹھا کر مجھے دیکھ کر بولی۔

”جمیل احمر یہ سب سچ سہی لیکن بعض محبتوں میں اختیار استعمال کرنے کو دل نہیں چاہا کرتا۔ بس ہارنے اور ہارتے جانے کی ہوک رہتی ہے جیسے میں نے تمہیں چاہا۔ عمید لالہ ملنے کی دعائیں کیں ان سے ملنے کے بعد نہ ملنے والوں کی طرح کے رویئے پر بھی ان کی طرف سے دل نہیں موڑنا چاہا جیسے میں نے سلمان نعمان اور کبیر بھیا سے محبت کی پاپا اور ماں کے لیے دل کو دھڑکتا پایا۔ لیکن پھر بھی پھر بھی جمیل کیا ملا مجھے! میں آج بھی تہی داماں ہوں اول روز کی طرح۔ کیا واقعی جمیل محبت اتنی بے تاثیر چیز ہے کیا مجھے واقعی اس کی ماہیت سمجھنے میں غلط فہمی رہی۔ سدا لوگ کہتے ہیں قطرہ قطرہ گرتا رہے تو پتھر میں بھی سوراخ ہو سکتا ہے مگر مجھے دیکھو، میں اس محبت کے بوجھ سے پارہ پارہ ہو گئی مگر کسی نے اس کی طلب نہ کی۔“

وہ پھپھک کر رو پڑی اور میں اسے خاموشی سے دیکھتا رہا، میرا خیال تھا میں اسے منا لوں گا۔ میں اسے منا سکتا ہوں مگر گھر آ کر پتا چلا مجھے درحقیقت اپنی صلاحیتوں پر کتنا غلط اعتبار تھا۔ وہ ناراض نہیں تھی مگر سب سے ناراض لگتی تھی، صرف مجھ سے، عیسیٰ عمید سے ہی نہیں دنیا اور زندگی سے بھی۔ احتجاج آج بھی اس نے نہیں کیا تھا مگر مجھے اس کے ارد گرد شور آہ و فغاں محسوس ہو رہا تھا۔

”پلیز نادی! بھول جاؤ وہ سب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہے۔“

”حماقت! نہیں وہ تو آپ کے اختیار، آپ کے مرد ہونے کا خراج تھا جو میں نے دیا، اس میں آپ کا کیا قصور، مرد کی تو ساری کیمسٹری میں شک سارے عناصر سے زیادہ گوندھا گیا ہے مگر پوچھنا چاہتی ہوں، کیا واقعی آپ کو مجھ پر اعتبار آ گیا؟ آپ کے دل نے یقین کیوں کر لیا؟ کیا پتا عمید لالہ! بہت ماہر ایکٹر ہوں یہ بھی تو ہو سکتا ہے، وہ شاعری میں نے کسی اور کے لیے کی ہو۔ کسی ایسے شخص کے لیے جسے کوئی نہ جان سکتا ہو۔“

وہ مدھم سا کہہ رہی تھی مگر بڑے ڈھنگ انداز میں مجھ پر چھائے چلی جا رہی تھی اور مجھے اس کے اس انداز پر غصہ بھی نہیں آ رہا تھا۔ وہ پہلے دن سے میرے تعلق میں سچی تھی لیکن پہلے میری نفرت نے اور پھر شک نے کبھی مجھے اس

کی آنکھوں میں جھانکنے کا موقع نہیں دیا تھا اور اب میں اس کی آنکھوں کی طرف ہی مرکوز تھا مگر ان آنکھوں میں کوئی خواب نہیں تھا۔ سب کچھ جیسے ختم ہو گیا تھا۔ میں نے اسے اپنی محبت کا یقین دینا چاہا مگر وہ برف کی طرح ٹھنڈی پڑی رہی۔ پھر یہ تیسرا دن تھا، جب اچانک اس نے میری طرف دیکھ کر کہا تھا۔

''کیا ہوتا جمیل! جو آپ عمید لالہ کو واقعی دیکھنے ہاسپٹل گئے ہوتے یا جو آپ کے دل میں تھا۔ وہ آپ کو چھپانا آیا ہوتا یا آپ نے میرے اور عمید لالہ کے متعلق شک نہ کیا ہوتا جمیل عورت سب سہہ سکتی ہے۔ نفرت، طعنے، پتھر مگر اس کے کردار پر ایک شک کا کنکر لگتا ہے ناں تو وہ اندر سے ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ پھر جڑتی نہیں مگر آپ کو اس کا کیا ادراک۔

لمحہ بھر کو رکی پھر بولی۔'' جب آپ نے خاص انداز سے عمید لالہ پر شک کیا اور پھر بالکل اچانک مجھے ان سے ملانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے تو میں نے سارے راستے ایک دعا مانگی تھی کہ کاش۔ کاش آپ ہاسپٹل کے دروازے سے لوٹ آئیں اور میرا بھرم، میرا اعتبار رہ جائے کہ میری آنکھیں، میرا لہجہ اب اس قدر کم مایہ اور جھوٹا نہیں میرے شریک سفر نے میرا اعتبار نہ کیا۔ یا یوں بھی نہ ہوتا تو یوں ہوتا آپ ساری زندگی مجھ کو ناپسند کرتے رہتے نفرت کرتے رہتے مگر اس ایک لمحہ میرا مان رکھ لیتے مگر آپ نے عمید لالہ کے سامنے کھڑا کر کے میری سچائی ان کی آنکھوں، ان کے لہجے سے نہ مانگی ہوتی۔ آپ نے مجھ سے میرا الوژن، میری محبت اور خود اپنا اعتبار چھین لیا۔ جمیل! مجھے کنگال کر دیا۔ آپ جانتے ہیں یہ۔''

وہ یکدم چلا کر بولی۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ آسمان، زمین ایک کر کے روتی رہی۔ روتی رہی پھر یکدم وہ مرجھائے بستر پر گر گئی اور میں جو اس کے بیچ سے چھپنے کے لیے رسالہ لیے بیٹھا تھا تیزی سے اس تک آیا۔

''نادیہ! کیا ہوا؟ تمہیں نادیہ۔''

سمجھ میں نہ آیا تو میں اسے فوراً لے کر ہاسپٹل پہنچا، تب پتا چلا اس کے دماغ کی شریان پھٹ گئی ہے، آپریشن کرنا پڑے گا۔ میں نے اس کے گھر میں اور اپنے گھر میں سب ہی کو مطلع کر دیا مگر میرے دو بھائیوں کے سوا میرے گھر سے کوئی نہ آیا اور اس کا پورا گھر میرے اردگرد تھا۔

''کیا ہوا اسے؟'' سب یہی ایک سوال کر رہے تھے تب میں نے سلمان کو سب کہہ سنایا اور سونیا مجھے، شکوہ بھری نظروں سے دیکھے گئی۔ شکوہ سلمان کی آنکھوں میں بھی تھا مگر اس وقت تاویل تمہید کسی کے لیے کسی کے پاس وقت نہیں تھا۔ سب ہونے والے آپریشن کی کامیابی کی دعا مانگ رہے تھے۔ کئی گھنٹے کا صبر آزما آپریشن تھا جو اختتام پذیر ہوا تو امید اس کے ہوش میں آنے کے خیال سے باندھ دی وقت نے اور میں اسے دیکھے گیا۔

''عمید لالہ کون سے ہاسپٹل میں تھے؟'' یکدم سونیا نے بنا جھجک کے سوال کیا اور میں نے مسمریزم کی کیفیت میں اسے ہاسپٹل کا پتا بتا دیا مگر وہ وہاں سے گھر منتقل ہو چکے تھے کہ ہاسپٹل سے زیادہ گھر میں محفوظ تھے۔ اپنے فینز اور رپورٹرز سے مگر سونیا نے ان کی ایک نہ سنی جو دل چاہا، فون پر کہہ سنایا۔ ان کی روڈنیس، اکھڑ پن پر اور میں سامنے کھڑا شرمندہ ہوتا رہا۔ میں تو عیسیٰ عمید سے زیادہ بڑا مجرم تھا مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ آئیں گے بے طرح مشہور و معروف کمپیئر اور گلوکار تھے لیکن مجھے حیرت ہوئی تھی جب وہ آ گئے تھے۔ ہراساں و پریشان سے اور یوں اس کے ہوش میں آنے کے منتظروں میں ایک مزید فرد کا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ ہر صبح چکر ضرور لگاتے ہیں ہم بے تکلف ہوئے تو میں نے اس

کی بیماری کی اصل بنا پر روشنی ڈالی اور وہ ساکت رہ گئے اور سونیا بھی انہیں چائے دیتے ہوئے وہیں اس کے قریب بچھ کر دو ٹھی ہوگئی پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر رونے لگی تھی تو بولی۔

"پتا نہیں یہ ہم اتنے بے مہر کیوں ہوتے ہیں، محبتوں کو بانٹنے کے بجائے جمع کرتے رہنے پر ہی کیوں مصر رہتے ہیں۔ ایسی محبتوں کا فائدہ جو کسی کو فائدہ نہ دے سکیں۔"

کہتے کہتے عیسیٰ عمید کی طرف مڑی پھر بولی۔ "آپی کے ساتھ جو ہوا اس میں صرف آپ کا کوئی قصور نہیں عمید لالہ! اس میں ہم سب مورد الزام ہیں کبیر بھائی، سلمان اور نومی کہ اگر وہ سب ان کی آئیڈیل محبت تو جدو بنا جانتے تو وہ کا سب کو سراب کے پیچھے بھاگتیں الوزن کا شکار ہوئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم لڑکیوں کی نازک خیالی ان کے دل کی خواہش کوئی جان لینے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔

یہی بے چارگی تو ہے جو لڑکیاں گھر سے باہر توجہ لٹاتی ہیں کسی کے خوش فہم وعدوں اور مکر جانے والی محبت پر سب کچھ ہار جاتی ہیں اور ایسے میں عزت، وفا کچھ بھی ان کی راہ کی دیوار نہیں بنتا کیونکہ وہ جو ایک محبت پانے کی ہوک اور خلا ہے۔ وہ کسی بھلے کسی حوالے سے بھرنا چاہتا ہے۔ آپ! آپ نے کتنی آسانی سے کہہ دیا۔ آپ نادیہ حسن کو نہیں جانتے۔ شاید اس لیے کہ آپ بھی اسی صنف سے تعلق رکھتے تھے جس سے کبیر بھائی سلمان اور نومی یا یہ جمیل بھائی آپ سب جتنے بااختیار ہیں۔ اتنے ہی روز شاید اس لیے کہ محبت صرف آپ کا حق ہے آپ کے لیے ہے۔"

عمید کی طرف سے مڑ کر اس نے مجھے دیکھا پھر آہستگی سے بولی۔

"عورت ساری زندگی اپنے وجود کا جوہر محبت آپ کے قدموں میں نچھاور کرتی رہتی ہے۔ صرف اس ایک آسرے پر کہ اس کے حصے میں محبت، اعتبار اور چٹکی بھر محبت آجائے مگر آپ کے پاس کتنا آسان سا حربہ ہے اس صنف کو توڑنے اور ساری زندگی خود رحمی اور جھکائے رکھنے کا۔ یہ صنف جو ازل سے خود رحمی، بے چارگی کا شکار رہتی ہے اور آپ کا یہ شک، یہ بے مہری مار دیتی ہے۔ کیا آپ یقین کریں گے جمیل بھائی! عمید لالہ ان کی ایک شعوری کوشش اور لاشعوری خواب تھے۔ انہوں نے ساتویں کلاس سے اس خواب کی تمنا کی تھی اگر وہ آپ دھوکا دے رہی تھیں تو کیا انہوں نے اس قدر شروع سے یہ سیٹ اپ بنا رکھا تھا۔"

بیگ سے اس نے ایک بڑا سا لفافہ میری گود میں ڈال دیا اور میں لفافے کھولتا جاتا تھا پڑھتا جاتا۔ عیسیٰ عمید کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی اور وہ نادیہ کا ہاتھ چومتے ہوئے پکاری تھی۔

"انسان کے خواب ہمیشہ سے اس کے لیے "اذیت گاہ" ہوتے ہیں۔ اس کے لیے مستقل تعمیر کرتے ہیں۔ سو ان آنکھوں کی یہی سزا ہونی تھی۔ یہی ہونی چاہیے تھی اذیت بھری نیند کی پھر چاہیں بھی تو کوئی خواب نہ دیکھ سکیں۔"

اور تب سے تین ہفتے گزر چکے ہیں۔ وہ جاگ نہیں رہی۔ اماں کے طور اطوار وہی ہیں کہ وہ کسی ناول کی ساس نہیں کہ بہو کی بیماری سے یکدم اپنی فطرت بدل لیں۔ اپنی فطرت اور ضد پر انہوں نے نجانے کیا کیا قربان کیا ہے پھر یہ تو نادیہ حسن ہے وہ لڑکی جس سے انہیں نفرت ہے سو انہوں نے کبھی نہیں پوچھا، نادیہ کیسی ہے اور میں ہوں ہر ایک سے پوچھتا ہوں۔

"نادیہ کیسی ہے؟ کب ٹھیک ہوگی؟"

"ٹرن ٹرن۔" فون کی بیل پر بے ساختہ میں نے اپنی آنکھیں بند کر کے کھولیں تو ملازم کارڈلیس لیے کھڑا تھا۔

"کیا بات ہے۔"

"ہاسپٹل سے فون ہے۔" نہایت سرسری لہجہ تھا اس کا مگر میرا دم آنکھوں میں کھنچ آیا تھا۔

"کون ہے؟" گھبرا کر میں نے ریسیور تھاما۔

"ہیلو! ہاں عمید! کیا؟ اچھا ہاں۔ میں فوراً آتا ہوں۔" یکدم مجھے لگا۔ میرے بدن میں کسی نے دہکتے انگارے رکھ دیے ہوں۔ اس کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی سو میں گھبرایا سا ہاسپٹل پہنچا، میں ہر بری خبر کے لیے تیار تھا مگر عیسیٰ عمید کا مطمئن انداز دیکھ کر مجھے تسلی ہوئی۔

"کیسی ہے اب وہ؟"

"ٹھیک ہے۔ بس اچانک اس کا بی پی ہائی ہوگیا تھا، اب بہتر ہے۔" میں اندر داخل ہوا۔ ڈاکٹر نے مجھے اور عیسیٰ عمید کو دیکھا پھر تاسف سے بولا۔

"شاید آپ! آپ کو عالم برزخ میں لٹکنے کی عادت ہے ورنہ اس مریضہ میں کچھ نہیں رکھا۔"

"آپ ڈاکٹر ہو کر ایسا کہتے ہیں۔ ڈاکٹر تو آخری سانس تک پرامید رہتے ہیں۔"

"ہاں مگر صرف ان مریضوں کے لیے جو تقدیر کے تحت ایسے حالات کا شکار ہوں۔ آپ نہیں جانتے۔ یہ [illegible] جان کر اپنا دل پاور سرینڈر کر چکی ہیں اور جمیل صاحب! جو لوگ جان کر مرنا چاہتے ہوں، انہیں کون بچا سکتا ہے۔"

عیسیٰ عمید تیزی سے باہر نکل گئے اور میں اس لڑکی کو دیکھنے لگا جسے ضد کرنا پتہ نہیں کس نے سکھا دیا تھا۔

"نادیہ حسن! کیا اتنا امتحان کافی نہیں ہے۔" مگر نادیہ خاموش تھی اور وقت بول رہا تھا۔ بے حساب، بے تکان۔

☆

"شاید ڈاکٹر ٹھیک کہتے ہیں۔ میں واقعی اب ٹھیک ہونا ہی نہیں چاہتی میرے چاروں اطراف دعاؤں حصار ہے اور میں زندگی اور موت کے حد فاصل کے اس طرف خاموش کھڑی ہوں۔ وہ چپکا لگتا تھا کسی کومہ میں گئے مریض کی موت کا سن کر کر اسے پتا بھی نہیں چلا اور وہ دنیا کا سفر ختم بھی کر چکا مگر اب لگتا ہے۔ زندگی کو خیرباد کہہ دینا جینے سے زیادہ ہول انگیز ہے۔ ایک منٹ۔ شاید کسی کے قدموں کی آواز سنائی دے رہی ہے میں خاموش ہو رہی ہوں۔"

وہ کہتے کہتے تھم گئی اور ہاسپٹل کے کمرے کی ایک ایک چیز نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ یہ زبان دنیا کا کوئی انسان نہیں جانتا تھا مگر خاموشی لیے مریض کی زبان وقت، نادیدہ سامعین، تمنائیں بہتر جان سکتی تھیں۔ سو وہ ہمہ وقت اس کی طرف متوجہ رہتیں۔

"ٹھیک۔" دروازہ کھلا سلمان نے اندر جھانکا "میں آجاؤں آپی؟" اور اس نے خفگی سے اسے بند آنکھوں سے سوچا "پہلے کب مجھ سے پوچھ کر کہیں گئے تھے جو آؤ گے۔" اس نے سنا نہیں اور کمرے میں در آیا۔ اس کا ہاتھ تھام کر اپنی یونیورسٹی کی روزانہ کی روداد بتانے لگا تب ہی کمرے میں ڈاکٹرز کا پورا پینل داخل ہوا۔ ان میں سینئر ڈاکٹرز کا [illegible] اسے چیک کرنے لگا اور ہاسپٹل کا پرانا ڈاکٹر اس سے مخاطب ہوا۔

"کیسے ہو آپ؟"

''ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں ڈاکٹر راحت؟'

''جانتے تو ہو پھر بار بار کیوں پوچھتے ہو یار؟''

''شاید اس تمنا میں کہ آپ مکر جانے والے کسی جھوٹ سے میرا دل رکھ لیں۔'' کہتے کہتے وہ رونے لگا تو اچانک اس کی نارمل ہارٹ بیٹ تیز ہو گئی۔

''اٹریکلو۔'' ڈاکٹر مظفر نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سلمان نے ساکت صامت ہو کر دیکھا۔ ''یعنی ڈاکٹر؟''

''یہی کہ اگر یہ چاہیں تو ہوش میں آ سکتی ہیں۔ میرے خیال میں فی الحال ان کے اندر کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا۔ ردعمل دے رہی ہیں تو یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ان کا دماغ آل ریڈی کام کر رہا ہے اور یہ سب باتوں سے آگاہ ہیں۔ شاید آپ کو نہیں پتا۔ کومہ کے مریض آپ کی باتیں سن سکتے ہیں۔ سمجھ سکتے ہیں۔ صرف بول نہیں سکتے بالکل ایسے شخص کی طرح جو گہری نیند میں ہو مگر جس کا شعور، لاشعور پھر بھی اس کے اختیار میں ہو، ہاں، وہ بس فوراً ردعمل نہ دے سک رہا ہو۔

''ایکسلنٹ سر! میں نے ایک یورپ کے تحقیقی مقالے کی تفصیلات پڑھی تھیں جس میں ڈاکٹرز کے پینل نے گزارش کی تھی کہ انہیں یہ حق دیا جائے کہ وہ جن مریضوں کے معاملے میں مایوس ہو چکے ہیں اور ان کے کومے کی مدت پر یا ان کے ٹھیک ہونے پر کامیابی کے امکانات ناکامی سے زیادہ ہیں۔ وہ ان کی تکلیف کو کم کرتے ہوئے انہیں آسان موت دے سکیں۔ بہت زبردست انداز میں اس مقدمے کی کمپین ہوئی موافقت سے زیادہ مخالفین تھے اس مقدمے کے۔ سب کا مشترک یہی خیال تھا کہ جنہیں وہ خدا مارنا نہیں چاہتا۔ ہم انسان کیوں ماریں۔ ان میں ہی ایک ماہر ٹیلی پیتھی تھا۔ اس نے باقاعدہ ایک تجربہ کرنے کا فیصلہ کیا کہ ہم جو صرف آپس میں لڑ رہے ہیں کہ ''ان مریضوں کو آسان موت دی جائے یا زندہ رکھا جائے۔'' کیوں نہ ہم ایسے مریضوں سے پوچھیں کہ وہ خود کیا چاہتے ہیں؟'' سب نے اس تجربے کے حق میں ووٹ دیا۔ تب اس نے ایک بچی کے دماغ سے رابطہ کیا جو سر کی چوٹ کے باعث کوما میں تھی۔ اس نے بچی کو بتایا تخیلاتی ہی کہ یہ سرخ اور سبز بٹن ہیں، وہ ان میں سے کون سا بٹن پریس کرنا چاہے گی یہ پہلے سے طے تھا کہ سرخ بٹن کا مطلب موت اور سبز کا مطلب زندگی ہے۔ سو بچی نے سبز بٹن کی طرف انگلی سے اشارا کیا تھا۔ یوں اس مقدمے کا یہی فیصلہ ہوا تھا کہ جب ایسے مریض خود زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہم محدود اختیار رکھنے والے انسان کیونکر ان کی زندگی ختم کر سکتے ہیں۔''

''لیکن ڈاکٹر رمیز! یہ مریضہ تو خود نہیں جینا چاہتیں پھر اس کا کیس کس قدر خراب ہو چکا ہے۔''

ڈاکٹر رمیز نے ڈرپ چیک کی پھر ڈاکٹر راحت کی طرف مڑ کے بولے۔ ''ڈاکٹر امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا ڈاکٹر راحت! بلکہ اس سے زیادہ خراب حالت کے مریضوں کو میں نے زندگی کی طرف لوٹتے دیکھا ہے جب تک وہ خدا اس مریضہ کو زندہ رکھنا چاہے۔ ہمیں تب تک اپنی ساری صلاحیتیں اس کی زندگی کو بچانے میں لگانی چاہئیں وہ با کامپلیکیٹڈ کیس ہوتا تو اگر انہیں ہوش آ جائے تو بہت سے مسائل کے حل نکالے جا سکتے ہیں یہ سوچا جا سکتا ہے کہ جس رب نے زندگی دی ہے، وہ ان مشکلوں کو بھی آسان کر سکتا ہے۔'' وہ کہتے کہتے تھے اور سلمان خوشی امیدی سے نادیہ حسن کو دیکھنے لگا پھر دو تین دن مزید گزرے تھے جب اچانک تجمل احمر نے اس سے ہراساں ہو کر کہا تھا۔

"نادی اٹھو، اٹھ جاؤ پلیز وہ تمہارے عمید لالہ ہیں ناں وہ! وہ احساس جرم، احساس شکستگی سے بیمار پڑ گئے ہیں۔ کیا تم نہیں چاہوگی کہ وہ ٹھیک ہو جائیں۔" ہارٹ بیٹ پھر سے اوپر نیچے ہوئی یوں جیسے تحریک ہوئی ہو۔ ڈاکٹر رمیز جو ڈاکٹر راحت کی جگہ اس کے نئے اٹینڈنٹ تھے اس تحریک پر ہی پھولے نہیں سمائے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

"جمیل! سمجھو، انتظار کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں۔"

لمحہ بھر کو رکے پھر ساتھ لگائے لگائے باہر لے جا کر بولے۔

"میں نے پوری کیس ہسٹری پڑھ لی ہے ان کی۔ ان کو ہوش میں لانے کی دو صورتیں ہیں ایک انھیں جس بات پر خفگی ہے، وہ دور ہو جائے یا ایسی چیز کے لیے اکسایا جا سکے جو ان کے لیے بہت اہم ہو میں نے بہت سے مریضوں کو دیکھا ہے اپنے بچوں کی محبتوں سے، توجہ سے یا کسی بہت اپنے کے لمس یا آنسو کو محسوس کر کے اچانک جاگ گئے تھے۔

جمیل احمر نے سر ہلایا۔ کچھ نہیں بولا یہاں تک کہ آدھی رات کو اسے ڈاکٹر نے ویٹنگ روم میں اس کے ہوش میں آنے کی اطلاع دی وہ دوڑا ہوا گیا، مگر اسے باہر سے ہی دیکھنے تنبیہہ کی گئی ایمرجنسی میں فوراً ہی اس کے کئی ٹیسٹ کر ڈالے گئے اور خود جمیل احمر تھا فون پر جھکا سب کو اس خوشخبری سے باخبر کر رہا تھا ذرا کی ذرا دیر میں سب جمع ہو گئے تھے۔

عیسیٰ عمید جو بستر پر پڑ گئے تھے وہ بنا کسی کمزوری کے سامنے کھڑے تھے۔

"یعنی آپ کی بیماری بھی فرار تھی۔" اس نے شکوہ کیا تو ڈاکٹر رمیز مسکرائے۔

"مسز جمیل! سو میں سے پچانوے فیصد بیماریاں دماغی فرار سے جذباتی فرار کے تحت ہی تو ہوتی ہیں جن کا اگر تجزیہ کیا جائے۔ مریض پر اس بیماری کی اصل وجہ بیان کی جائے تو شاید اسے حیرت ہو کہ وہ کس قدر معمولی بات پر زندگی تیاگ رہا تھا لیکن یہ صرف ان مریضوں کے لیے جو واقعی ٹھیک ہونا چاہتے ہیں ان کے لیے نہیں جن کے لیے یہ بیماریاں صرف اور صرف ہمدردی توجہ حاصل کرنے کا سبب ہوں یا کسی احساس جرم کو چھپانے خود کو اذیت دینے کا حربہ۔"

جمیل احمر نے خاموشی سے سر ہلایا۔ چار دن بعد پھر ڈاکٹر رمیز اور ڈاکٹر اظفر نے کہا تھا۔

"وہ ذہنی طور پر فی الحال اس ذخیرہ یادداشت کی حامل نہیں رہی ہیں۔ ہمارے اکثر ذہنی حالت دیکھنے پرکھنے کے تجربے میں انہوں نے سو میں سے پچاس نمبر حاصل کیے ہیں آپ کو انہیں نارمل حالت میں لانے میں وقت لگ سکتا ہے۔"

عیسیٰ عمید اور جمیل احمر سمیت گھر کے ہر فرد نے ڈاکٹر کے اس جملے میں چھپی محنت سے گھبرانے کے بجائے آگے بڑھ کر اس مسئلے کو حل کرنے کی سعی کی اور سلمان نے پوچھا۔

"ڈاکٹر رمیز! آپ کہتے تھے، کوما کا مریض سنتا ہے۔ سمجھتا ہے صرف بول نہیں سکتا مگر ایسا کہ چہرے سے کسی بات کا ردعمل نہیں پھوٹتا۔" ڈاکٹر رمیز نے مسکرا کر دیکھا پھر ہنس کر بولے۔

"یہ ایسے ہی ہے سلمان! جیسے آپ سونے لیٹیں تو نیم غنودہ کیفیت میں آتے جاتے گھر والوں کی باتوں کو سماعتوں میں اترتا محسوس کریں لیکن جب جاگیں تو ان میں سے کسی بات میں نہ ربط پیدا کر سکیں گے نہ پوری حرف بہ حرف بات کسی کو بتا سکیں گے۔ نیند خواب کا جنکشن ہوتا ہے سلمان! سو جاگنے پر مٹے مٹے سے خواب جس طرح ہمیں یاد رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح کوما کے مریض کو یاد رہ بھی سکتا ہے اور نہیں بھی یہ تو مریض اور اس کی حالت پر منحصر ہے۔"

سلمان نے سمجھنے کے سے انداز میں سر ہلایا اور وہ سب وقت کے مختلف اوقات میں اس کے سامنے پھرنے

لگے اور وہ انہیں خاموشی سے دیکھتی رہتی۔

☆

”آپ کو کیا لگتا تھا۔ میں نے جو اپنے خواب کی تعبیر عمید لالہ کی شکل میں پائی تھی اسے کھو دیتی نہیں ہرگز نہیں اگر ساری دنیا بھی ختم ہونے کے لیے ہو میں تب بھی عمید لالہ کے متعلق ایسا نہیں سوچ سکتی۔ میری دعا ہے عمید لالہ بہت ڈھیر سارا جئیں بہت ڈھیر سارا۔“

”نادیہ! کیا سوچ رہی ہو بیٹا!“ کبیر بھیا کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے چہرہ پھر سپاٹ کر لیا۔

”کچھ نہیں بھائی۔“

”کچھ نہیں، مجھے لگتا ہے تم ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتی رہتی ہو۔ ادھر دیکھو، میں تمہارے لیے کیا لایا ہو۔ یہ لو ڈھیر ساری شاعری کی کتابیں۔“ اس نے انہیں حسرت سے دیکھا، مانگنے پر کوئی چیز نہ ملے تو بنا مانگے ملنے پر پتا نہیں یہ حسرت کیوں نہیں مٹتی۔

”ایسے مت دیکھا کرو بیٹا! ہنسا بولا کرو۔“ کبیر بھیا سر تھپتھپا کر باہر چلے گئے اور وہ سامنے آئینے کی طرف دیکھ کر پھر سے مخاطب ہوئی۔

”ہاں تو میں نے کہاں بات ادھوری چھوڑی تھی۔“

دل نے کہا۔ ”صرف بات؟ تم تو پوری کی پوری ادھوری لگنے لگی ہو۔“ اس نے خاموشی سے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں اور دماغ نے کہا۔

”تمہیں نہیں پتا، کسی ترسی ہوئی روح کو اچانک سیرابی مل جائے تب بھی اسے یقین آنے میں کس قدر دیر لگتی ہے۔ ایسے جیسے روتے روتے کسی کو یکدم ہنسنے میں وقت ہوتی ہو، سو میں، نادیہ حسن جس نے سدا محبت کے لیے خود کو ترستا پایا ہے آج کل اس قدر بے تحاشا محبتوں کو پا کر حیران پریشان سی کھڑی ہوں، کسی ایسے مسافر کی طرح جو اچانک طلسم کدہ میں پہنچ گیا ہو اور اسے اپنے چھونے سے ہر چیز کھو جانے یا اپنی ہیئت بدل جانے کا ڈر چھونے سے روکے ہوئے ہو۔ کسی ایسے پیاسے کی طرح جو گلاس کی طرف ہاتھ بڑھاتے رک جائے...... اس خیال سے کہ کہیں یہ گلاس کسی اور کے نام کا نہ ہو یا پیاس کی شدت میں یہ گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر چکنا چور نہ ہو جائے اور بس مجھے بھی یہی احساس کھل کر ہنسنے نہیں دیتا۔

”نادیہ سو گئیں کیا۔“ یکدم دروازہ کھلا تو اس نے بند آنکھیں کھول کر دیکھا۔

”جاگ رہی ہو، چلو شاباش کچھ اچھی سی نظمیں سناؤ۔“

”ہاں بھئی نظمیں، یہ چلو امجد سلام امجد کے مجموعے سے۔“ اس نے کتاب بھی منتخب کر لی تو وہ نعمان کو تکنے لگی یہ شخص ہمیشہ سے شاعر اور شاعری سے بھاگا کرتا تھا مگر اب کس قدر بدل گیا تھا یہ۔

”کیا ہمیں اپنی زندگی کا رویہ بدلنے کے لیے ہمیشہ حادثے کی ضرورت ہوتی ہے۔“

اس نے خاموشی سے اس پر نظریں مرکوز کر کے سوچا اور وہ اسے ایک غزل پڑھ کر سنانے لگا۔ پھر اس کی خاموشی سے ہار گیا تو بولنے کا مشورہ دیتا باہر نکل گیا اور اس نے لیٹے لیٹے سوچا۔

شاید یہ کسی پر نہ کھلے گا کہ میں اس قدر خاموش کیوں ہوں۔ میں محض خوف زدہ ہی نہیں ان لمحات کے چھن جانے سے ڈرتی بھی ہوں۔ مجھے لگتا ہے اگر میں ٹھیک ہو گئی مکمل نارمل، تو یہ سب پھر سے پہلے والے مقام پر چلے جائیں گے اور میں پھر سے ایک ایک سائے کے پیچھے محبت کے ایک ایک لمحے کے لیے بھاگتی پھروں گی سوچتی ہوں میں ان لمحات کو زیادہ سے زیادہ محسوس کر سکوں۔

بیٹھے بیٹھے اس نے کھڑکی کا پٹ کھولا، گارڈن میں عیسیٰ عمید اور جمیل احمر کسی بات پر ایک دوسرے سے محو گفتگو تھے دونوں کو باہم دیکھ کر لمحہ بھر کو آشنائی کی چمک اور شفق کی طرح چہرے پر پھیل جانے والے رنگ کو وہ کسی طرح نہیں روک سکی اور عیسیٰ عمید نے اسی ایک لمحے کو زادِ راہ بناتے ہوئے کہا تھا۔

”برف پگھلنے لگی ہے جمیل! اور اس برف کے نیچے دبے ہوئے شگوفے، پھول پھر سے بہار سے دامن بھرنے کو بے قرار ہیں، بس بات تمہاری ذہانت کی ہے کہ تم ان لمحوں کو امر اور لافانی کیسے کر سکتے ہو اس دنیا میں رہتے ہوئے ایک فانی انسان ہو کر۔“

جمیل احمر نے مسکرا کر دیکھا اور اپنے دامن میں چھپائے ہوئے سب سے قیمتی اور انمول ہتھیار کی گرد پونچھی۔

”تمہیں نہیں پتہ عمید دنیا اور انسان جیسی فانی ہستی کے ہوتے ہوئے میں لافانی ہونا، امر ہونا کیسے جانتا ہوں۔ ادھر دیکھو میرے پاس ایک ہتھیار ہے۔ محبت! محبت جو میری طاقت، میری ہستی کا معتبر حوالہ ہے جسے میں نے زمانے کی تیزی اور مادی ضرورتوں میں مبتلا ہو کر محض ایک فالتو چیز سمجھا مگر یہی تو اصل میں میرے ہونے کا یقین ہے رب کی محبت کا یقین میں ہوں۔ اس کی محبت تھی جو اس نے مجھے تخلیق کیا اور حکم دیا اس کے لیے اس کے بندوں سے محبت کروں مگر میں نے جتنا وقت گنوا کر یہ راز پایا لیکن اب یہ راز ہی میری شخصیت کا ڈی کوڈ ہے۔ مجھے کوئی بھی حل کر سکتا ہے ہاں مجھ جیسے انسان کو جو دل رکھتا ہے۔“

عیسیٰ عمید نے یقین سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر عزم اور حوصلہ کی کمک اسے پہنچائی اور برف دھیرے دھیرے واقعی پگھلنے لگی برف کے اندر دبے ہوئے شگوفے، پھول پھر سے بہار سے دامن بھرنے کو بے قرار تھے اور یہاں کون تھا اور یہاں کون تھا جو ان پھولوں سے اپنا دامن نہ بھرنا چاہتا تھا۔

* * *

تم اداس مت ہوا کرو

"تمہیں آج تک کبھی کسی سے نفرت نہیں ہوئی ہے؟" شہباز نے سعد سالک کی طرف دیکھ کر قدرے غصے سے پوچھا اور سعد سالک مزے سے ٹیبل پر رکھے اپنے منے پروجیکٹ پر سرسری کی نظر ثانی کرنے لگا۔

"میں تم سے مخاطب ہوں سعد!" شہباز اس بار تیزی سے اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔

"شاہ! تم غصے میں بہت کیوٹ لگتے ہو۔" اس نے اتنا غیر متوقع جملہ بولا کہ شہباز کا دل چاہا، کرسٹل کا گلدان اس کے سر پہ مار کر اس کا سر اور اس سر میں موجود فلاسفر دماغ کا تیا پانچہ کروا لے۔

"تمہیں آخر کس بات پر غصہ آیا ہے؟" اب کی بار سعد سالک نے پیپر ویٹ کاغذ پر رکھ کر ریوالونگ چیئر پہ جھولتے ہوئے اسے ذرا رسان سے مخاطب کیا اور وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"تمہیں یہ بات مجھ سے معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ مجھے کیا برا لگا ہے، کس بات پر غصہ آیا ہے۔ کہ تم نہیں جانتے، تمہیں کس بات پر غصہ آنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے یہی بتاؤ مجھے کس بات پر غصہ آنا چاہیے۔" وہ بالکل ریلیکس ہو کر پوچھنے لگا۔

"تم نے سمیر کا دوغلا پن دیکھا ہے ناں اس نے تمہیں ڈبل کراس کیا تھا اور اب یہ نئی چال۔"

"ہاں تو پھر......"

"کیا مطلب پھر......" وہ پھر خفا نظر آنے لگا اور سعد سالک نے اس کی خفگی کے پیش نظر اٹھنے ہی میں عافیت محسوس کی۔

شہباز اب صوفے پر جا کر چپ بیٹھ گیا تھا اور یہ اس بات کی علامت تھی کہ اب ہمیں بلاؤ مت ستاؤ مت۔

مگر سعد سالک جانتا تھا اسے چیئر اپ کس طرح کرنا ہے۔ سو اس نے اس کے لیے آئس کریم کا من پسند آرڈر دیا تھا، وہ خود بھی اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اب خیر سگالی کی کوشش میں اس نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا تھا جو حسب توقع جھٹک دیا گیا تھا۔

"دیکھو تم پھر جانتے ہو میں روٹھوں کو مناتا ضرور ہوں اگر نہ مانیں نا تو پھر دوبارہ پلٹ کر نہیں دیکھا کرتا تمہیں پتا ہے میں محبت میں بڑا سنگی ہوں۔" اب کی بار اثر خاطر خواہ ہوا تھا شہباز نے جو نظریں کمرے کی ڈیکوریشن میں اٹکا رکھی تھیں۔ پھسلتے پھسلتے اس کے چہرے تک آن رکی تھیں۔ مگر انداز ابھی بھی یہی تھا مجھے اور مناؤ اتنی جلدی نہیں

مانوں گا۔ سعد سالک کو اس کے انداز پر ہنسی آنے لگی۔

"تم مجھے تم کبھی کبھی پریپ کے اسٹوڈنٹس لگتے ہو ذرا ذرا سی بات پر ناراض ذرا سی بات پر خوش روٹھنا منانا۔ محبت کا انداز تمہاری آنکھیں اور ان کی سادگی۔ مجھے لگتا ہے، تم ابھی تک بڑے نہیں ہوئے ہو۔"

"آخاہ تو کیا آپ بڑے ہو گئے ہیں۔" وہ اپنے بڑے ہونے کے معاملے پر بڑا کانشس تھا، اس لیے فوراً تپ کر جواباً بولا اور سعد سالک کا قہقہہ وہ بہت جان دار تھا۔

"کس بات پر ہنسا جا رہا ہے؟" اس نے گھور کے دیکھا اور وہ تھم کے بولا تم پر میری محنت رائیگاں نہیں گئی ہے۔ مجھے یقین ہو گیا ہے، میں تمہیں اب بھی اتنی ہی آسانی سے سمجھ سکتا ہوں، جتنی آسانی سے دس سال پہلے سمجھتا تھا۔"

"پھر بھی کیا بات ہوئی......؟" وہ کند ذہنی سے بولا اور اس نے اس کا رخسار چھو کر کہا۔

"یہ بات ہوئی کہ آج بھی تجھ پر کوئی کمنٹ پاس کرے تو ناراضی کے باوجود تیری زبان پھسلے گی ضروری۔"

"بکومت۔" اب کی بار شہباز نے خجل ہو کر اس چہرے سے نظریں ہٹالی تھیں اور سعد سالک نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"مجھ سے ناراض مت ہوا کرو اور یہ ناراض ہونے کی اداکاری تو بالکل مت کیا کرو کیونکہ میں ذرا کھرا بندہ ہوں کسی دن دماغ نے کچھ کمنٹ پاس کر دیا ناں تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کے چلا جاؤں گا پھر ڈھونڈتے رہنا مجھے۔" شہباز نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ آج لہجے میں کچھ الگ بات تھی اب کی بار شہباز نے اس کی ٹھوڑی اوپر کی تھی۔

"تم دل گرفتہ ہو؟"

"شاید......؟" اس نے اپنے اعصاب ڈھیلے ڈال دیے۔

"تم دائمہ کو بہت پسند کرتے تھے نا......"

"شاید۔" اس نے اب کی بار آنکھیں بھی بند کر لی تھیں اور اندر کا دکھ کڑوا تھا۔

بے زمین لوگوں کو
بے قرار آنکھوں کو
بدنصیب قدموں کو
جس طرف بھی لے جائیں، راستوں کی مرضی ہے
اجنبی کوئی لا کر ہم سفر بنا ڈالیں
ساتھ چلنے والوں کی
راکھ بھی اڑا ڈالیں
یا مسافتیں ساری
خاک میں ملا ڈالیں، راستوں کی مرضی ہے۔

"بھئی یہ سب راستوں کی مرضی ہے تو پھر قدموں کو الزام کیوں دیں قدموں کو کسی نہ کسی منزل کو تو چھونا ہوتا ہے نا۔" اب کی بار اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تو اور شہباز نے دیکھا تھا اس کی آنکھیں بالکل سرخ ہو رہی تھیں۔

اندر ہی اندر ضبط کرنے کی اسے ایسی عادت پڑ گئی تھی، پھر اسے کسی بڑی سے بڑی بات کے ہونے سے بھی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ساتھ کام کرنے والے اسے مشین یا بے حسی کا اعلا نمونہ سمجھتے تھے مگر یہ صرف شہباز ملک جانتا تھا کہ اس کے اندر ہی در حقیقت ہر بات زیادہ گہرائی میں جا کر زیادہ درد سے اترتی تھی، اتنے درد سے کہ پھر دل جہاں تھا، ہاں درد ہی درد مقیم ہو گیا تھا۔

”تم نے آج تک سمیر سے کسی بات پر کوئی سوال نہیں اٹھایا، کبھی احتجاج بھی نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے وہ آج اس نئی چال سے تمہارا دل درد سے بھر رہا ہے۔“

”تم جانتے ہو یہ بات نئی تو نہیں۔ ہاں بس پہلے وہ اپنے اس منصوبے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا ارمان احمد بیچ میں آ گیا تھا مگر اب اس سے طلاق کے بعد تین سال سے گھر میں عضو معطل بن کر رہنے کی وجہ سے وہ اس شادی پر آمادہ ہو گئی تھی۔“

”ہاں مگر انکل، آنٹی، بھیا، بھابھی سب نے پرانی حقیقت کو نظر انداز کیوں کر دیا ہے۔“ وہ کھڑے سے بیٹھ گیا تھا پھر آہستگی سے بولا۔

”سمیر بھائی اتنے خود سر اور ضدی ہو رہے ہیں، اس معاملے میں کہ انہوں نے کہہ دیا ہے اگر امی، بابا یہ رشتہ لے کر نہیں گئے تو وہ خود اس معاملے میں پیش رفت کر گزریں گے۔ باشعور ہیں، صاحب حیثیت ہیں۔“

”مگر دانیہ! وہ جانتی ہے سمیر بھائی نے انگلینڈ میں شادی کر رکھی ہے اور وہ صرف پندرہ بیس دن سے زیادہ سال بھر میں انہیں نہیں پا سکتی اور تم...... تم بھی تو اس معاملے میں آگے نہیں بڑھ رہے سعد سالک، یہ غلط ہے۔“ سعد سالک کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔

”وہ آج بھی اس موڑ پر کھڑی ہے جہاں پر بچھڑی تھی۔ انسان کے مقابلے میں اس کی نظر میں آج بھی دولت کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی محبت کی ہونی چاہیے تھی، پھر ارمان احمد کا لائف اسٹائل گزار کر وہ اب نیچے نہیں اتر سکتی۔“

”کیوں کیا وہ اپنے گھر میں نہیں رہ رہی، اس سے تو کئی گنا اچھی زندگی دے سکتے ہو تم اسے۔ گاڑی ہے بزنس ہے ابھی ترقی کے کئی زینے ہیں۔ مگر...... سعد سالک تم نے شاید اپنا کیس ٹھیک طرح سے لڑا ہی نہیں تھا، تم بھی کوئی گئے گزرے تو نہیں ہو۔“ شہباز ملک نے اس مورل سپورٹ دی اور وہ ہنس دیا۔

”تجھے دوستی پر محبت کا سوئیٹر ملنا چاہیے، محبت میں اپنے محبوب کو دنیا کا بہترین انسان گرداننے کے سوا کوئی اسٹیپ قبول ہی نہیں کرتا۔“

”کیونکہ میں جن سے محبت کرتا ہوں وہ عام انسان ہوتے ہی نہیں ہیں۔“ شہباز نے یقین سے کہا اور وہ ہنسا، اور اس ہنسی میں کتنا خالی پن تھا شہباز سے زیادہ کوئی نہیں جان سکتا تھا۔

”تم جب بلند قہقہے لگاتے ہو نا تو کوئی دکھ بہت نیچے سروں میں تمہارے اندر اچانک رونے لگتا ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے یہ بات؟“

سعد سالک نے اس کی طرف سے پشت کر لی تھی اور وہ جب ایکسپوز ہوتا اسی طرح پشت کر لیتا تھا، شہباز جانتا تھا اب وہ اپنی ٹینشن دور کرنے کے لیے سگریٹ سلگانے کی کوشش کر رہا ہوگا۔

"پلیز شاہ، اس وقت نہیں۔" اب وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"کیا تمہیں واقعی دائمہ کو یسر بھائی کا ہوتے دیکھ کر بھی کچھ نہیں ہوگا۔" وہ جانے کیا چاہ رہا تھا دکھے ہوئے دل کو درد سے بھر چکا تھا یا اس کے اندر بغاوت بھر کر اپنی خوشی چھین لینے کی سلگ بھر رہا تھا مگر یہ ضروری تھا کہ سعد سالک کا چہرہ پیلا پڑ رہا تھا۔

"تم ٹھیک ہو؟" وہ تیزی سے اٹھا تھا۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔" اس نے گہرے گہرے کش لیے تھے پھر بہت اچانک بولا تھا۔

"تیرا کیا خیال ہے، میں شاعری نہ کرنے لگوں۔"

"یہ شاعری کہاں سے آ گئی۔" وہ اچنبھے میں رہ گیا اور اس کی آنکھوں میں کسی کا عکس جھلملانے لگا۔

"مجھے یاد ہے وہ دائمہ نور کتنے خلوص سے ہر بار محبت سے دھوکہ کھاتی تھی، ایک لمحے کے لیے تو دھوکہ بھی شرمندہ ہو جاتا ہوگا نا۔"

"دائمہ نور..... ہاں وہ پیاری لڑکی۔ وہ بھی کیا خوب محبت میں دھوکا کھا کر بھی محبت کی چادر کو اوڑھ لیتی تھی کبھی اس جذبے سے خود کو مڑنے نہیں دیتی تھی اور وہ کیا نظم اکثر سنایا کرتی تھی۔" شہباز ملک نے سوچنے کی کوشش کی اور سعد سالک ریوالونگ چیئر پر جھول کر نظم گنگنانے لگا۔

مسئلہ ہوں تو
نگاہیں نہ چراؤ مجھ سے
اپنی چاہت سے توجہ سے مجھے حل کر دو
اپنے غم سے کہو
ہر وقت میرے ساتھ رہے
اک احسان کرو
اس کو مسلسل کر دو

کیا خوب تھی اس کی محبت سے محبت وہ بول رہا تھا مگر شہباز ملک کو لگتا تھا۔ اندر کا سعد سالک چپ کھڑا تھا، یا غم سے بے حال ہو کر اندر کی خاموشی کو بے شمار لفظوں کے شور سے بھر دینا چاہتا تھا۔

سعد سالک نے ایک اور سگریٹ سلگانے کی کوشش کی تھی شہباز ملک نے ہاتھ روکنا چاہا تھا مگر اس بار سعد سالک انکار کیا تھا نہ اس کی بات مانی تھی وہ بہت تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔

☆

آج وہ بہت امید سے اس ایجنسی میں کاپی رائٹر کے طور پر انٹرویو دینے آئی تھی اور کچھ گھبراہٹ کا شکار بھی تھی کیونکہ یہاں جتنے لوگ تھے، سب کے پاس اس کام کی بہترین صلاحیتیں ہی نہیں تجربہ بھی تھا اور اس کے پاس صرف دعاؤں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

وہ ویٹنگ روم میں بیٹھی ہراساں ہو رہی تھی، جب اس کی دوست نے اسے جوس کا پیکٹ لا کر دیا تھا اور

دھیرے سے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی تھی۔

"پلیز مونس! تم خوامخواہ ہراساں ہو رہی ہو، یہاں سب تمہارے ہی جیسے لوگ ہیں۔"

"ہاں مگر میں نے ان کی باتوں سے اندازہ لگایا، سب مجھ سے بہترین انسان ہیں۔"

"تم یہ سوچنا چھوڑ دو کہ سب تم سے بہترین ہیں، تم کسی سے کم ہو کیا؟"

"پتا نہیں گھر میں سب کا خیال ہے، میں کچھ ٹھیک نہیں کر سکتی اس لیے مجھے بھی لگتا ہے۔ میں واقعی کبھی ٹھیک نہیں کر سکتی۔" اس نے افسردگی سے کہا اور اسی وقت قریب کے کمرے سے ایک شخص باہر نکلا۔ اس نے جلتی سی نگاہ مونس پر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔

"اس شخص نے مجھے اتنے غصے سے کیوں دیکھا، مجھے تو لگتا ہے آج کا دن میرا بہت خراب ہے یار!"

"پھر وہم ہونے لگے تمہیں یار۔ خوش امیدی سیکھو۔"

"کیسے سیکھوں، کہاں سے سیکھو۔ یہ کسی انسٹی ٹیوٹ میں پڑھائی جاتی ہے کیا۔" انا ظفر لاجواب ہو گئی اور پھر آدھے گھنٹے بعد انٹرویو شروع ہوئے۔ ان کا نمبر ڈیڑھ گھنٹے بعد آیا تھا۔ باس کی کرسی پر بیٹھا شخص کافی سوبر لگ رہا تھا۔

سنجیدہ لوگوں سے اس کی ہمیشہ جان جاتی تھی ان کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا کس وقت کیا سوال پوچھ لیں۔

مونس بشیر کرسی پر جا کر بیٹھی اور اس نے اس کی سی وی دیکھ کر اس سے کوئی سوال نہیں کیا سوائے اس کے۔

"کیا نوکری آپ کی ضرورت ہے؟"

اس کا دل چاہا کہے۔ "نہیں شغل کے طور پر کرنی ہے...... گھر میں پڑے پڑے بور ہو رہی تھی تو سوچا کیوں نہ چل کر صبح ہی صبح بسوں کے دھکے کھائے جائیں۔" مگر جل کر وہ صرف سوچ سکی اور بولی تو اتنا

"جی سر! میں اپنے ذاتی اطمینان کے لیے یہ نوکری کرنا چاہتی ہوں۔ میں جاننا چاہتی ہوں مجھ میں کوئی صلاحیت ہے بھی یا صرف مجھے دھوکا ہو رہا ہے۔" شہباز ملک نے چونک کر اسے دیکھا، یہ لہجہ تو اس کا بہت سنا ہوا ہے۔

"یہ لڑکیوں کا سعد سالک ہے۔" اس نے بے ساختہ اس کی سوچ کو سراہا اور رسمی جملے کہہ کر انٹرویو کا اختتام کیا۔ گھڑی کی طرف نظر گئی تو دو بج رہے تھے۔

آئس کریم آ چکی تھی مگر اس نے اس کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا کافی کی طرح آئس کریم کے بارے میں بھی اس کی یہی رائے تھی کہ کسی اچھے سے دوست کے ساتھ انجوائے کرنے میں مزہ آتا ہے۔ وہ پیون کو آئس کریم اٹھانے کا کہہ کر دفتر سے باہر نکل آیا، موبائل ٹرائی کیا مگر سعد سالک کا موبائل آف آ رہا تھا۔

"یہ انسان بھی نا، کسی ایک سے بھی ناراض ہو جائے نا تو پھر ساری دنیا سے روٹھنے ٹن کرنے لگتا ہے پھر ظاہر یہ کرتا ہے۔ اسے کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن درحقیقت وہی سب سے زیادہ آزردہ ہوتا ہے۔"

"کہاں ہو گا وہ......" اس نے سوچا۔

کئی جگہیں بھی ذہن میں دوہرائیں پھر آہستگی سے بائیک کو سڑک پر ڈال دیا۔ شاید وہ جان گیا تھا کہ اسے کہاں مل سکتا تھا۔

☆

''تم نے زندگی میں کچھ کرنا ہے یا بس ساری زندگی یونہی گنوانی ہے۔'' وہ ابھی کرکٹ کھیل کر آیا تھا کہ امی نے اس کی کلاس لے ڈالی۔

آخر آپ کو یہ کیوں لگتا ہے کہ مجھے کچھ نہیں کرنا زندگی میں۔''

وہ صوفے پر بیٹھ کر امی کو دیکھنے لگا اور امی کا غصے سے بھرا چہرہ۔

''سمیر کہہ رہا تھا کل بھی تم بابو کی کلاس میں باہر کھڑے تھے۔ سعد سالک نے ماں کو دیکھا اور خاموش رہ گیا یہ ''میری بھی تو ماں ہیں لیکن یہ صرف وہی کیوں سنتی ہیں جو سمیر ان سے کہتا ہے جو سمیر سمجھاتا ہے۔ اسی کو حرف آخر مان لیتی ہیں، کبھی انہوں نے اپنی کسی بات کو اس طرح شروع نہیں کیا، سعد سمیر جو کہہ رہا ہے اس میں کتنی حقیقت ہے؟ امی ہمیشہ یہ کیوں کہتی ہیں، سمیر جو کہہ رہا ہے وہ غلط نہیں۔ اب تم بتاؤ تم نے ایسا کیوں کیا؟ امی نے کبھی بھی کسی بھی معاملے میں مجھے شک کا فائدہ نہیں دیا۔''

''کیا سوچ رہے ہو، میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں نا۔ آخر تم نے ذہن میں کیا سوچ رکھا ہے۔''

''کچھ نہیں امی! میرے ذہن میں اپنے بارے میں کوئی پلان نہیں ہے۔ اس نے نروٹھے پن سے کہہ کر بظاہر بات ختم کی مگر اس کا دل چاہ رہا تھا کہ امی سمیر کی طرح اس بات کے اختتام سے ایک نئی ابتدا کریں۔ اس سے پوچھیں۔ اس نے ایسا کیوں کیا حالانکہ گھر کے ہر بچے کے لیے انہوں نے کچھ خواب دیکھ رکھے تھے اور ان خوابوں میں وہ معمولی سی ہیرا پھیری بھی برداشت نہیں کرتی تھیں لیکن سعد سالک ان کی وہ اولاد تھا، جن کے لیے انہوں نے کبھی کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔

''شروع سے اس کا دھیان پڑھائی کی طرف نہیں ہے۔ سالک! اس لیے میں نے اس سے کوئی امیدیں نہیں لگائیں جو بننا ہوگا یہ بن جائے گا۔''

یعنی میری بلا سے کچھ بنا تو ٹھیک نہ بنا تو بھی کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ اس نے امی کا یہ رویہ سہا اور بہت حوصلے سے سہا لیکن آج اس کا دل بہت الگ طریقے سے دکھا تھا، کیونکہ آج اسکول میں بھی اسے بہت سبکی سہنی پڑی تھی اس نے رات کو کام مکمل کر کے بیگ بند کیا تھا، مگر بابو کی کلاس میں اس کا رجسٹر جب اس کے منہ پر کھینچ کر مارا گیا تو اسے حیرت ہوئی۔

''تم نے مجھے بے وقوف سمجھ رکھا ہے۔'' ٹیچر نے اسے غصے سے دیکھا اس نے رجسٹر اٹھایا اور حیران رہ گیا، سارے صفحے سادہ تھے۔

''سر! میں نے کام کیا تھا میں یقین دلاتا ہوں۔'' اس نے نمبرنگ دیکھی صفحے وہی تھے، درمیان میں سے صفحے بھی غائب نہیں تھے۔

''تم خود کو بہت زیادہ اسمارٹ سمجھتے ہو نا، جاؤ باہر جاؤ، ایک ہفتے تک تم کلاس اٹینڈ نہیں کر سکتے ہو......'' نیا حکم...... وہ بلبلا تا رہ گیا اور پھر آف پر اس کے سامنے سمیر کھڑا تھا۔

''تمہیں بڑا زعم ہے نا اپنی رائٹنگ پر اپنی تصویر بنانے کی صلاحیت پر یہ دیکھو۔ یہ رہے وہ صفحے جو تم نے کالے کیے تھے اور میں نے ایک نئے رجسٹر سے وہی نمبرنگ کی صفحے تمہارے رجسٹر میں ایڈ کر دیے۔ تمہاری محنت ضائع ہو تو مجھے سکون ملتا ہے۔'' وہ خالی آنکھوں سے بھائی کو دیکھنے لگا جو اس سے دو سال بڑا تھا مگر بیمار ہونے اور دو سال ضائع

ہونے کی وجہ سے اس کی کلاس میں اس کے ساتھ تھا۔

”کیا دیکھ رہے ہو اس طرح یہ نظروں کا جادو کہیں اور چلانا مجھے تم پر قطعی رحم نہیں آتا سمجھے۔“ وہ صفحے ہوا میں اڑا کر آگے بڑھ گیا اور سعد سالک صفحے اٹھا کر گھر آ گیا اور اب امی نے اس کی پہنچائی گئی بات پر اس کی گوشمالی کی تھی تو اس نے زچ ہو کر سوچا تھا وہ سمیر کے ساتھ اور نہیں رہ سکتا

”میں ہاسٹل میں رہنا چاہتا ہوں۔“ شام تک اس نے فیصلہ کر لیا اور بابا اسے دیکھتے رہ گئے۔ بابا کو اپنی سب اولادوں میں سے یہ بیٹا پیارا تھا مگر کبھی کبھی وہ بھی اس سے مکدر ہو جاتے تھے، جب شکایتیں اس کے نام سے گھر پہنچتی تھیں۔

”آخر بیٹھے بٹھائے یہ نئی کیا سوجھی؟“ بھیا نے سوال کیا۔ وہ سیکنڈ ایئر میں تھے اور وہ نائنتھ میں سو انہیں سوال کرنے کا حق تھا

”کچھ خاص نہیں۔ مجھے لگتا ہے میں یہاں یکسو ہو کر نہیں پڑھ پا رہا۔“ ”تمہیں یہاں کون سی چیز یکسو ہونے سے روک رہی ہے۔“ بابا نے سوال کیا اور اس کا دل چاہا برملا کہہ دے سمیر سالک مگر وہ کہہ نہیں سکا۔ وہ امی کا بہت لاڈلا تھا اور وہ امی سے اتنی محبت رکھتا تھا کہ ان کی تکلیف سے جو اس نام کو لینے سے ان کے چہرے پر پھیلتی، اس سے بچنے کے لیے اس نے خاموشی کو ہم رکاب کیا۔

”بس مجھے لگتا ہے، میں ہاسٹل میں رہ کر زیادہ اچھا پڑھ سکتا ہوں۔“

”بابا! یہ سب نکمے لوگوں کے بہانے ہیں ورنہ کیا آپ نہیں جانتے ہاسٹل میں جا کر بچے کتنا بگڑ جاتے ہیں، اسے صرف آزادی چاہیے۔ یہ چاہتا ہے اس پر کوئی چیک رکھنے والا نہ ہو، کوئی روک ٹوک نہ ہو کوئی اس کے کرتوت نہ جان سکے اور یہ جو مرضی آئے کرتا پھرے۔“

”سعد اتنا برا بچہ بھی نہیں ہے اب۔“ منجھلے بھیا نے کہا اور اسے تھوڑی سی تکلیف ہوئی، یعنی وہ منجھلے بھیا کی نظر میں بھی، کچھ تھوڑا ابہت برا بچہ ضرور تھا حالانکہ اس نے ہمیشہ شرارتوں سے اسی لیے جان چرائی تھی کہ وہ اچھا بچہ کہلوانا چاہتا تھا مگر اس کی ساری کوششیں سمیر سالک کی وجہ سے دھری رہ گئی تھیں۔

”مجھے اب اس گھر میں نہیں رہنا۔“ اس نے دل میں اٹل فیصلہ کر لیا۔ بابا سوچ میں گم ہو گئے تھے اور بڑے بھیا نے رات کو اس سے تنہائی میں ملنے پر کہا تھا۔

”تم واقعی ہاسٹل جانا چاہتے ہو، کیا صرف بے جا آزادی کے لیے حالانکہ میرے خیال میں امی اور بابا نے کبھی ہم بچوں پر بے جا سختی نہیں کی ہے۔“

وہ پھر بھی کچھ نہیں بولا اور ایک مہینے بعد وہ دوسرے شہر میں ہاسٹل میں ایک بالکل الگ ماحول اور الگ، جود کے سامنے کتنا رسس کر رہا تھا۔

”تم نے ہاسٹل میں آنے کا فیصلہ واقعی کیوں کیا تھا مجھے تو بتاؤ گے میں تو تمہارا دوست ہونا اور صرف ایک ہفتے کی سنگت نے دوستی کا چولا پہنا تو اسے ہنسی آنے لگی۔

”تمہیں کب لگا میں تمہارا دوست ہوں؟“ اس نے سوال کیا اور سامنے بیٹھا وجود مسکرایا۔

”مجھے تو تم پہلے دن سے ہی لگے تھے کہ تم میرے دوست ہو، ہاں میں تمہیں اپنا دوست نہیں محسوس ہوا تو یہ

تمہارے دل کے کیبل فالٹ کا نتیجہ ہے، سو سوال تمہیں خود سے کرنا چاہیے نا کہ مجھ سے۔" سعد سالک کے ہونٹوں کو شوخ ہنسی نے چھو لیا تھا۔

"تم واقعی دوست بنائے جا سکتے ہو شاہ۔"

"تمہیں کیسے پتا، میرے دوست مجھے شاہ پکارتے ہیں۔"

اس نے اس کے سر پر چپت لگائی تھی پھر مسکرا کر تھا "اس لیے کہ تمہیں ہر بندے کو دوست بنانے اتنی عادت ہے، سب طرف سے شاہ آوازوں کے سوا کچھ اور نہیں سنائی دیتا۔"

وہ ہنسنے لگا تھا پھر مسکرا کر بولا۔ "انسان کو ہر انسان کے ساتھ خیر سگالی کے ساتھ پیش آنا چاہیے، ہاں مگر دوست صرف ایک آدھ ہی ہونا چاہیے، کیونکہ میں دوست کو ہمراز کا درجہ دیتا ہوں۔"

"واہ یہ تو ایک نئی تھنکنگ ہے بھئی۔" اس نے مسکرا کر کہا اور شہباز نے اپنے سوال کی طرف لوٹ آنے کی بات کی۔

"بتاؤ نا ہاسٹل میں آنے کی کیوں بات کی تم نے۔"

سعد نے اس کی طرف دیکھا پھر نرمی سے بولا۔ "تمہیں کیا لگتا ہے جب ہم گھر میں کسی شو پیس سے بھی کم درجے پر آ جائیں تو ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

شہباز نے اس کی طرف دیکھا تو کہا۔ "ایک نظر کی ترس کی حسرت کو لے کر گھر سے نکل آنا چاہیے۔ بہت سے لوگوں کے درمیان اکیلے رہنے سے بہتر ہے آپ واقعی اکیلے ہونے کا خود کو پرسہ دیں اور خاموش اپنی قبر کے سرہانے جا بیٹھیں۔" سعد نے اس کی طرف دیکھا پھر آہستگی سے کہا۔

"تم گھر بدر کیوں ہوئے؟"

"ماما، پاپا اور میری ایک اسٹیپ سسٹر۔"

لمحہ بھر کو رکا پھر آہستگی سے بولا۔ "یہ میری ماما کی دوسری شادی ہے پاپا یوں تو اچھے انسان ہیں مگر کبھی بھی غصے میں بالکل آؤٹ آف کنٹرول ہو جاتے ہیں، ان کا سارا نزلہ مجھ پر گرتا ہے تو ماما میری حمایت میں ان سے بڑبڑاتی ہیں، سو میں نے سوچا میری وجہ سے ان کا گھر برباد نہیں ہونا چاہیے۔"

بس وہ لمحہ تھا جب سعد سالک اور شہباز بہت اچھے دوست بن گئے۔

پھر دن آئے گئے مگر ان کے درمیان کی محبت کبھی کم نہ ہوئی، یہاں تک کہ اس نے بہت اچھے نمبروں سے کالج سے پاس آؤٹ کیا۔ سائنس سے وہ یکدم کامرس کی طرف آ گیا تھا اور شہباز نے کہا تھا۔

"تیرا دل محبت ہے اور دماغ بنیا ہے، اتنا اچھا کمبی نیشن بہت کم دیکھا ہے میں نے، یہ بتا دماغ اور دل کبھی آپس میں ناراض نہیں ہوتے کیا؟" سعد ہنس پڑا۔

"نہیں ہوتے۔ ابھی تک دل کو خوب اور پیارا لگنے والا آیا نہیں نا۔ ہو سکتا ہے آگے چل کر کبھی دونوں میں روٹھنا منانا ہو جائے۔" اور شہباز نے تب اس کے قریب آ کر کہا۔

"میں تو تجھے پتا ہے، دل ہوں، سو اس دل میں کوئی آ گیا ہے۔"

"ارے کب؟ مجھے تو تو نے بتایا نہیں۔"

"بس مجھے بھی بہت اچانک پتا چلا۔"

"کیسے......؟" سعد نے سوال کیا اور اس نے کہا۔

"جب اس کی شادی ہوئی تو پتا چلا، ارے اس سے تو میں محبت کرتا تھا۔" سعد سالک جو غور سے سن رہا تھا اس کے قہقہے پر چونکا تھا پھر اس نے کشن اٹھا کر اسے دے مارا تھا۔

"اسٹوپڈ مجھے بناتا ہے۔"

"بنے بنائے کو کیا بنانا ویسے تیرے دل میں کوئی کیبل فالٹ ہے کیا۔" وہ اب کی بار حیران ہو گیا۔

"کیوں......؟"

"تجھے پتا ہے تیری آنکھیں بڑی چمکیلی ہیں۔"

"تو نے میری آنکھیں کب دیکھی ہیں۔"

"ہر وقت تو دیکھتا ہوں بس تجھے نہیں پتا چلتا تیری آنکھیں کیوں چمکیلی ہیں۔"

"کیوں چمکیلی ہیں......؟" وہ خاموشی سے اسے دیکھنے لگا اور اس نے کہا۔

"تیری بچپن کی دوست دائمہ کیسی ہے؟" وہ اچانک سوال پر پھر سے نئے سرے سے چونکا تھا۔

"اچھی ہے۔ بہت اچھی ہے کیوں...... لیکن یہ تو کیوں پوچھ رہا ہے۔"

"اس لیے کہ جاننا چاہتا ہوں تجھے اس سے بات کرنا کیسا لگتا ہے۔"

"بہت اچھا لگتا ہے۔ اچھے دوستوں سے تو جب بات کرو روح کو سرور آ جاتا ہے جیسے میں تجھ سے بات کرتا ہوں تو لطف میں...... ہر بار ایک نئے لطف میں گم ہو جاتا ہوں۔"

"میں دائمہ نہیں ہوں تو سمجھ کیوں نہیں رہا میری بات، میں نے کہا تیری آنکھیں بڑی چمکیلی ہو جاتی ہیں۔"

"کب میری جان......؟" اس نے اعصاب ڈھیلے ڈال کر پوچھا اور وہ ایکسائیٹڈ ہو کر بتانے لگا۔ "جب تو دائمہ کا ذکر کرتا ہے نا اس کی کوئی بات دوہراتا ہے تیری آنکھیں خود بخود چمکیلی ہو جاتی ہیں، اپنی باتوں میں وہ خود جھلک مارنے لگتی ہے۔ خود کہتی ہے، بہت اہم ہوں سعد سالک کے لیے...... بہت اہم۔"

"افوہ وہ تو ایویں...... نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم تو بچپن کے دوست ہیں نا۔ اس لیے مجھے اس سے کچھ انسیت سی ہے۔ وہ شروع سے اپنے سارے کام مجھ سے کروانے کی عادی ہے، وہ کسی اور سے کبھی اتنا فری نہیں ہوتا بس اس لیے میں بھی جب اس کے متعلق سوچتا ہوں یا اس کے دوہراتا ہوں تو خود بخود میرا دل میری آنکھوں میں مسکراہٹ بن جاتا ہے۔"

شہباز نے نعرہ لگایا تھا "یہی تو کہہ رہا ہوں تیرا دل اس کے نام پر جس طرح آنکھوں میں آن بیٹھتا ہے، یہی تو محبت ہے اور تو پتا نہیں کہاں ایران توران کی بک رہا ہے۔ سچ بتاؤں اگر تیری جگہ میں ہوتا نا تو اب تک اظہار کر چکا ہوتا اس سے۔"

"بکو مت۔ میں اس کے بارے میں ایسا نہیں سوچتا۔"

اس نے حتمی بات کہی تو شہباز چپ کر گیا لیکن پھر اس کے بعد سعد سالک نے جب جب آئینہ دیکھا اسے لگنے لگا، دائمہ اس کی آنکھ میں آن بیٹھی ہے۔ ہر بار اسی اشتیاق دید سے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے لگتی ہے۔ میں ہوں دل کی مان لوتا میں ہوں تمہارے اندر۔ تمہارے خون میں زندگی کی طرح گردش کرنے لگی ہوں، تم مجھ سے نظر نہیں چرا سکتے۔

……

خود بخود سعد سالک کے ہونٹ مسکرانے لگتے، کسی کو ہر لمحے اپنے ساتھ محسوس کرنا، اس کے ساتھ جینا، ایک ایک سانس اس کی مرضی سے لینا وہ نہ ہو تب بھی اپنے اندر اسے دھڑکتے پانا یہ سب بہت الگ احساس تھا جو اس میں پروان چڑھ رہا تھا۔

پھر اس کا اظہار کب تک اس کے اندر ٹھہرا رہتا۔ وہ چھٹیوں پہ گھر گیا تو پہلی بار اس نے دائمہ کو ایک الگ طرح سے دیکھا۔

سیدھی سادی چال ڈھال، قبول صورتی اور ہمہ وقت چہرے پہ کھلتی مسکراہٹ اس کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہیں تھا کچھ ایسا جو متوجہ کرتا مگر کچھ چہروں کو دلی طرف موڑنے کا مخصوص ہنر آتا ہے اور ہنر اس پر چل گیا تھا، پہلی بار اس کی زبان، دائمہ کے سامنے لڑکھڑائی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے آج کل؟"

دائمہ کے برتن دھوتے ہاتھ رک گئے۔ وہ دائمہ کے گھر میں ابھی ابھی داخل ہوا تھا اور آنی سے دائمہ کے بارے میں جان کر کچن کی سمت آ گیا تھا ان دونوں گھرانوں میں خون کے رشتوں کی طرح مضبوط بندھن تھا، سو اس کا یہاں آنا جانا کسی نے ناپسند نہیں کیا تھا۔ دائمہ اب اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا، ایسے کیا دیکھ رہے ہو سعد۔" دائمہ نے دوپٹے سے ہاتھ پونچھ کر اس کے لیے چائے کا پانی رکھا تھا۔

"محبت جب آنکھ بھر کر دیکھ لے تو دل رکنے لگتا ہے محبت کے سینے میں دھڑکنے کے لیے ہمکنے لگتا ہے جی چاہتا ہے کوئی ہم سے بھی زیادہ ہمیں چاہے۔ ہماری چاہ میں دنیا بھلا دے ہمیں اسے محسوس کرے کہ اپنے آپ کا احساس کھو دے۔ ہمیں اس طرح جینے لگے کہ زندگی کے کم ہونے کا احساس بھی کہیں مر جائے اور دل کہے کسی کے دل میں جینے کی عمر جتنی بھی کم ہو زندگی کرنے کو وہی عمر، عمر خضر کے برابر ہے۔

"تم نے مجھے مس کیا۔"

"ہاں ناں۔ میں تو تمہیں ہر لمحے مس کرتی ہوں۔"

اس نے سادہ سے لہجے میں کہا اور یکدم اس کا دل چاہا وہ اتنے سادہ لہجے میں تو میری دوری کا ہاتھ مت تھامو اور جب دور ہو تمہیں لگنا چاہیے میں تم سے صدیوں کے فاصلے پر ہوں اور تمہارا دل چاہنے لگے، میں خوبصورت لمحہ بن کر تم پر چھا جاؤں۔ تمہارے اتنے قریب محسوس ہوں کہ تمہیں اپنا سانس رکتا محسوس ہو۔ تم میرے بغیر سانس بھی لینا گناہ سمجھو۔ مگر وہ یہ کہہ نہیں سکا۔ محبت کی بارگاہ میں وہ خاموش کھڑا رہ گیا تھا، شاید خوف زدہ تھا کہ اگر سامنے سے انکار حصے میں آیا اگر اس نے کہا تم...... میں نے تمہیں قریب رگ جاں کبھی محسوس نہیں کیا۔ تو کیا ہوا...... وہ چائے کپوں میں ڈال کر باہر آنگن میں پڑے تخت پر آ گئی تھی، پھر نرمی سے بولی تھی۔

"آج تم بہت کنفیوز لگ رہے ہو، خیریت تو ہے۔"

''ہاں سب خیریت ہے۔ تم بتاؤ تمہاری بی ایس سی کیسی چل رہی ہے۔''

''ایک دم پرفیکٹ۔'' دائمہ نے کہا پھر رک کر بولی۔

''سچ پوچھو تو میرے اندر اعتماد کی پہلی اینٹ تم نے ہی لگائی تھی۔ سعد! جس طرح سے تم نے خاموشی سے میرے اندر کا خوف، ڈر نکال کر اعتماد سے کہا تم سب کچھ کر سکتی ہو تو مجھے حیرت ہونے لگی۔ کیا واقعی میں ایسا کر سکتی ہوں، میں نے اندر اتر کر پہلی بار خود کو دریافت کیا تب سے میں نے تمہیں واقعی اپنا دوست سمجھا۔''

''تم اس سے کہنا تم صرف دوست نہیں ہو تم کچھ سوچتے ہو اس کے بارے میں۔ کچھ بہت الگ سا۔'' شہباز کی آواز اس کی سماعت میں گونجی۔ اس کا دل چاہا وہ آج یہ سچ کہہ ہی دے مگر وہ خاموش کھڑا رہ گیا۔

''شاہ! تم نہیں جانتے یہ لڑکی مجھے کتنی عزیز ہے، میں صرف اپنے دل کے لیے یہ رسک نہیں لے سکتا، اس کی محبت نے میرے دل کی ایک ایک سیڑھی چڑھی ہے، پتا نہیں پہلے اس کی محبت دل میں اتری ہے یا یہ پہلے خود میرے دل میں در آئی تھی مگر یہ سچ ہے میں اسے کھونے کا لمحہ سہ نہیں سکوں گا۔''

''کیا سوچ رہے ہو۔'' دائمہ نے ٹہوکا دیا اور وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

''کوئی خاص بات نہیں، یہ بتاؤ، سمیر بھائی تمہاری ہیلپ کرتے ہیں میری طرح۔''

وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ سمیر نے جو اسے خط لکھا تھا، وہ اس سے دائمہ کو چھین لیں گے۔ زندگی کی دیگر خوشیوں کی طرح تو کہاں تک درست ہے اور دائمہ بھی اس کے دل کے ڈر سے بے خبر کہنے لگی تھی۔

''سمیر! مجھے تمہارا اارجنٹ لگتے ہیں، ویسے ہی لونگ کیئرنگ مجھے انہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی وہ خود بخود میری بات سمجھ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی جس طرح مجھے تمہیں وضاحت دینی پڑتی تھی، سمیر کے ساتھ مجھے ایسا بھی نہیں کرنا پڑتا۔'' سعد سالک نے یکدم خود کو اس سے صدیوں کے فاصلے پر کھڑا پایا۔

''میں اس کے دل میں ہوں بھی یا نہیں؟''

دل نے چاہا ابھی پوچھ لے خار خار راستوں کی یاری نبھانے سے کیا فائدہ اگر منزل کا گمان تک نہیں مگر دل نے کہا، محبت کرنے والے خار خار راستوں پر چلنے سے چوکتے کب ہیں، وہ تو بس دل کی ہانک پر چلتے ہیں۔ دھوکہ ہو محبت تک بھی اس پر ایمان لے آتے ہیں۔ ہار جائے دل تو اس ہار کو بھی اعزاز بنا لیتے ہیں، کیا تمہیں یقین ہے دائمہ اب تم سے محبت نہیں کرتی تو کیا تمہارا دل اس سے محبت کرنا چھوڑ دے گا۔

دل نے بے بسی سے دماغ کی سنی اور سر جھکا کر کہا شاید پھر بھی محبت کا یہ جرم سرزد ہوتا رہے گا۔ محبت اپنا کرتی ہے تو پھر کسی اور کے قابل کب رہنے دیتی ہے۔ کسی اور کا ہونے کب دیتی ہے مگر سمیر۔ وہ دائمہ جیسی لڑکی کے حساب کا لڑکا نہیں۔ وہ اس کا بھائی تھا مگر وہ اس کے شب و روز سے واقف تھا جس طرح سمیر اس کے بارے میں اصل سے واقف ہونے کے باوجود اس کی ذات پر جھوٹ باندھتا رہتا تھا اور جس پر اس نے کبھی کوئی وضاحت نہیں دی تھی اس کے کردار کو جانچنے کے لیے کافی تھا۔ بڑے بھیا جب ملنے کے لیے آتے بہت غور سے جانچ کرتے، اس کی نشست و برخاست دیکھتے۔ اس کے دوستوں سے ملتے۔ اس کے کلاس فیلوز کے کمنٹ سنتے اور جب گلے ملتے تو کہتے۔

''تم پتا نہیں اچھے ہو یا اچھا نظر آنے کی کوشش کرتے ہو میرے سامنے۔ لیکن میں تم میں کوئی خامی نہیں نکال پاتا۔''

اور سعد سالک پھیکے سے انداز میں ہنس کر چپ رہ جاتا اور شہباز ان کے جانے کے بعد چیختا۔

''تم کہہ نہیں سکتے تھے، آپ اپنے بھائی کو نہیں جان سکے اب تک کہ وہ کیسا ہے تو دنیا کو جاننے کا دعویٰ کیوں کرتے ہیں۔ کون سی دنیا کھوج رہے ہیں وہ۔''

وہ اسے چپ کراتا رہ جاتا مگر وہ ان کی صحافت ان کے این جی او کے سرگرمیوں پر احتجاج ریکارڈ کرائے بنا نہیں تھمتا لیکن آج وہ خود احتجاج کرنا چاہتا تھا مگر اسے خاموش رہ جانا پڑا تھا۔ وہ چائے پی کر گھر آ گیا تھا۔ اپنے اور عمیر کے کمرے میں بیٹھا کتاب کھول کر صرف صفحے الٹ پلٹ رہا تھا کہ اچانک کسی نے اس کے ہاتھ سے کتاب اچک لی۔

''اوہو شاعری پڑھی جا رہی ہے۔ واہ واہ کیا ذوق ہے۔'' اس نے نگاہ اٹھائی سمیر سامنے کھڑا تھا۔

جس نظم پر صفحہ مڑا ہوا تھا، اس نے زور زور سے پڑھنا شروع کر دیا۔

زندہ رہیں تو کیا ہے مرجائیں ہم تو کیا
دنیا سے خاموشی سے گزر جائیں ہم تو کیا
ہستی ہی اپنی کیا ہے زمانے کے سامنے
اک خواب ہیں جہاں میں بکھر جائیں ہم تو کیا
اب کون منتظر ہے ہمارے لیے وہاں
دل کی خلش تو ساتھ رہے گی تمام عمر
دریائے غم کے پار اتر جائیں ہم تو کیا

''ہاہا...... کیا شاعری پسند ہے جناب کو، لگتا ہے سارے ظلم آپ پر ہی روا ہیں دنیا کے۔'' سعد سالک نے عمیر کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھا پڑھتے پڑھتے دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔

''سمیر بھائی پلیز میں گھر میں چھٹیاں سکون سے گزارنے آتا ہوں۔ آپ کیوں مجھے ستاتے ہیں اتنا زیادہ کہ پھر میرا گھر آنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔''

''یہ کوئی نئی بات نہیں۔ تم بچپن سے اس گھر سے بھاگ رہے ہو، الزام دوسرے کو کیوں دیتے ہو۔ تمہارے اندر شروع سے گھر کے متعلق کوئی نرمی نہیں ہے تم بس مجبوری کے تحت گھر آتے ہو ورنہ تمہیں گھر سے، ماں سے باپ سے، بہن بھائیوں سے کسی سے کوئی مطلب نہیں۔'' وہ یکدم کھڑا ہو گیا تھا۔

''امی آپ......!'' اس نے پوری توجہ سے امی کو دیکھا۔

''میں نے کیا غلط کہا تمہیں ہم سے دلچسپی ہے کب، تمہیں کیا پتا گھر میں کس وقت کس چیز کی ضرورت ہے، کس وقت کہاں ہونا ضروری ہے، تمہارے لیے محبت کی بات ہی غیر ضروری ہے اور سمجھتے ہو، بہت جانتے ہو محبت کے بارے میں۔''

''میں محبت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا نہ ہی جاننا چاہتا ہوں۔ ہاں بس محبت کیسے کی جاتی ہے یہ آتا ہے۔ مجھے رشتے نبھانا، محبت نبھانا اس محبت کے دکھ جینا سب آتا ہے امی!'' امی کو پتہ نہیں پہلی بار اس کے لہجے نے زنجیر کیا تھا، کیا بات تھی اس کے انداز میں۔ وہ چپکے سے اس کے اپنے سامنے سے ہٹ جانے پر پہلی بار اسے کھوجتی ہوئی تیسری

منزل پر اس کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ وہ چھت پر شام کے سائے میں بکھرا ہوا خود بھی پرچھائیں لگ رہا تھا۔

"سعد" امی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اس نے مڑ کر امی کو جس نظر سے دیکھا۔ امی کا دل بیٹھنے لگا تھا، کتنی حسرت، کتنا دکھ اور آنکھ میں نمی تھی۔

"تم رو رہے ہو بیٹا" امی نے دونوں کندھوں سے اسے تھام لیا اور تب انہیں محسوس ہوا اس کا جسم گرم ہو رہا تھا۔

"تمہیں بخار ہے سعد!"

"نہیں تو امی! وہ بس ایسے ہی تھوڑا بہت ٹمپریچر ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔"

"کیوں ہو جاتا ہے۔ تم نے مجھے آج تک نہیں بتایا۔" امی اس کے قریب بیٹھ گئی تھیں اور وہ آہستگی سے بولا۔

"پندرہ بیس دن سے ہو رہا تھا۔ امی پیناڈول لے لیتا تھا۔ اب وہاں ہاسپٹل میں کون تھا جو ناز نخرے اٹھاتا۔"

"ناز دکھانے کو دل چاہتا ہے میرا مگر۔" امی کو اس کے اس جملے سے ایک فرمائش سنائی دی، جو اس نے کی نہیں تھی مگر چاہتا تھا کہ کوئی اس کے دل کی یہ تمنا پا جاتا۔

امی نے دوسرے دن اپنے فیملی ڈاکٹرز سے اپائنٹمنٹ لیا تھا۔ اس کے ٹیسٹ ہوئے تھے، تب پتا چلا تھا اسے ٹائی فائیڈ تھا جس نے اس کی بے توجہی سے سنجیدہ صورت حال اختیار کر لی تھی۔

پہلے کسی کا ہاتھ نہیں تھا تو تھامنے کی طلب بھی نہیں تھی۔ بڑی جی داری سے بیماری سے لڑ رہا تھا مگر اس کی گود میسر آئی تو ایکدم سے ہمت ہی جواب دے گئی۔

پہلی بار اس کے وجود کا احساس ہوا تھا۔ گھر میں بابا، بڑے بھیا، منجھلے بھیا سب اس کے گرد جمع تھے اور تو اور سمیر بھی خیریت پوچھ جاتا تھا اور بات کہ اس پوچھنے میں بھی زہر بھرا ہوا ہوتا تھا۔ باقی رہا تھا شہباز سو اسے طبیعت خرابی کا پتہ چلا تو وہ بھی فوراً بھاگا چلا آیا۔

"بڑا زبردست جھگڑا کر کے آ رہا ہوں تیرے لیے۔" اس نے آتے ہی دھماکہ کیا اور وہ پوچھنے لگا۔

"کیوں کیا جھگڑا؟"

"بس یار! پاپا اپنے جنرل اسٹور پر بیٹھنے کو کہہ رہے تھے میں نے بھی ہامی بھر لی کہ چھٹیوں میں کہنا ماننے میں کوئی حرج نہیں ہے مگر تیری آواز سنی تو رہا نہیں گیا۔ دل نے کہا جب تک تجھے دیکھ نہ لوں گا۔ چین نہیں ملے گا سو لاہور کی تیاری پکڑی۔ پاپا نے دیکھا تھا تو ماما سے بولے۔ تمہارا بیٹا اتنا بگڑ چکا ہے کہ اب اسے سیدھا نہیں کیا جا سکتا، آوارہ گردی کا حال دیکھو، کراچی سے لاہور چلا گیا ہے۔"

"تم نے غلط کیا۔ انکل ٹھیک کر رہے ہیں، تم واقعی بہت بگڑ گئے ہو۔" شہباز نے اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے بولا۔

"ہاں بگڑ گیا ہوں مگر، بگڑے ہوؤں کو سنوارنے والا بھی تو کہیں ہوتا ہے۔ سو مجھے بھی کوئی سنوار ہی لے گا، نہ بھی سنوارا تب بھی کچھ اتنا برا نہیں ہوں میری جان۔"

"ایک تو یہ تیری یہ عادتیں بھی ناں۔" اس نے تھوڑا سا سوپ پیا تھا اور ہاتھ سے اشارہ کیا تھا جیسے ابھی کچھ کہنا باقی تھا شہباز نے دیکھا تو اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

''پریشان مت ہو، دو دن پہلے پاپا کو فون کر دیا تھا۔ سوری بھی کی تھی۔ وجہ بھی بتا دی تھی۔ بہت اچھے انسان ہیں پاپا۔ شام کو تجھ سے بات بھی کریں گے۔ تیری خیریت پوچھنے کے لیے۔''

''سچ کہہ رہا ہے نا۔'' اس نے تشکیک سے دیکھا۔ اور وہ دھیرے سے ہنسا۔

''تجھ سے آج تک جھوٹ بولا ہے..... کبھی..... جہاں جھوٹ بولنا ضروری ہو وہاں بھی نہیں بولتا۔ تجھ میں اور مجھ میں کوئی دوئی نہیں ہے، جو ہوں جیسا ہوں تیرے سامنے ہوں۔ مجھ سے محبت رکھے تو دعائے خیر ہے تیرے لیے۔ نفرت کرے یا دھتکارے تو بھی جزا دے تجھے میرا رب!''

''بس زیادہ صوفی نہ بن......'' اس نے ہنسنے کی کوشش کی اور وہ اس کا ہاتھ تھام کے بولا۔

''محبت صوفی ہی تو ہو جاتی ہے جو دل سے اسے اپنا لے اس کا اندر بدل دیتی ہے۔ جالے، گند کچرا سب نکال کر باہر کر دیتی ہے۔ وہ باہر سے کچھ نہیں لاتی سب اندر ہوتا ہے۔ بس وہ زندگی کو ترتیب دینا سکھاتی ہے۔ جیسے یہ تیرا کمرہ۔ ابھی بکھیر دوں تو مجھے جوڑے سے جوڑا ملانا مشکل ہو جائے ایک جیسی جراب نہیں ڈھونڈ پائے گا مگر اسے ترتیب سے کر دوں تو جس لمحے جو چیز چاہے تو ہاتھ بڑھا کر لے سکتا ہے اور بس محبت ایسی ہی صوفی ہوتی ہے۔ اندر ترتیب لے آتی ہے جس لمحے جو لمحہ چاہو جی لو، محبت تو دلوں کے لیے جزائے خیر ہوتی ہے میری جان......'' سعد سالک اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

''یہ باتیں تیرے اندر کب آ گئیں؟ آج تک میں تو کبھی تجھے اس سمت سے دریافت نہیں کر سکا۔'' شہباز ملک مسکرایا پھر آہستگی سے بولا۔

''میرا اول محبت ہے بقول کسی دانا کے، محبت دنیا کے سمندر میں ایک جزیرے کی طرح ہے جس کے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے، کہیں سے آنے جانے کا کوئی سفر رستہ نہیں بناتا۔ اس کا کوئی کنارہ نہیں۔ ہر کنارہ پانی میں ڈوبا ہوا ایک اور حیرت کدے کا در ہے، اور بس۔ اس لیے ہم کسی کو محبت کی پرکھ پر تو کبھی سمجھ ہی نہیں سکتے۔ کسی کا دل دھڑکتا ہے اور سوچتا ہے۔ کسی کا سوچتا ہے اور دھڑکتا ہے اور کسی کا دل سوچنے اور دھڑکنے کا کام ایک ساتھ کرتا ہے اور یہ منزل محبت میں بہت مٹ کر فنا ہو کر ملتی ہے کہ بندہ دھڑکے بھی جائے سوچے بھی اور جیئے بھی، محبت حیرت ناکی ہے جو یہ سمجھ لیں وہ پھر کسی بات پر نہیں چونکتے۔''

سعد سالک نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے اس کے گیان کو اپنے اندر اتار لیا۔ اسے لگنے لگا تھا۔ وہ سعد سالک کے بجائے ایک برگد کا درخت تھا اور اس کے نیچے یکدم اس کا دل دھونی رما کر بیٹھ گیا تھا، تپسیا کرنے کے لیے۔

پھر جیسے جیسے وہ دائمہ کی محبت میں سیڑھیاں اترتا جاتا تھا، اس قدر اس کے گرد روشنی اور شے سے لاشے ہونے کا تصور بندھتا چلا جاتا تھا۔

انسان ساری زندگی خود کو لاشے سے شے ہونے کی جنگ میں کیا کیا کچھ نہیں گنوا دیتا۔ اپنے مقاصد، اپنی سچائی، ایمان، اپنی محبت۔

شہباز ملک اس کے اس سفر میں ہمزاد کی طرح ساتھ تھا تب ہی اس نے حیرت سے دیکھا تھا اسے اور پھر اس سے بھی حیرت سے پوچھا تھا۔

”تم نے دائمہ سے پوچھا، آج کل وہ کس کے ساتھ دکھی جاتی ہے۔“

”مجھے نہیں مگر تجھے تو جاننا چاہیے۔ تیری زندگی میں وہ ابتدا ہے اور انتہا تو نے اس کا نام کر رکھا ہے۔ لیکن پھر بھی تجھے جاننے کی لگن نہیں کہ وہ آج کل کسی کے ساتھ ہے۔“

”اس کی آنکھیں بہت...... چمکنے لگنے لگی ہیں۔“

وہ اس کے ٹھیک ہونے پر جاتے جاتے آخری سوچ کا پہلا زاویہ اس کے سامنے جگ سا پزل گیم کی طرح پھیلا گیا! اسے بھی لفظ سے لہجہ بنانے، لہجے سے پچوئشن ترتیب دینے میں داتوں پسینہ آ گیا مگر جب وہ تھک کر کہنے والا تھا تو وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

”ارمان احمد بہت اچھے انسان ہیں۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔“

وہ اس کی شکل دیکھتا رہ گیا، اس کی آنکھوں کی ساری دھنک، جیسے اس کے دل کی روشنی کو کھا گئی تھی اور کہیں شہباز ملک بولا تھا۔

”کسی ایک کی خوشی کسی دوسرے کے دل کا گہرا دکھ بھی ہو سکتی ہے مگر سعد! اپنے گہرے دکھ کی پرچھائیں سے ہمیں کسی کی زندگی فنا کرنے کا کوئی حق نہیں اس نے شام گئے شہباز ملک کو اس کی باتیں یاد دلائی تھیں۔

”یہ کسی اور کا دکھ یا تیری خوشی نہیں تھی پاگل! یہ تم دونوں کی خوشی تھی۔ محبت جب کسی ایک رشتے سے جوڑ دیتی ہے تو دوئی کہاں رہتی ہے۔ میری بات کو غلط سمجھتا ہے اور اسے آمنا صدقنا مانتا ہے۔ سعد سالک تیرا کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”تم نے تو ایم ایس سی کرنا تھا ناں۔ کچھ کر دکھانا تھا نا یہ شادی۔ یہ محبت؟“ وہ بات کو ترتیب دے رہا تھا یا شاید اسے کہنے کے لیے اس نے فری ہینڈ دیا تھا کہ اس تعلق کی نہج کیا ہے وہ خود اگل دے، دائمہ نے چور نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ پھر آہستگی سے بولی تھی۔

”ہم ابھی ایک دوسرے کو سمجھ رہے ہیں۔ سمیر کہہ رہے تھے۔ ہمیں کوئی فیصلہ کر لینے سے پہلے ایک دوسرے کو سمجھنا چاہیے۔“

”سمیر کا اس کہانی میں کیا ذکر......“

”اس نے ہی ارمان احمد سے ملوایا تھا۔ آپ کو تو پتا ہے، ہم ایک ہی کالج میں پڑھتے ہیں۔ ارمان احمد ان کے کلوز فرینڈ ہیں اور سمیر کہہ رہے تھے۔ وہ آپ کے بھی بہت اچھے دوست رہے ہیں۔“

”کون ارمان احمد؟ وہ ارمان احمد؟“

ایک لفظ سوال تھا دوسرے لہجے میں تاسف تھا۔ وہ شخص اپنے مقصد کے لیے کچھ بھی کر جانے کو جائز سمجھتا تھا اور شروع سے اس کی ارمان احمد سے نہیں بنی تھی۔

”مجھے لگتا ہے تم یہ سب بہت جلدی کر رہی ہو۔ تمہیں ابھی صرف پڑھنا ہے۔ تمہیں معلوم ہے ناں۔ تمہارے سارے خاندان میں لڑکیوں کی تعلیم کا گراف کتنا ہے، اگر تمہارے بابا نے سب سے ٹکر لے کر تمہیں اتنا آگے لے جانے کا خواب دیکھا ہے تو تم اس خواب کو اپنے خواب کے آگے رہن کیوں رکھ رہی ہو۔“

دائمہ نے اسے ان باتوں کے بعد کچھ اچھی نظروں سے نہیں دیکھا تھا پھر وہ اس کے ارد گرد ہوتا مگر اس نے

پھر کوئی ایسی بات نہیں کی عام معمول کی باتیں کرتی وہ بیماری سے ادھ موا تھا تو سمیر کی ان حرکتوں سے نالاں تھا مگر کس سے یہ بات بانٹتا۔ اس نے سوچا، بہت سوچا پھر امی سے کہنے کا سوچا ہی تھا اس نے اپنے پر قائم کیس یکدم اس پر الٹ دیا۔

”دیکھیے امی! یہ بظاہر تو بیمار ہے مگر اس کی حرکتیں آپ ملاحظہ فرمایئے۔“ اس کی آواز اتنی تیز ضرور تھی کہ باقی سب بھی اندر آئے تھے پھر بابا نے سب سے پہلے پوچھا تھا۔

”کیا بات کہنا چاہتے ہو؟“

سمیر سالک نے اس کی طرف دیکھا اور تیز لہجے میں بولا۔

”دائمہ کے گھر والوں سے ہمارے تعلقات کتنے اچھے ہیں، بالکل خاندانی مراسم ہیں مگر یہ لڑکا۔ امی وہ ارمان احمد ناں، اس لڑکے نے دائمہ کو اس لڑکے سے ملوا دیا اور دونوں کے لیے مواقع فراہم کیے۔ اب دیکھیے وہ لڑکی ارمان احمد کی محبت میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہے۔ گھر تک چھوڑنے کو تیار ہے صرف دو ما؛ میں امی اس نے کیا گل کھلایا ہے، اگر یہ یہاں رہتا ہوتا تو آپ لوگ تو سانس بھی نہیں لے سکتے تھے، سوچ سکتے ہیں کراچی میں آپ کے بیٹے کے نام کے کیسے چرچے ہوں گے۔“ بابا نے اسے پہلی بار شک سے دیکھا، اب تک کے اس کے رزلٹ ہمیشہ ان کو خود پر اعتبار دلاتے تھے کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو غلط جج کیا ہے مگر آج۔

امی نے سوپ کا پیالہ رکھ دیا تھا۔ ”میں نہیں مانتی میں نے آج تک اسے صرف پڑھائی سے ہٹ کر کسی سرگرمی میں نہیں دیکھا۔ اگر نصاب نہیں پڑھتا ہے تو صرف شاعری پڑھتا ہے اور شاعری پڑھنے والے تمہارے ابا کہتے ہیں حساس لوگ ہوتے ہیں۔“ سیدھی سادی، کم پڑھی لکھی ماں نے بیٹے کا عام سا تجزیہ کیا۔

وہ خالی ہاتھ کھڑا تھا امی نے چپکے سے دائمہ کو بلا بھیجا تھا۔ ارمان احمد کے نام پر اس کے چہرے کا جیسے رنگ اڑا تھا، اس نے ان کے دل سے دو ماہ پیدا ہونے والی محبت کا رنگ بھی پھیکا کر دیا تھا، انہوں نے پوری بات نہیں کریدی تھی بس اپنی طرف سے ایک نتیجہ نکالا تھا۔ سعد سالک ایک اچھا بیٹا نہیں ہے۔

اور وہ ایسے سوچتے وقت اس کی بیماری کا ٹائم پریڈ بھی بھول گئی کہ وہ اس حالت میں کیسے مواقع مہیا کر پاتا تھا، تب سمیر نے کہا تھا۔

”موبائل، بڑے بھیا یہ جو آپ نے اسے رابطے کے لیے موبائل دیا ہے ناں۔ یہ ہی اس فساد کی جڑ ہے، دونوں اس سے موبائل سے رابطے میں تھے، اور یہ دونوں کا راز دار بن کر ان کے لیے لوا سپاٹ تجویز کر رہا تھا۔“ بڑے بھیا بہت برے طریقے سے چڑے تھے۔ امی نے اس کے کمرے میں آنا چھوڑ دیا تھا، تب اچانک اس نے اپنے کپڑے بیگ میں رکھنے شروع کر دیے تھے۔

پھر وہ کمرے سے اپنی تصویر جو امی کے ساتھ کھنچی ہوئی تھی، دراز میں رکھ کر مڑا تھا تو سامنے سمیر سالک کھڑا تھا مگر اس کی مسکراہٹ میں پورا دل نہیں تھا۔

”کیا ملا تمہیں یہ سب کر کے......؟“ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ لیا۔

سمیر سالک اس کے سامنے بیٹھ گیا پھر آہستگی سے بولا۔ ”ایک تیر سے میں نے کئی شکار کھیلے ہیں تمہیں کیا پتا میں کتنا جیلس ہوں مگر جب لوگ تمہاری تعریف کرتے ہیں تو میرے سارے وجود میں آگ بھڑک اٹھتی ہے، پتا نہیں

کیا ہے تم میں، تم ایک فیصد کوشش کرتے ہو تو سو فیصد کامیابی تمہاری منتظر رہتی ہے۔ تمہاری طرف کوئی دیکھتا ہے اور اس کی آنکھ میں محبت ہو تو میرا دل چاہتا ہے میں اس کا دل تمہاری طرف سے اتنا برا کر دوں کہ پھر وہ چاہے بھی تو تمہیں اس محبت سے کبھی نہ دیکھے۔ تم بیمار ہوئے تو میری بچپن سے لے کر اب تک کی ساری کوشش ناکام ہونے لگی تھی، امی تم سے محبت کرنے لگی تھیں، بڑے بھیا، منجھلے بھیا سب کی نظروں میں نرمی آنے لگی تھی اور مجھے یہ پسند نہیں تھا، سو مجھے دائمہ کا گیم یاد آ گیا جو میں تم سے داؤ گھات کرنے کے لیے کب سے کھیل رہا تھا۔ دائمہ کو تم بہت شدت سے چاہتے تھے ناں اور مجھے ایک کہانی سوجھی، میں نے ارمان احمد کو درمیان میں لا کر کھڑا کر دیا، اس کا دل اس کی طرف موڑا اور پھر جو کچھ کل ہوا، وہ تمہارے سامنے ہے، اس طرح ایک تو تم سب کے دل سے گئے۔ دوسرے دائمہ کے دل میں گھر کرنے کا جو ایک ارمان تھا، وہ بھی اپنی موت آپ مر گیا، تیسرا یہ کہ ارمان احمد کتنا فلرٹی ہے میں جانتا ہوں سو مجھے معلوم ہے۔ اچھا وقت گزار کر وہ دائمہ کو جھٹک دے گا اور میں اس سے شادی کر لوں گا، اس کی بدنامی کو ایک اچھے دوست کی طرح سمیٹنے کے لیے آگے بڑھوں گا، سب کی نظروں میں مسیحا بن جاؤں گا، دائمہ آگے بھی تمہیں کوئی مقام نہیں دے گی، رہا میں تو میں اندرون خانہ باہر جانے کی کوشش کر رہا ہوں، امریکہ یا انگلینڈ، تعلیم میں اچھا ہوں سو بابا مجھ پر یہ رسک لیں گے۔ یعنی یہاں دائمہ کا نہیں ہوں گا کیونکہ مجھے باہر جا کر شادی کرنی ہے، مگر سوچو دائمہ جب یہاں میرے نام سے زندگی گزارے گی تو تم کتنی اذیت محسوس کرو گے۔ تم یہی دائمہ کی وجہ سے کبھی گھر واپس نہیں آؤ گے اور میں یہی چاہتا ہوں تم کبھی گھر نہ آؤ در بدر پھرو۔

اس نے ایک لفظ نہ کہا۔ خاموشی سے اپنی موت قبول کر لی۔ پھر ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اندر سے باہر جانا چاہتا تھا کہ گھر کے اندر نے اسے باہر جانے سے روک لینے کی ایک ہوک بھری۔

بڑے بھیا سرخ انگارہ آنکھیں لیے اس کے سامنے کھڑے تھے۔

"مت جاؤ۔ میں امی کو بتاتا ہوں اس کے کرتوت۔ یہ سمیر تو ہمارا بھائی کہلوانے کے لائق ہی نہیں ہے۔"

سمیر مالک نے یوں کندھے اچکائے جیسے اسے اس بات سے کوئی غرض ہی نہیں تھی، اگر وہ ایکسپوز ہو گیا تو کیا ہو گا۔ وہ رکا نہیں۔

"تم نہیں جاؤ گے۔" بڑے بھیا نے التجا کی۔

"کیا میں اس گھر میں کبھی آیا بھی تھا۔"

"ظلم کے ہوتے دیکھنا اور خاموشی سے سہہ جانا ایک اور ظلم ہے۔"

"مجھے اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ میں کیا ہوں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے یہ بھی میرا کوئی بہروپ ہو۔ کسی اور کے توسط سے آپ نے مجھے جانا پھر میری عمر میرے عمل تو سب رائیگاں گئے ناں؟ نہیں میں نہیں رک سکتا یہاں......"

پھر امی نے ہاتھ پکڑا بابا نے سمجھایا۔ منجھلے بھیا نے سمیٹنے کی کوشش کی مگر وہ ناراض ہو گیا تو مانا ہی نہیں، شہباز ملک کے پاس پہنچا تو اس نے اس کی باتوں کو جان کر سانس روک لی۔ "گھر چھوڑ آیا......"

"نہیں گھر نے مجھے نکال دیا، میں کیوں ایک ہلکے سے حسن ظن کا دھوکا دوں خود کو۔" اس نے بہت دل گرفتگی سے کہا۔ شہباز ملک نے ہاتھ تھام لیا۔ "محبت نے روکا تو تھا ناں......" وہ پھر سمت کی طرف لے آنا چاہتا تھا اور اس نے

اس کے ہاتھ جھٹک دیے تھے۔

"محبت نے مجھے جیسا ہو دیا ہوں کی بنیاد پر نہیں مانا میری گواہی مانگی اور میں اس بے اعتباری کو چاہوں بھی تو بھول نہیں سکتا، سب کو پتا تھا میں کیا ہوں، پھر بھی نظر سوال بن کر تو میرے چہرے پر رکی ناں، اور بس یہ سوال مجھ میں اسپارک کیے جا رہا ہے کہ سعد سالک بس اتنے ہی تھے تم اعتبار کے قابل۔ بس یہی کمایا تم نے اپنی حیاتی میں۔ کچھ سوال، بے اعتبار نظر اور شک......"

"تم اس وقت دل گرفتہ ہم پھر کبھی بات کریں گے۔" شہباز ملک نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور وہ دکھ سے بولا۔

"تم نے ٹھیک کہا تھا، بے حسی بہت اچھی چیز ہے انسان بے حس ہو جائے تو دل کو کسی بات پر دکھ نہیں ہوتا۔"

"ہاں مگر اہل دل کیا بے حس بن کر بھی اندر سے بے حس ہو سکتے ہیں۔"

"مجھے نہیں پتا مگر بس ایک بات جانتا ہوں، خودکشی کرنے سے بہتر ہے انسان بے حسی کی چادر تان لے۔"

شہباز ملک نے اس کا پھر سے کندھا تھپکا تھا۔

"او کے" سالک نے تشکر بھری نظر سے اسے دیکھا۔

کسی کو اپنی محبت اپنی خوش امیدی، اپنی زندگی اور اعتبار دینا آسان کام نہیں، شہباز ملک نے مشکل کام کیا تھا اور اب سعد سالک کو مشکل ترین کام کرنا تھا۔

رکی ہوئی زندگی نے ایک گہرا سانس کھینچا تھا جیسے سمندر میں اترنے سے پہلے تیراک ایک گہرا سانس لیتے ہیں۔ زندگی بہت بے وقعت ہو گئی تھی، وہ پڑھ تو رہا تھا مگر اب صرف پڑھ رہا تھا۔ اندر سے کچھ کر جانے کی امنگ جو تھی وہ کسی میلے میں شوخ چنچل بچے کی طرح انگلی چھڑا کر ایسی کھوئی تھی کہ دل کر ہی نہیں دیتی تھی۔ شہباز کچھ عرصے تو ایسا ہی رہا پھر ایک دن وہ اسے ایک اسپتال میں لے گیا۔

"تم زندہ ہو اور سمجھتے ہو مر گئے ہو اور یہ جانتے ہیں یہ مرنے والے ہیں مگر دیکھو کتنے دل سے زندہ ہیں۔"

سعد سالک نے ان کے چہرے دیکھے ان کی آنکھ میں آنسو رکے ہوئے تھے مگر ہونٹ ہنس رہے تھے۔ اس نے ایک لڑکی کو وہاں دیکھا اور ٹھہر گیا جیسے کوئی لمحہ ٹھہر جائے۔

"یہ لڑکی یہاں ایڈمٹ ہے اور ہر دن اسے چپکے سے چرا لے جاتا ہے بظاہر لگتا ہے کچھ دینے آیا ہے مگر حقیقت میں سب کچھ تھوڑا تھوڑا کر کے لے جا رہا ہے۔ اس کا اس کے خواب، اس کی تمنائیں، لفظ، کہانیاں، وقت محبت، تمہیں پتا ہے اس کی منگنی کو چار سال گزر گئے ہیں۔ چار سال میں چار صدیوں کے برابر خواب تھے، اس کی آنکھوں میں، تب اچانک اسے پتا چلا اسے کینسر ہے۔ اس کا فیانسی روز اس سے ملنے آتا ہے مگر تمہیں پتا ہے یہ اس کے آنے سے اس کے جانے کے قدم گنتی رہتی ہے۔"

شہباز ملک نے اسے ایک راہ دی تھی، وہ ہر ایک سے دوستی کرنے کا ماہر تھا اور اب وہ اس کی ناامیدی بے حسی سے بھی دوستی کرنا چاہتا تھا تاکہ چپکے سے اس کی ہتھیلی پر کوئی امید رکھ دے۔ سعد سالک پہلی بار اس کے پاس جا کر بیٹھا تھا۔

"کیا آپ یہ حق دیں گی کہ میں آپ کا نام جان سکوں۔" سامنے اصم وجود میں حرکت ہوئی۔

"وائمہ...... وائمہ نور......" ایک کرنٹ سا لگا تھا اس کے اندر۔ اس نام سے ہی تو وہ بھاگنا چاہتا تھا اور یہ نام

یہاں آ کر چپکے سے اس کے سامنے آن بیٹھا تھا۔

"آپ کا نام کیا ہے۔"

"سعد سالک......" اس نے تعارف مکمل کیا اور لڑکی نے اسے دیکھا۔

"آپ شہباز ملک کے دوست ہیں۔"

"وہ میرا دوست ہے اور مجھے نبھاتا رہتا ہے، ورنہ مجھے دوستی کرنا نہیں آتی۔

اس کے چہرے پر مسکان بکھر گئی۔ نباہ جانا ہر کسی کو نہیں آتا۔ لوگ خود سے ٹھیک طرح سے نہیں نبھا پاتے اور کسی بالکل الگ انسان سے نباہ جا! کمال کی بات ہے۔ آپ کا دوست تو بہت کمال کا انسان ہے۔"

"پتا نہیں کمال ہے یا نہیں مگر میں یقین رکھتا ہوں وہ انسان ہے، ایک بہت اچھا انسان۔"

وہ مسکرا دیا تھا اور یہ اتنے عرصے میں پہلی مسکراہٹ تھی۔

"آپ کے فیانسی کیا کرتے ہیں۔" وہ نام لینے سے ہچکچانے لگا تھا۔ دائمہ کا دکھ پھر سے اس کی زبان کی نوک کا ذائقہ تلخ کر دے اور اس نے مسکرا کر کہا تھا۔

"درد کا کاروبار کرتے ہیں......" اس نے استفہامی انداز میں دیکھا تو مسکرا کر بولی۔

"شاعر ہیں بہت اچھے شعر کہتے ہیں۔" مجھے ان کی شاعری بہت پسند ہے۔"

"کیا وہ یہ شاعری آپ پہ کرتے ہیں۔" دائمہ نور کی آنکھ کی کور میں کوئی حسرت سی آن جمی تھی۔

پھر اس نے نئے سرے سے سنبھالا لیا تھا۔" میں نے کہا تھا درد کا کاروبار کرتے ہیں۔ ناکام محبت کے قصے، ان کہی باتیں، ان کہے قصے پھر وہ سب مجھے سناتے ہیں۔ کہتے ہیں اس میں تم ہو تم میں خود کو ڈھونڈنے نکلتی ہوں تو کوئی اور قد بت سے سامنے آن بیٹھتی ہے، کتاب کا انتساب محبت کے نام ہے پر یہ محبت میرے نام نہیں ہے۔"

"مگر شہباز تو کہتا تھا، وہ دن رات آپ کے اردگرد چکر لگاتے ہیں۔" اس نے اس کی طرف دیکھا پھر نرمی سے بولی۔

"انہیں میری زندگی کی کم ہوتی ساعتیں میری طرف موڑ لائی ہیں آج کل وہ مجھ پر شاعری کر رہے ہیں میرے بعد ان کا دیوان ہاٹ سیل ہوگا۔ ہے ناں۔"

"وہ محبت کرتے ہیں تب ہی تو۔"

"وہ محبت کرتے نہیں ہیں تب ہی تو" اس نے اس کے فقرے کو پکڑا تھا۔

پھر دم لینے کو رکی تھی پھر آہستگی سے بولی تھی۔

"یہ شاعر لوگ، یہ دوہری زندگی گزارتے ہیں اپنی ایک الگ دنیا میں خوش رہتے ہیں۔ احساس کی بات کرتے کرتے احساس ہی گنوا آتے ہیں۔ جیسے کوئی کچھ رکھ کر کہیں بھول جائے اور کچھ اور ڈھونڈے تو پہلی والی بھولی ہوئی چیز سے انگلیاں ٹکرا جائیں یہ جھوٹے لمس بانٹتے ہیں، کسی کی رکھی ہوئی چیز کسی اور کی جھولی میں ڈالتے ہیں اور اتنے یقین سے کہ کبھی کبھی انہیں خود سے بھی نبھانا یا ٹوٹنا یاد نہیں رہتا۔" وہ رکی اور اس کی طرف مڑ کر بولی۔

"آپ کو پتا ہے، ہم جس سے محبت کرتے ہیں اس کا سکھ بھی چھپا کر رکھتے ہیں کہ زمانے کی نظر نہ لگ جائے دکھ تو اور چھپا کر رکھتے ہیں کہ زمانہ ہمارے دل کی سادگی پر نہ ہنس پڑے کہ محبت نے کیا دام میں لا کر مارا ہے مگر یہ شاعر لوگ یہ سب لکھنے والے یہ سب فارسیل" کر دیتے ہیں "فارسیل" کا مطلب پتا ہے؟"

سعد سالک نے زندگی کو ایک سے زاویے سے دیکھا تھا۔

یہ لڑکی کتنے دل سے محبت نباہ رہی ہے مگر اسے بت نے غلط زاویے سے لوٹا تھا

پھر وہ روز آنے لگا یہاں! اس کے آنے کے ڈھائی مہینے بعد کی بات تھی، جب وہ اپنی کنزور انگلی میں انگوٹھی گھمائے جا رہی تھی، وہ کسی تکلیف میں تھی مگر کہنا نہیں چاہتی تھی۔

"کوئی ان کہی تم میں اٹک گئی؟" وہ اس کے قریب ہو گیا اور اس کی آنکھ کی کور گیلی ہونے لگی۔

"ان کہی میرے اندر اٹک گئی ہے کسی نویلی دلہن کی ناراضی جیسی آ کر بیٹھ گئی ہے۔ میں اس ان کہی کو نکال دوں تو دل کی بے کلی سوا ہو جاتی ہے۔ نہ نکالوں تو دل شعلہ دے کر جل اٹھتا ہے۔"

"ہوا کیا ہے دائمہ....." اس نے نام لیا پہلی بار اور وہ بلک اٹھی۔

"کل ندیم آئے تھے۔ میری خوبصورتی پر غزل کہہ رہے تھے، انہوں نے کہا میں ان کی تازہ غزل جیسی ہوں میں نے ان کے جانے کے بعد آئینہ دیکھا اور غزل جو میرے دل میں کھل کھلا رہی تھی۔ ایک دم سے رونے بلکنے لگی، ندیم کی آنکھیں بہت چمکیلی تھی، بہت زیادہ۔"

وہ نافہم انداز میں اسے دیکھ رہا تھا اور اس کے لب گنگنا رہے تھے۔

اپنے غم سے کہو

ہر وقت میرے ساتھ رہے

اک احسان کرو

اس کو مسلسل کر دو

"دائمہ! آپ کیا کہنا چاہتی ہو میں سمجھ نہیں پا رہا۔" اس نے بے بسی سے اسے دیکھا اور دائمہ نور بے چارگی سے ہنسی۔

"اس نے میرے مرنے کا انتظار بھی نہیں کیا، سعد سالک کسی اور چہرے کی روشنی پی لی، میں ہوں اس کا نام دل کو سونپا تو آج تک اپنے دل میں اس کی محبت کی الجھن کی طرح خود کو محسوس کیا، میرے دل پر میرا اختیار نہیں اس کی حکومت ہے اور وہ میرے جانے کا انتظار نہیں کر سکا۔

"تمہیں لگتا ہے زندہ ہوں۔" وہ بے ربط ہوئی، وہ کچھ کہہ بھی نہیں پایا تھا کہ اس کے لب ملے۔

"یہ ہم دل والوں کا قرض محبت پر کتنا چڑھتا جا رہا ہے نا، کتنا قرض یہ محبت...... چکا پائے گی ہمارا۔" یہ کہتی ہے چپکے سے میں ہوں۔" اور دل چل پڑتا ہے اس کے پیچھے مگر یہ، یہ کیا ہے ہمیں۔ کاش وہ دل نہ دیتا ہمیں۔" اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔

پھر بے چارگی سے بولی۔" مگر کم بخت دل، دل کے علاوہ دنیا لے کر خوش رہ سکتا تھا۔

مگر اہل دل جتنا جلدی مایوس ہوتے ہیں، اتنی جلدی ہی کوئی امید جینے کے لیے ڈھونڈ نکال لیتے ہیں اور جو بہت زود رنج خودکشی اور بے حسی میں اٹک جائیں۔ میں کہتی ہوں بہتر ہے ایک امکان کو باقی رہنے دینا چاہیے، بے حسی کبھی بھی دھڑکتا دل بن سکتی ہے۔ خودکشی موت ہے۔ انت انجام بھری موت اور اہل دل مر کے بھی کبھی مرتے نہیں۔ مایوسیاں اہل دل کا شیوہ نہیں۔"

"مگر ابھی تم ہی تو تڑپ کر رو دی تھیں۔" وہ ہنس پڑی اور بولی۔

"اور میں ہی اب کھل کھلا کر ہنس رہی ہوں۔"

"تم بھی خود کو زندگی کے حوالے کر دو، بس مضبوطی سے اپنے دل کا دروازہ مت بند کرو۔ کیا پتا کسی دن تمہارے دل کی چوکھٹ کو تمہارے دل کی خوشی کے قدم راستہ بھول بیٹھیں۔ ادھر دیکھو یہاں وقت نہیں ہے پھر بھی امید ہے، تمہارے پاس وقت ہے تو امید پر خسارہ کیونکر۔" وہ اس دن ایک نئے طریقے سے سوچ کا زاویہ لے کر اٹھا تھا اور پھر ایک دن وہ گیا تو اسپتال کی بینچ خالی پڑی تھی۔ دائمہ نور مر گئی تھی۔ شہباز ملک اس کے ساتھ تھا۔

پھر اسی بینچ پر بیٹھ کر بولا تھا۔

"کل میں اس سے ملنے آیا تو بے دم سی بستر پر بکھری پڑی تھی، جو اس کے گرد شکستوں کے جال تھے۔ وہ ٹوٹ رہے تھے ایک ایک کر کے۔ جال کی ہر گرہ میں اس کی سانس اٹکی ہوئی تھی۔

کل اس نے ہر امکان توڑ دیا اس نے ندیم اور انیلہ کے ایک ساتھ دیکھنے کے قصے کو پہلی بار آخری دکھ کی طرح سنا تھا اس کی دوست نے جانے اس سے محبت کا یہ امکان کیوں چھینا۔ دوستی میں دشمنی کر بیٹھی اور وہ خود سے محبت سے دوستی نبھانے میں جان پر کھیل گئی۔ میں سامنے تھا جب اس نے ندیم کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

"تمہیں دکھ اچھے لگتے ہیں نا میرے شاعر۔ تو لو آج میں تمہیں ابدی دکھ دان کرتی ہوں۔"

میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ ندیم سکتے کی کیفیت میں تھا۔ تب اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

"تم اب جا سکتے ہو۔ میں نے تمہیں آزاد کیا۔"

اور پھر میں اس سے کچھ نہیں کہہ پایا اس کے سامنے بیٹھا تو اس نے اشارہ کیا۔

"وہ ڈائری دو میں آج تمہیں ایک نظم سناتی ہوں۔" میں نے ڈائری پاس کی اور اس نے ایک مڑا ہوا صفحہ پاس کیا۔

"نظم"

کہتے ہیں گھر میں اچانک
ایسی آگ بھڑک اٹھے
جو چشم زدن میں
ہر اک شے کو اپنی لپیٹ میں لے لے
آگ بجھانا مشکل ہو اور
گھر کا اثاثہ اس سے بچانا ناممکن تو
ایک ہی رستہ رہ جاتا ہے

جو بچتا ہے وہی لے آؤ
گھر کی سب سے قیمتی چیزیں ہاتھ میں لو اور
اس سے دور نکل جاؤ
میرے دل میں بھی ایسی ہی آگ لگی تھی
میں نے جلدی جلدی آنکھ میں تیرتے
بجھتے خواب سمیٹے
تیری یاد کے ٹکڑے دھیان میں رکھے
اور اس آگ میں دل کو جلتا چھوڑ کے
دور نکل آیا ہوں
بولو......
میں نے ٹھیک کیا ہے نا؟

☆

سمیر سالک ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ دائمہ نے ارمان احمد سے شادی کر لی تھی اور وہ ایک بار پھر دربدر تھا۔ ایم کام کے بعد وہ ایک کمپنی میں فنانس منیجر بن گیا تھا۔ شہباز مالک اور وہ اپنی اپنی زندگی کو کھوج رہے تھے دونوں کی وہی روٹین لائف تھی۔

شام میں کسی کیفے میں ملتے تو خوب باتیں کرتے۔ سعد سالک اندر کی خاموشی سے بچنے کے لیے باہر شور کرتا رہتا اور شہباز ملک اس کے ساتھ لوگوں پر فقرے چست کرتے سلوگن بناتے اور ایک دن ایسی ہی بات چیت میں تیسرا شخص آ گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اُن سے میل ملاقات بڑھاتا رہا یہاں تک کے ایک دن وہ انہیں منا، سمجھا کر اپنے دوست کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں لے گیا۔ "یہ علی ہیں۔ بہت اچھے باس ہیں۔" اس نے تینتیس سال کے خوبرو علی کو دیکھا اور شہباز ملک سے چپکے سے بولا۔

"یہ تو ایک بہترین ماڈل بن سکتے ہیں۔" اور شہباز ملک نے ایک نظر اس پر ڈال کر کہا۔

"میرے یار کبھی آئینے کو میری نظر سے دیکھے تو تجھے پتا چلے کتنا خوبرو ہے تو۔" وہ ہنس پڑا۔

اور اسی وقت علی جو کسی کو رخصت کرنے باہر گئے تھے اندر داخل ہوتے نظر آئے تھے۔

"پھر مسٹر سعد سالک! آپ جوائن کر رہے ہیں ہمیں۔"

"سر مجھے اس فیلڈ کا ذرا بھی پتا نہیں۔"

"تو بتا ہم دیں گے نا، آپ یونہی وزٹ پر آ جایا کیجیے۔"

"کیا آپ ہر کسی کے لیے اسی طرح آنکھیں اور دل فرش راہ کر دیا کرتے ہیں۔"

علی رضوی ہنس پڑے۔ "تو سعد سالک لیکن کاشف خان ایسا شخص ہے جس پر میں آنکھ بند کر کے یقین کرتا ہوں۔"

"بالکل میری طرح۔ مجھے بھی سعد سالک ایسا ہی ہے۔" شہباز ملک نے ٹکڑا لگایا اور سعد سالک نے بے تکلفی

سے کہا۔

"مجھے منظور ہے سر! لیکن ہم شام ہی کو جوائن کر سکتے ہیں آپ کو۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔ آپ پہلے کام کرنے کا طریقہ دیکھیے پھر اپنا وے آف تھنکنگ مجھے سمجھائیے۔"

"جی بالکل سر! فکر مت کریں۔"

شہباز ملک نے ایک کپ ختم کر دیا تھا۔ علی دلچسپ نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔ سعد سالک نے آگے بڑھ کر چائے سے اس کا کپ لبریز کیا تھا۔

پھر وہ روز ان کے دفتر آنے لگے تھے، شہباز ملک کا زیادہ وقت فی میل ورکرز کے ساتھ گزرتا اور سعد سالک کام کی نوعیت کو دیکھتا، وہیں پہلی بار اسے تیتی آرا ملی وہ اس ایجنسی میں آئیڈیا سپروائزر تھیں۔

ہر اسائنمنٹ سب سے پہلے اس کی ٹیبل پر ہی جاتا تھا۔ جہاں سے ایڈ کے آئیڈیے پر بات چلتی پھر علی اپرو کر دیتے تو اس کمپنی کے سامنے آئیڈیا پریزنٹیشن ہوتی وہاں سے گرین سگنل ملتا تو آئیڈیا پروڈکشن ہاؤس تک پہنچتا۔

اس کے پاس پہلا اسائنمنٹ آیا تھا۔ چاکلیٹ کا اشتہار تھا اور اسے جملہ سوچنا تھا۔ شہباز ملک کافی کا کپ لیے بیٹھا تھا سامنے لکھے ہوئے ون لائن آئیڈیا کو پڑھ رہا تھا مگر ابھی پورا آئیڈیا گونگا تھا لفظ اسے دینے تھے۔

کئی صفحے سیاہ گئے تھے ڈسٹ بن میں گولہ بنا کر پھینکے تھے شہباز ملک نے ون لائن آئیڈیا کو دیکھا اور اسے تاسف سے دیکھ کر بولا۔

"تجھے پتا ہے نا کاغذ کتنا مہنگا ہو گیا ہے۔ ایک جملہ نہیں سوجھ رہا تجھے۔ محبت کی ہے نا تو نے تو۔"

"ہاں تو یہاں محبت کا ذکر کہاں ہے......" وہ خفگی سے مڑا۔" آئیڈیے کی طرف اشارہ کیا۔

"بیٹا! سب محبت کا پھیلاؤ ہے۔ ادھر دیکھ، میں کافی کیوں نہیں پی رہا ہوں۔"

"کیوں کہ میں مصروف ہوں۔"

"تو میں جو انتظار کر رہا ہوں اس میں کون سا جذبہ ہے۔"

"ظاہر ہے محبت۔"

"بالکل درست۔ ادھر دیکھ کافی کا کپ ہمیشہ کسی دوست کے ساتھ دینے میں مزہ آتا ہے نا۔"

"سو......" وہ سوالیہ ہوا۔

"سو یہ چاکلیٹ بھی چھین جھپٹ کے کھانے میں مزہ آتا ہے نا۔"

"ہاں......" وہ ہنس پڑا اور اس نے لکھا۔

"دوستی کی طرح میٹھی۔ دیر تک آپ کو لطف دے۔ ذائقہ بڑھائے زندگی کا۔"

"ذائقہ بڑھائے زندگی کا۔"

ایک فقرہ اس کے قلم سے لپٹ گیا تھا۔ علی رمزی نے اسے سراہا تھا سعد سالک نے تیتی آرا کے آئیڈیے کو بالکل بدل دیا تھا پہلی تیتی آرا نے دونوں کو غور سے دیکھا۔

پہلی بار اس کے آئیڈیے کو نظر انداز کیا گیا تھا یہاں تک کہ بینک کا اشتہار انہیں ملا۔

وہ آئیڈیا لکھ لکھ کر کاغذ پھینک رہی تھی۔ ڈسٹ بن میں جب اچانک شہباز ملک اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہوا۔

"پہلا اسٹیپ ٹھیک لیا تھا باقی سب بے کار ہے۔"

اس نے واضح شکل بھی بنائی اور وہ اس کے سر ہو گئی۔

"کیا برائی ہے اس ون لائن آئیڈیے میں۔" حالانکہ وہ خود اس سے زیادہ مطمئن نہیں تھی مگر پھر بھی اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔

"لڑائی اور غصہ سے ہمیشہ وہ صلاحیتیں بھی ضائع ہو جاتی ہیں، جو بھولے بھٹکے آپ جیسے لوگوں کو مل جائیں۔"

"آپ ایسا کہتے ہیں۔" وہ چڑ گئی اور وہ مسکرانے لگا۔

"اس لیے کہ آپ مجھے اچھی لگتی ہیں اور میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ جلبلائی اور وہ کندھے اچکا کر باہر نکل گیا، پھر سعد سالک کے روم میں بیٹھ کر کچھ لکھتا رہا۔

"کیا کر رہا ہے۔" سعد سالک اس کے پاس آ کر بیٹھا مگر وہ اٹھ گیا۔ "کافی منگوا میں پندرہ منٹ میں آتا ہوں۔"

وہ باہر نکلا اور علی رمزی اس کا آئیڈیا پڑھ رہے تھے۔ بینک اپنے کریڈٹ کارڈ کو متعارف کروا رہا تھا۔ شہباز ملک نے دوستانہ ماحول دیا تھا، دو فرینڈ 5 اسٹار ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے کہ اچانک بل پے کرتے وقت لڑکے کو پے منٹ میں کمی درپیش ہوتی ہے۔ اچانک اسی وقت اس کا ایک اور پرانا دوست آ جاتا ہے اور وہ کارڈ ٹیبل پر ڈالتا ہے۔ کیمرہ کلوز لیتا ہے اور وہ کہتا ہے شکریہ اور بیک گراؤنڈ میں آواز سنائی دیتی ہے "آپ کی پرانی دوستی کی طرح دیر تک چلے۔ دور تک چلے۔" علی رمزی کو آئیڈیا پسند آیا تھا تب اس نے سارا کریڈٹ گیتی آرا کے نام کر دیا۔

"دیکھیے نا سر! میں بھی یہی کہہ رہا تھا مگر گیتی صاحبہ اس آئیڈیا کو بھی ڈسٹ بن میں پھینک رہی تھیں۔"

اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سن لی تھی، مگر ان سنا کر کے اس کا کیس لڑ رہا تھا، تب علی رمزی نے اسے دیکھ کے کہا تھا۔

"گڈ گیتی! اچھا آئیڈیا ہے یہ، اس پر مزید کام کرو۔" وہ کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے والی تھی مگر خاموش رہ گئی پھر دونوں باہر نکلے تو اس نے جھنجلا کر کہا۔

"اتنی کارکردگی دکھانے کا مقصد کیا ہے؟"

"دوستی۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ گیتی نے ناک سکوڑ لی۔

"میں اور آپ سے دوستی کروں گی۔ ناممکن۔" لیکن ایک ہفتے بعد وہ ایک ساتھ لنچ کر رہے تھے اور شہباز ملک اسے اس کی بات یاد دلا رہا تھا، وہ شرمندہ نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی جب سعد سعد سالک نے نرم لہجے میں کہا۔

"ہماری دوستی میں سوری، شرمندگی عذر بہانے نہیں ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے غلط بیانی بھی نہیں کرتے جو ٹھیک ہوتا ہے۔ سچ ہوتا ہے وہ کہتے ہیں سو کسی تیسرے کو آج تک موقع نہیں ملا کہ ہمارے درمیان غلط فہمی ڈال سکے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر یہ دوستی پروان چڑھتی رہی۔ دھیرے دھیرے علی رمزی ان دونوں پر آنکھ بند کر کے یقین کرنے لگے یہاں تک کہ پانچ سال بعد شہباز ملک نے خود علی رمزی کو اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے افتتاح کے لیے بلوایا۔

"مجھے یقین ہے راستہ الگ ہونے سے ہمارے دل الگ نہیں ہوں گے۔"

"آپ نے ٹھیک کہا سر! جو ہمارا ہے وہ آپ کا ہے اور جو آپ کا ہے وہ ہمارا ہی ہے۔" اس نے خاص گیتی آرا کی طرف دیکھ کر کہا۔ علی رمزی نے بات نوٹ کی اور ہنس پڑے پھر کھانے میں وہ دونوں ایک جگہ ملے تو انہوں نے بھرپور نظر ڈال کر پوچھا۔

"محبت کرتے ہو گیتی سے؟"

اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا پھر سر جھکا کر بولا میرا دوست ہے نا سعد سالک۔ وہ چپکے چپکے اسے پسند کرنے لگا ہے، جب گیتی اس کے قریب ہو تو اس کی آنکھوں کی چمک الاماں مگر وہ پاگل اس جذبے کو رد کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اسے لگتا ہے محبت اس کے لیے نہیں بنی ہے۔"

"بے وقوفی کی حد تک سادہ ہے سعد۔" رائے دی علی رمزی نے۔

"نہیں سر! سادہ نہیں ہے نہ ہی بے وقوف۔ بس پہلے حادثے سے ابھی تک سنبھلا نہیں ہے۔ اسے لگتا ہے محبت پھر سے اسے توڑ چھوڑ کے نہ چلی جائے۔" شہباز ملک نے اس کی ذات کا دفاع کیا اور علی رمزی نے کہا۔

"لیکن اگر سعد سالک اس کا رشتہ چاہے گا تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" شہباز نے پہلی بار چونک کر دیکھا تھا۔

"سر! آپ کہنا چاہتے ہیں کہ......"

"ہاں میں کہنا چاہتا ہوں، مجھے گیتی کا رشتہ مانگنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ وہ میری بھتیجی ہے۔"

"تب ہی اتنی ساحر ہے۔" شہباز ملک نے یہ بات دل میں سوچی مگر کہی نہیں، پھر شہباز ملک نے یہ بات سعد سالک سے کی تو وہ پہلی بار گرم ہوا۔

"مجھے فی الحال شادی نہیں کرنی۔ میں ابھی بہت مصروف ہوں۔"

"لیکن منگنی کر لے۔ اچھے دل مل جائیں تو کھونا بے وقوفی ہے انہیں......" اس نے سمجھایا۔ سعد سالک نے اس کی طرف دیکھا پھر آہستگی سے بولا۔

"جو دل صرف میرا ہے وہ ہزار سرد، گرم جھیل کر بھی میرا رہے گا اور جو میرا نہیں تو بار بار چھوڑ کے جانے والے دل کی میرے دل کو کوئی ضرورت نہیں۔"

پھر وہ سنجیدگی سے کام میں لگ گیا تھا۔ گیتی اس عرصے میں ایک پروڈکشن کے اسپیشل کورس کے لیے باہر چلی گئی تھی۔ علی رمزی سے ان کی ملاقاتیں کم ہو گئی تھیں، وہ صرف کام میں مصروف ہو گیا تھا کہ اتنے اچانک پرانے زخم پھر سے ادھڑ گئے تھے۔

☆

"مجھے پتا تھا تو یہیں ہوگا۔" اسے پشت سے آواز سنائی دی شہباز ملک ہراساں و پریشان کھڑا تھا، یہ شخص بھی تو ہے۔ میں اسے کیوں ستاتا ہوں اپنی جذباتیت سے وہ یکدم پتھروں سے اٹھ کر اوپر کی سیڑھیاں چڑھنے لگا، پینٹ کو فولڈ کیا تھا اب وہ پینٹ کو نیچے کر رہا تھا۔

"کیا ملتا ہے مجھے ستا کر تجھے۔"

"پتا نہیں۔" وہ اس سے کچھ اور کہے بغیر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

"کہاں جا رہا ہے اب۔" وہ اپنی کار کی طرف دوڑا تھا۔

"گھر......" اس نے اپنی گاڑی اس کے پیچھے لگا دی تھی پھر دونوں ایک ساتھ گھر میں داخل ہوئے تھے۔ پچھلے آٹھ نو سال سے وہ ایک ساتھ ہی رہ رہے تھے، سعد سالک ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے گھر نہیں جاتا تھا۔ امی بابا، بڑے بھیا منجھلے بھیا اپنے بچوں کے ساتھ اس سے یہاں ملنے آ جاتے تھے امی جب بھی اسے چھوڑ کر جاتی تھیں تو خوب رویا کرتی تھیں، مگر وہ اب کسی بھی طرح کا اثر نہیں لیتا تھا۔ لیکن شہباز ملک جانتا تھا کہ الجھنیں اس کے اندر کیسے پتھر باندھ کر بیٹھ گئی ہیں۔ وہ محض اٹھائیس برس میں بلڈ پریشر کی ٹیبلٹ لینے لگا تھا۔

"کھانا کھاؤ گے؟" وہ صوفے پر گم صم بیٹھا تھا، جب شہباز ملک نے سوال کیا تھا۔ وہ خالی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ یہ شہباز ملک نے بنائی تھی ایک ہی جسم پر دو چہرے تھے ایک بے حد حسین اور دوسرا بے حد کریہہ کیپشن لکھا تھا زندگی۔"

"کیا دیکھ رہے ہو، مجھے معلوم ہے بہت اچھی تصویر ہے یہ۔" اس نے خالی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا اور بہت غیر متوقع سوال کیا تھا۔

"مرتے وقت بہت تکلیف ہوتی ہے نا شاہ......" شہباز تیر کی طرح اس کی قریب آن بیٹھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" وہ ہنس پڑا پھر بے بسی سے بولا۔

"مگر شاہ مرتے وقت جو تکلیف ہوتی ہے بس ایک بار ہوتی ہے نا مگر زندگی۔ یہ تو روز روز مرنے کا نام ہے یار......"

"پاگل مت ہو، زندگی جینے کا نام ہے اور جیون میں ابھی سب کچھ ہے ادھر دیکھو کیا میں مر گیا ہوں۔"

"اللہ نہ کرے شاہ تم ہو تب ہی تو زندگی ہے ورنہ کب کا ساتھ چھوڑ چکا ہوتا اس زندگی کا۔" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا پھر ایک آنسو ٹپکا پھر دوسرا اور دوسرے لمحے وہ بے تحاشا رو رہا تھا۔

"واثمہ کو واقعی محبت کرنی نہیں آتی، اچھا ہوا زندگی نے اس کو میرا ساتھ نہیں کیا محبت تو آباد گھر کا نام ہے جہاں کے لیے قدم خود اٹھیں۔ گھر خود یاد آتے انسان خود کو روک نہیں پائے مگر واثمہ اس کے لیے تو گھر صرف آسائشات کا نام ہے۔

وہ بے وقوف ہے، کچھ لوگ ساری زندگی سویٹ سکسٹین پھلانگ نہیں پاتے بوڑھے ہو کر مر جاتے ہیں مگر سطحی چیزوں سے آگے دیکھ نہیں پاتے۔ ادھر دیکھ کسی اور کے جرم کی سزا خود کو کیوں دے رہا ہے۔ وہ اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹا ہوا تھا، پہلی بار اس نے آنکھ کھول کر دیکھا تھا اسے۔

"زندگی میں ایک دوست ہو وہ بھی تجھ جیسا تو کوئی بھی جنگ جیتی جا سکتی ہے۔" سعد سالک نے اس کی پیشانی چومی تھی۔

"کچھ پکایا ہے یا نہیں...... بہت بھوک لگی ہے۔"

"پکانا کون سا مشکل ہے، دیکھتا ہوں کچھ۔" سعد سالک کو باہر کا کھانا اور ملازم کے ہاتھ کا کھانا دونوں ہی ناپسند تھے اس لیے شہباز ملک ہی کو یہ اضافی ذمہ داری اٹھانی پڑتی عموماً مگر اس وقت دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ اس نے جلدی میں اسپگیٹی بنا لیے تھے۔

وہ دونوں ایک ساتھ کھانے کا لطف لے رہے تھے جب دیسی مسالوں میں بنی اسپگیٹی کی وجہ سے سوں سوں کرتے ہوئے اسنے کہا تھا، کتنی مرتبہ کہا ہے مت ڈالا کر اتنی مرچیں۔ السر ہو جائے گا مگر سنتا ہی نہیں ہے۔ وہ ہنس پڑا۔

"ایک تو تیرے یہ شوہرانہ انداز مس کرتا ہوں اگر اسپائسی نہ پکاؤں دوسرے مجھے چٹ پٹے کھانے بہت پسند ہیں۔"

"ہاں ہاں۔ جب السر کی وجہ سے مرچیں بالکل بند ہو جائیں گی نا تب سمجھ آئے گی۔"

"کوئی نہیں ہوتا یار! مزہ نہ خراب کر کھانے کا۔" وہ تندہی سے کھانے میں لگا ہوا تھا، جب اس نے پوچھا تھا۔

"آج کے انٹرویوز کا کیا ہوا۔"

"دھڑن تختہ۔" اس نے ڈش میں سے مزید پلیٹ میں اسپگیٹی ڈالی۔

"بتا ناں انٹرویو کا کیا ہوا۔ کوئی پسند آئی تجھے۔"

"ہاں کئی آئیں مگر شادی صرف ایک سے کی جا سکتی ہے سو میں نے سب کو ریجیکٹ کر دیا۔"

"بکواس نہیں۔ کام کی بات کر۔" وہ اب پانی پی رہا تھا۔

"بتاتا ہوں، پہلے برتن دھولوں۔" وہ سنک پر برتن رکھ کر دھونے کی تیاریوں میں تھا جب سعد سالک نے فائل اٹھائی تھی۔

"مجھے مل گئی ہے فائل۔ تو تو نے اسے سلیکٹ کیا ہے۔"

وہ بایوڈیٹا پڑھنے لگا۔

"باقی تو ٹھیک ہے مگر یار! اس کے پاس تجربہ نہیں ہے۔"

"تو ہمارے پاس تجربہ تھا، جب ہم نے علی سر کو جوائن کیا تھا......" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کہتا تو ٹھیک ہے مگر کوئی تو وجہ ہوگی تجھے اس لڑکی کو سلیکٹ کرنے کی۔"

"سیدھی سی بات ہے، مجھے وہ لڑکیوں کا سعد سالک لگتی ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی......" وہ برتنوں کو دھو کر خشک کر رہا تھا۔ سعد سالک اس کام میں اس کی مدد کر رہا تھا۔

"سوچتا ہوں اگر تم میری زندگی میں نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔"

"مگر میں یہ نہیں سوچتا کیونکہ مجھے تم جیسے اکل کھرے انسان سے ملنے کی توقع ازل سے تھی۔"

"وہ کیسے......؟" اس نے تحیر سے دیکھا اور وہ ہنس پڑا۔

"سیدھی سی بات ہے، میرے ستارے ہمیشہ گردش میں جو رہتے ہیں۔"

"کیا بکتا ہے......" اس نے اس کا کان کھینچا اور وہ ہنسنے لگا۔

مونس دوسری صبح تیار ہو رہی تھی، جب بھابی علینہ نے اسے پکارا تھا۔

"اپنے بھیا کے لیے بھی ناشتہ بنا لینا مونس!" وہ جمائیاں لے رہی تھیں۔

بھیا ٹی بیگ کی چائے پسند کرتے تھے۔ اس لیے اس نے پانی چھوٹے تھرموس میں کچھ ٹھنڈا کر کے انڈیلا تھا۔ توس اچھی طرح سینک کر اس نے ایک ہاف بوائل انڈا پلیٹ میں سجایا تھا۔ بڑے بھیا اخبار پڑھ رہے تھے، جب اس نے ناشتہ ان کے سامنے رکھا۔

"ارے تم..... علینہ کہاں ہے.....؟" بھیا نے اخبار تہہ کر کے رکھ دیا تھا، وہ چائے لے کر ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

"کہاں جا رہی ہو، اتنی صبح ہی صبح یونیورسٹی.....؟"

"نہیں بھیا! میں نے ایڈورٹائزنگ ایجنسی جوائن کر لی ہے۔"

"کیا؟" بڑے بھیا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

"یہ ایک دم نئے سرے سے کیا سوجھی آپ کو....."

بڑے بھیا کا انداز اچھا نہیں تھا اور اسے معلوم تھا، یہ ایک فطری بات تھی۔ پاپا کو فالج ہونے کے بعد دس سال سے وہ ہی گھر کو سنبھال رہے تھے، وہ پرائمری اسٹینڈرڈ میں تھی، جب علینہ بھابی گھر آئی تھیں، بڑے بھیا پہلے جز وقتی ضروریات پوری کرتے تھے پھر کل وقتی ان پر ہی ذمہ داریاں آن پڑیں اور اب.....

"میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے یہ نوکری کیوں؟ کیا آپ کو لگتا ہے میں اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کر پا رہا ہوں۔"

"نہیں بھیا! میں بس دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھ میں کوئی صلاحیت ہے بھی یا نہیں اور پھر اس ایجنسی میں جنید بھی تو ہے۔ آپ تو جانتے ہیں اسے....."

بڑے بھیا کچھ نہیں بولے تھے مگر ان کے تاثرات بہت خراب تھے، وہ اٹھ گئی تھی پھر اس مہینے کی پاکٹ منی کے لیے وہ ان کے کمرے کے سامنے پہنچی تھی، جب اس نے علینہ بھابی کو کہتے سنا تھا۔

"آپ ہی بتایئے جب وہ اتنا ظفر سامنے ہو تو مونس کسی کی کوئی بات سنتی ہے۔ اس لڑکی نے ہی بگاڑا ہے، ہماری مونس کو۔ اب پتا نہیں کیسا دفتر ہے۔ کیسے لوگ ہیں اور یہ جنید کتنا جانتے ہیں ہم اسے۔ صرف مونس کے ساتھ کالج اور یونیورسٹی ہی پڑھا ہے ناں۔"

"اپنی مونس سمجھدار ہے علینہ۔" بڑے بھیا کا کمزور یقین گونجا۔ "کیوں" وہ وہیں سے مڑ گئی اور چھوٹے بھیا کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔

"مونس! آ جاؤ جتنے پیسے چاہئیں لے لو آ کر۔"

بھرائی ہوئی آواز سنائی دی اس نے دروازہ کھولا۔ والٹ سے پانچ سو نکالے پھر آہستگی سے بولی۔

"پانچ سو لے رہی ہوں بھائی۔"

"لے لو یار! تمہارے لیے ہی کماتا ہوں....." مونس مسکرانے لگی۔

وہ جانتی تھی کل رات ان کا بینڈ دیر تک پروگرام پیش کرتا رہا تھا سو ان کی نیند ابھی کچی ہی تھی۔

زین بھائی اس کے فیورٹ بھائی تھے۔ وہ کل چار بہن بھائی تھے دو بھائی دو بہنیں لیکن ان کا گھر چونکہ ایک جوائنٹ فیملی سسٹم تھا اس لیے بہت سے لوگ اور بہت سی باتیں ہمیشہ ان کے گھر کا حصہ بنی چکراتی رہتی تھیں۔ کوئی بھی کام ہوتا، پہلے سارے گھر میں نشر ہوتا۔ اس میں عذاب اور ثواب نکالے جاتے پھر کہیں طے ہوتا، رہی مونس تو اس کی بڑی بہن کی انٹر کے فوراً بعد شادی ہو گئی تھی اور والدی چاہتی تھیں وہ بھی یہی کرے مگر اس کے اندر کچھ کر گزرنے کا جذبہ تھا، وہ شروع سے ہر وہ کام کرنے کی حامی تھی۔ جس سے کوئی روکتا، وہ کتنا دلیل دو اگر ماننے والی بات ہوئی تو انکار نہیں

لیکن مغرب و فصہ ہے تو میں نہیں مان سکتی سو مونس بھی یہی کرتی تھی مگر لڑکی تھی اس لیے کئی جگہ وہ جاتی نوکری کی بات اب ظفر نے کہی تھی۔ زین نے اس کو پورے فیصلہ کا حق دیا تھا، امی سمیت سب نے اسے اس معاملے میں مایوس کیا تھا اور آج وہ پہلے دن جا رہی تھی وہ گھر سے نکلی تھی پھر دفتر پہنچی تو جس شخص سے پہلی بار ملی، اس نے اس کو خوف زدہ کر دیا۔

"یہ باس ہیں۔" ایک ورکر نے بتایا اور وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

پہلی نظر ہی غصہ پرور تھی۔ اسے اپنا پہلا دن ہی آخری دن لگ رہا تھا جنید نے اس کی کافی ہمت بندھائی تھی، پھر وہ دوپہر کا وقت تھا جب وہ باس کے سامنے تھی۔

"آپ جاب کیوں کرنا چاہتی ہیں۔"

"میں دیکھنا چاہتی ہوں میں کچھ بدل سکتی ہوں یا حالات زیادہ طاقت ور ہوتے ہیں۔"

"آپ کو کیا لگتا ہے، کون درحقیقت طاقت ور ہے انسان یا حالات۔" مونس نے ایک نظر اسے دیکھا پھر آہستگی سے بولی۔

"میرا اللہ..... جس کے آگے انسان کی کوئی حیثیت نہیں رہے حالات تو وہ کبھی بھی کسی بھی رخ پر بدلے جا سکتے ہیں۔ اگر اللہ آپ کے ساتھ ہو اور بے شک اللہ ہے سر.....!"

معد سالک نے دلچسپی سے اسے دیکھا تھا۔ اس کے لہجے میں کوئی کمزوری نہیں تھی جتنا وہ کنفیوز نظر آ رہی تھی۔ اس نے اس کے مقابلے میں بہت مدلل جواب دیا تھا۔

"آپ کے لیے کیا زیادہ ضروری ہے؟ دولت یا تعلق عام لفظوں میں محبت۔"

"عام لفظوں میں کیوں سر! میرے لیے ہر بات سے ضروری بات ہے محبت۔ دولت دل نہیں خرید سکتی سر!"

"دل نہیں مگر پورا کا پورا انسان خرید سکتی ہے۔ دولت پھر یہ کون دیکھتا ہے دل پر حکمرانی ہے یا نہیں۔"

"دل کی حکمرانی دکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی سر! یہ خود بخود دکھائی دے جاتی ہے۔" اس کی دلچسپی اور بڑھ گئی تھی۔ پتا نہیں بے حسی میں کہیں سے درز پھوٹی تھی یا بے حسی نے بھگو کا دیا تھا۔ وانیہ کے بعد وہ ایک اور موسم میں ایک اور لڑکی کے سامنے بیٹھا محبت کو حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شہباز ملک نے اس کی آنکھوں کی چمک کو حسرت سے دیکھا تھا پھر ایک ماہ بعد وہ اس کے سامنے تھا۔

"تجھے مونس اچھی لگنے لگی ہے۔"

"ہاں۔ وہ مجھے اچھی لگنے لگی ہے۔" اس نے فائل دائیں طرف منتقل کی۔

وہ اسے اپنی طرف سے معنی دینے لگا تھا تب۔ معد سالک نے اسے تھام لیا تھا۔

"نو کمنٹ۔ اس بار کوئی بات نہیں۔ وہ اچھی ورکر ہے اور بس۔" اس نے بات شروع کرنے بھی نہیں دی اور ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ شہباز ملک کو کچھ جھٹکا لگا۔ یہ اس کی شروع کی عادت تھی جن باتوں پر وہ کوئی رائے نہیں رکھ پاتا تھا۔ اس پر خاموشی سادھ لیتا تھا لیکن آج اس نے شہباز ملک کو چپ کروا دیا تھا۔

حالانکہ حالات کیسے بھی ہوتے۔ وہ اس کی خاموشی کو ہمیشہ چبھنے والی چیز کہا کرتا تھا۔

"میری زندگی اک ان کہی چپ کا نام ہے تو بولتا ہے تو اس ان کہی کو معنی ملتے ہیں، الفاظ ورد شماری کرتے ہیں

تیرا لہجہ غم گسار بن جاتا ہے۔ میں دنیا اور محبت کی قیمت پر بھی تجھے کھونا نہیں چاہتا۔"

"مجھے لگتا ہے تو نے مجھے پالیا ہے۔" وہ ادا سے کہتا اور وہ ہنس پڑتا۔

"پتا نہیں تو سر تا پیر محبت اور محبت کو پا بھی لو تب بھی یقین نہیں آتا تھا۔" زندگی اس کے لیے بے رنگ تھی۔ دن تو گزر جاتا تھا مگر رات نہیں گزرتی تھی۔ وہ کبھی لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ جاتا کبھی بابا کو مس کال کرتا کبھی فون پر ماں کی آواز سنتا۔

وہ سانسوں کی تیزی سے پہچان جاتیں۔

"آجا سعد! کیوں ستاتا ہے ماں کو۔"

اور وہ گہرے گہرے لمبے سانس لیتا اور اب یہ سانسیں شکوہ بھری ہوگئی تھیں۔ مگر ماں کی شرمندگی کے باوجود اس نے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔

"دائمہ وہ پہلی بار ہنس پڑا۔" دل......" اور پتا نہیں اسے دل پر ہنسی کیوں آتی تھی شہباز ملک نے آدھی بند آدھی کھلی آنکھوں سے اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی دراڑیں دیکھیں مگر چپ کر کے لیٹا رہا کیونکہ وہ جانتا تھا اسے ان لمحے کوئی چھو لے تو وہ ایک بھربھری دیوار کی طرح گر جائے گا۔

"کوئی نئی بات......" وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"یہ جنید کا مونس سے کیا رشتہ ہے؟" بہت غیر متوقع سوال۔ شہباز ملک نے آہستگی سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

"وہی جو تیرا دائمہ سے تھا۔"

"تجھے کیا لگتا ہے، وہ ایک اور سعد سالک بنے گا؟" جانے وہ کن سیڑھیوں پر چڑھ کر کس اونچائی تک جانا چاہتا تھا۔ "مونس ایک اچھی لڑکی ہے۔"

"تو دائمہ بری لڑکی تھی؟" شہباز ملک نے اس کی بات کاٹ دی۔

"وہ عام لڑکی تھی اور میں اسے خاص سمجھا تھا۔"

"ہر عام لڑکی اگر اسے نظر خاص سے دیکھو تو وہ خاص ہو جاتی ہے۔"

"وہ جو زندگی کی تلخی پر بھی اپنے آپ کو، اپنی روح کو گروی نہ ہونے دے، جو دولت کو انسان کی جگہ نہ لینے دے، جو دل کو ہر بات سے ضروری سمجھے۔" اس نے اپنی سوچ واضح کی اور شہباز ملک نے کہا۔

"مگر لڑکیوں کی یہ قسم آج کل اسمبل ہونا بند ہوگئی ہے۔ ماؤں کا طرز فکر بدل گیا ہے۔"

وہ کچھ نہیں بولا تھا پھر دونوں دوپہر کے کھانے پر یکجا تھے، جب اس نے فائل اس کی طرف بڑھائی۔ "یہ آئیڈیا دیکھا ہے چاکلیٹ کا اشتہار ہے۔"

"چاکلیٹ کا اشتہار، یاد ہے تیرا پہلا اشتہار۔ یاد ہے کچھ۔" وہ ہنس پڑا۔

"ہاں میری جان! مجھے یاد ہے سچ پوچھ کسی ماں کی طرح تو نے میرا خیال رکھا ہے۔ میری چھوٹی سے چھوٹی، بڑی سے بڑی خوشی کا پورا ڈیٹا موجود ہے تیرے پاس۔"

"تو یہی تو ہے دوستی۔"

"ہاں اب بتا، کیا بتا رہا تھا......" اس نے فائل لی۔ عام ڈگر سے ہٹ کر آئیڈیا تھا۔ ایک نوکری کی تلاش سے تھک کر بیٹھا ہوا انسان اور اس کے دوست کی انٹری اس کے مایوس چہرے پر پھیلی مسکراہٹ۔

چاکلیٹ اور زندگی ساتھ ساتھ
زندگی کی تلخیوں کو میٹھا بنائے
اسی کو تو کہتے ہیں دوستی۔

شہباز ملک ہنس پڑا۔ "جانتی ہے دل اور محبت۔"

"ہاں......" وہ کچھ کہتے کہتے رہ گیا۔

"کچھ کہنا چاہتا ہے اس کے بارے میں۔"

"نہیں۔ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔" کوئی بات نوک زبان آتے آتے رک گئی تھی۔

"آج کچھ سنا شاداد!"

"یہ آج دوپہر کو موڈ ہو رہا ہے۔ کوئی خاص بات؟"

"کل گھر فون کیا تھا۔" اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"پھر......"

سمیر بھائی نے فون اٹھایا تھا اور پھر ایک دم سے انہوں نے دائمہ کو ریسیور پکڑا دیا۔

"سنو دائمہ! محبت کی گونگی زبان تم ہی سمجھ سکتی ہو۔" میں نے فون رکھ دیا تو پھر سے انہوں نے نمبر ڈائل کیا، کہنے لگے دائمہ سے بات نہیں کرو گے وہ تو تمہاری دوست تھی ناں بہت پیاری دوست۔

شہباز ملک اس اشتہار کو اب سمجھا تھا۔ وہ اس اشتہار کو سراہنے میں درحقیقت اپنے دل میں ہنس رہا تھا، اسی کو تو کہتے ہیں دوستی۔ اس نے خاص انداز میں کہا تھا...... خاص طنزیہ انداز۔ شہباز ملک نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"دوستی پر تجھے میں کیوں یاد نہیں آتا۔ دائمہ کیوں تلخی بن کر زبان میں روح میں پھیل جاتی ہے......"

"تو صرف دوست ہے کب؟ تو، تو میرا جذبہ ہے محبت کا جذبہ۔ دنیا سے، اپنے آپ سے اکتا جاتا ہوں تو مجھے تو یاد آتا ہے، تیری بات زندگی کی بات ہے۔ تو دوستی کی بات نہیں۔ زندگی کی بات ہے یار۔" اس نے اعصاب ڈھیلے ڈال دیے اور شہباز ملک نے اچانک کمرے میں داخل ہوتی مونس کو دیکھ کر کہا۔

"آج اگر میں کہوں کچھ شاعری سنائیے تو آپ کیا کہیں گی مس مونس۔"

"میں کہوں گی، میں یہاں ایک ورکر ہوں سر! آپ کی دوست نہیں۔"

"واہ......" شہباز ملک کو اس کے بھرم...... پسند آیا تھا۔

"غرور برا ہے مگر عورت میں غرور اچھا ہے۔ اس طرح وہ اپنے نفس پر کسی اور کو غالب نہیں آنے دیتی۔ اپنی حرمت کی حفاظت کرتی ہے۔" وہ فائل رکھ کر جا چکی تھی اور سعد سالک کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ تھی۔

پتا نہیں اسے یہ جواب پسند آیا تھا یا وہ اس جواب سے کوئی اور کہانی بنت کر رہا تھا۔ مگر یہ تھا اس نے شہباز ملک کو پھر سے شاعری سنانے کے لیے کہا تھا۔ پھر وہ کچھ یاد بھی نہیں کر پایا تھا کہ وہ خود سنانے لگا تھا۔

یہ تم سے کہہ دیا کس نے
کہ تم بن رہ نہیں سکتے
یہ دکھ ہم سہہ نہیں سکتے
چلو ہم مان لیتے ہیں کہ
تم بن ہم بہت روئے
کئی راتوں کو نہ سوئے
مگر افسوس ہے جاناں!
کہ اب کے تم جو لوٹو گے
ہمیں تبدیل پاؤ گے
بہت مایوس ہو گے تم
اگر تم پہچاننا چاہو
کہ ایسا کیوں کیا ہم نے
تو سن لو غور سے جاناں!
پرانی اک روایت تنگ آ کر توڑ دی ہم
محبت چھوڑ دی ہم نے

شہباز ملک نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا پھر کندھوں کی طرف سے آ کر تھوڑا سا گنگنا کر بولا تھا۔

کوئی چاند ستارہ ہے
کوئی پھول سے پیارا ہے
کوئی خوشی کا اشارا ہے
کوئی دل کا سہارا ہے
تمہیں اتنا بتانا ہے
وہ نام تمہارا ہے

”کیا سمجھے......“

”یہی کہ ساری دنیا جہاں چھوڑ جاتی ہے، وہاں بھی مجھے تیرے ساتھ ہونے کا گمان ٹھہرتا ہے۔“

”صرف گمان نہیں وہاں مجھے پاؤ گے تم۔“ لیکن سعد سالک کچھ بولا نہیں تھا پھر شہباز ملک نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ اس کا جھکاؤ بے طرح مونس کی طرف زیادہ ہو گیا تھا اور اس نے نوٹ کیا تھا جب وہ جنید کے ساتھ ہوتی، سعد سالک ایسے ہر لمحہ کو سبوتاژ کر دیتا تھا۔ محبت کے نغمے تو اپنی باتوں سے بکھرنے کی کوشش کرتا، یہاں تک کہ ایک دن شہباز ملک نے اسے کرسی پر بیٹھا دیا پھر، آہستگی سے بولا۔

”محبت انسان ایک بار کرتا ہے۔“

"ہاں مگر وہ محبت نہیں عشق ہوتا ہے، عشق ایک بار ہوتا ہے محبتیں کئی بار ہو سکتی ہیں۔"

"تم محبت کر رہے ہو یا؟" اس نے خالی جگہ چھوڑی اور اس نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میں صرف ایک موقع لینا چاہتا ہوں۔"

"کس چیز کا موقع؟"

"محبت کا یا دھوکے کا۔" شہباز ملک کا لہجہ اچھا نہیں تھا مگر اس نے اثر نہیں لیا تھا اور اسی نرم لہجے میں بولا تھا۔

"میں تو محبت سے محبت کرنا چاہتا ہوں، دیکھو محبت مجھے کیا دیتی ہے۔"

"سعد! تم جانتے ہو وہ جنید کو پسند کرتی ہے۔"

"ہاں تو کیا میں بھی دائمہ کو پسند کرتا تھا محبت نے اسے میرا رہنے دیا۔"

"تو تم جلن میں کسی دل کو بھی محبت کا نہیں رہنے دو گے۔"

"مجھے جانتا ہے ناں۔" اس نے ٹائی کھول لی۔

"اسی لیے حیران ہوں، تم جیسا نرم خو خارزاروں کی بات سننے کیوں نکل پڑا۔"

"بات کرنا کبھی کبھی اتنا مشکل ہوتا ہے کہ پھر سننا ہی اہم لگتا ہے۔ چاہے پھر کوئی بھی کچھ کہہ دے۔ تنہائی حد سے سوا ہو تو سوئی گرنے کی آواز بھی دلکش لگتی ہے۔"

"تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔"

"ہاں یہی بات مجھے حیران کرتی ہے..... کہ میں نے تم سے ہی بات کرنا سیکھا ہے اور آج تم ہی میری بات نہیں سمجھ پا رہے ہو۔" شہباز ملک کچھ کہے بغیر اٹھ گیا تھا، پھر وہ جنید کے ارد گرد رہنے لگا تھا۔

اس کی باتوں میں مونس کے علاوہ کسی کا تذکرہ نہیں تھا، اس لیے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا اگر یہ دل ٹوٹا تو کتنا بڑا نقصان ہوگا۔ جنید جیسے انسان اتنے زود رنج ہوتے ہیں، پھر زندگی میں ان کی زندگی نہیں نظر آتی اور موت نجات کا ایک آخری راستہ دکھائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ شہباز ملک ڈیڑھ ہفتے بعد اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"جنید بہت پیارا انسان ہے۔"

"دیکھ، مجھے جلن ہونے لگی ہے جنید سے۔ ہر وقت اس کی بات، اس کی یاد گھر سے اس کو فون یہ بہت زیادہ نہیں ہو گیا ہے۔" سعد سالک مسکرایا۔

"ہاں مجھے لگتا ہے جنید بہت اکیلا ہے۔" شہباز ملک نے کہا سعد سالک کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔

"کیا ہوا تجھے......" وہ یکدم قریب بیٹھ گیا۔ سعد سالک نے ہاتھ جھٹک دیے اس کے، وہ سگریٹ سلگانے لگا تھا۔

"کس چیز کی بے قراری ہے بچھڑنے کی یا......" سعد سالک نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میں اکیلا رہ سکتا ہوں۔ تم جنید سے یاری دوستی نبھاؤ۔"

"تو اچھا تو یہ بات چبھی ہے تجھے، یار! وہ تو بس ایک اچھے ورکر کی وجہ سے مجھ سے تعلق رکھتا ہے۔ میرا دوست تو صرف تو ہے۔"

"دوستی اور محبت میں توحید کا قائل ہوں، حالانکہ میں فراز نہیں۔" اس نے موبائل میسج پر بات کر کے اسے

ہنسانے کی کوشش کی، مگر اس کے ہونٹ بھینچے رہے پھر وہ شام کو کھانے کی تیاری کر رہا تھا جب فلیٹ کی بیل بجنے پر سعد سالک نے ریموٹ سے ٹی وی کی آواز کم کی اور دروازہ کھولنے گیا، مگر بعض دفعہ دروازہ، راستہ کسی ایسے موڑ پر ایسے چہرہ پر آ کر وا ہوتا ہے کہ پھر دوسری سمت نہیں دکھائی دیتا۔

"کون آیا ہے سعد؟" شہباز ملک نے پوچھا۔ جواب نہ آیا تو خود ہی اس کی پشت پر آ کر کھڑا ہو گیا، مگر الفاظ ساکت ہو گئے تھے۔

"یہ کیا تم دونوں تو مجھے ایسے دیکھ رہے ہو جیسے پہلے کبھی نہیں دیکھا، اب کیا مجھے اپنے بھائی کے گھر میں آنے کے لیے بھی اجازت کی ضرورت پڑے گی۔"

دائمہ ڈار پنک ساڑھی میں اونچا سا جوڑا بنائے ہوئے سجی سنوری اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"پنک رنگ تمہیں بہت پسند ہے ناں، اس لیے میں نے کہا۔ دائمہ پنک رنگ کی ساڑھی ہی پہننا تم۔ اچھی لگ رہی ہے ناں۔"

وہ آہستگی سے اپنے قدم اٹھانے لگا اور سمیر ویرانہ اندر گھستا چلا گیا۔ خوبصورتی اور زندگی کے عیش نے سمیر سالک کو جاذب نظر بنا دیا تھا۔ شہباز ملک نے سعد سالک کا ہاتھ تھام لیا تھا اور اس لمحے اس نے اس کا ہاتھ نہیں جھٹکا۔ کوئی رکا ہوا آنسو اس کی آنکھ میں چبھن بھر رہا تھا۔ "دائمہ چائے تو بناؤ۔"

"نہیں...... آپ مہمان ہیں، چائے میں بنا لاتا ہوں۔"

شہباز ملک نے اٹھنے کی کوشش کی اور سمیر سالک ہنس پڑا۔

"نہیں۔ تم رہنے دو۔ چائے تو دائمہ ہی بنائے گی، سعد کو دائمہ کے ہاتھ کی چائے بہت پسند ہے ناں اور پھر مہمان کہاں کے۔ یہ میرے اپنے بھائی کا گھر ہے اور دائمہ اور سعد تو بہت اچھے دوست ہیں ناں۔" دائمہ اٹھ گئی تھی اور شہباز ملک اسے چیزوں کی لوکیشن بتانے کے لیے اٹھ گیا تھا۔

"کیا ملتا ہے تمہیں یہ سب کر کے۔" سعد سالک نے نرمی سے تلخی بھرا سوال پوچھا اور وہ دل جلانے والی ہنسی ہنسنے لگا۔

"سکون! جب تمہاری آنکھوں میں دکھ سے جلن ہونے لگتی ہے۔ تم رونا چاہتے ہو، پھر بھی نہیں رو پاتے تو مجھے سکون ملتا ہے، پتا نہیں کیا بات ہے مجھے شروع سے تم سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ ہوتا ہے ناں، کبھی کبھی آپ نے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑا ہوتا، پھر بھی کچھ لوگ آپ کو اتنے برے لگتے ہیں کہ ان کا نام اور صورت دیکھتے ہی آپ کے اندر نفرت کا الاؤ دہکنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی آپ کا دل چاہتا ہے، آپ کسی کے لیے اپنی جان بھی پیش کر دیں اور کبھی کسی کی آنکھ میں آنسو دیکھنے کی حسرت سر مارتی ہے اور تم میرے لیے ایسے ہی انسان تھے، تمہیں پتا ہے میں نے دائمہ کو بتایا ہے۔ تم اس سے کتنی محبت کرتے ہو۔"

سعد سالک کو لگا اس کی زندگی آنکھ میں کھنچ آئی ہے۔ اس کا کیا جواب تھا؟ دل نے بڑا شور کیا یہ سوال پوچھے۔ مگر وہ چپ رہ گیا مگر سمیر سالک چپ رہنے کے لیے نہیں آیا تھا سو آہستگی سے بولا۔

"وہ رونے لگی۔ اسے افسوس تھا کہ یہ بات اس نے تم سے کہی نہ تم نے اس سے کہی، میرا بھیا! جھگڑا دائمہ کی

اسی حسرت سے ہوا، اس دن میں نے اسے بہت مارا تھا۔ وہ جتنا روئی تھی۔ مجھے اتنا ہی سکون ملتا تھا، کیونکہ مجھے پتا تھا جب یہ تمہیں پتا چلے گا۔ تم بھی اتنا ہی تڑپو گے۔" اس کا دل کرچی کرچی ہونے لگا تھا مگر اس نے ہنس کر کہا تھا۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ دائمہ کا اب میری زندگی میں کوئی عمل دخل نہیں۔ وہ تو میرے پرائمری اسٹیج کی محبت سمجھ لو۔ آج کل میرا زندگی گزارنے کا طریقہ ذرا مختلف ہے۔ میں بس وقت گزاری کو محبت کا نام دے دیتا ہوں، اب کسی کے نام پر دل میں دکھ نہیں بھرتا۔ دائمہ تو مجھے اب یاد بھی نہیں آتی۔ آج کل میں ایک نئے نام سے محبت کر رہا ہوں۔ مونس نام ہے اس کا۔" وہ خاص انداز میں مسکرا کر سگریٹ سلگانے لگا، مگر سمیر کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

شہباز چائے کی ٹرالی لیے ان کے قریب آ گیا تھا۔

"تم نے تو میرے بھائی کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے شہباز! اب یہ محبت کو وقت گزاری سمجھنے لگا ہے۔ پہلے تو دل کی بات اسے بہت سمجھ میں آتی تھی۔"

"ہاں شاید۔ جب کوئی دل کی بات سننے والا نہ ہو کوئی تو دل کی بات کرنا واجب بھی نہیں ہوتا۔"

شہباز کی جگہ سعد سالک نے ہی کہا، دائمہ نے چونک کر اسے دیکھا اور ایک تیز درد کا احساس اس کی آنکھ میں آن کر بیٹھ گیا اور یہ احساس دائمی ہو جاتا اس سے پہلے ہی اس نے البم سامنے لا رکھا۔

"یہ ہے مونس میری بیسٹ فرینڈ اور میری زندگی کی ہونے والی ساتھی۔ محبت کے نام پر میں اسے ہی کوڈ کرتا ہوں۔" دائمہ نور کا چہرہ بجھ گیا۔

شہباز ملک کی آنکھیں حیران ہو کر اس پر آن جمی تھیں۔ سمیر چلا گیا تھا، اور وہ اکیلا بیٹھا تھا۔ وہ تصویریں جنہیں وہ بہت شوق سے دیکھ رہا تھا اب اس نے بے توجہی سے ٹیبل پر پٹخ دی تھیں۔

"تم خود کو دھوکا دے رہے ہو۔"

"کوئی نئی بات نہیں ہے۔ سب نے اس دل کو دھوکا دیا ہے سو میں بھی اسے تھوڑا ستا رہا ہوں۔"

"تم اپنے ہی خلاف کیوں لڑنے پر تلے ہوئے ہو؟" شہباز اٹھ کر اس کے پاس آ گیا اور وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"کبھی کبھی دل چاہتا ہے، ساری دنیا کے ساتھ مل کر اپنے آپ ہی کو بہت ستاؤں اتنا کہ آنسو تک جم جائیں کبھی گم ہو جاؤں تو ایسے کہ کسی کو یاد نہ آؤں کبھی کبھی اپنی حمایت کرنے کو بھی دل نہیں کرتا ناں اور بس آج کل میرا بھی یہی موڈ ہے۔"

"مونس سے تیرا کیا رشتہ ہے؟" اس نے نیا سوال کیا اور وہ ہنس پڑا۔

"تلاش کر تجھے تو ہوئی ہے نا مجھے جاننے کا۔"

"ویسے تیری آسانی کے لیے بتا دوں، میرا مونس کا وہی رشتہ ہے جو محبت سے یقین کا ہے۔ دل سے دھڑکن کا ہے۔ دعا سے اثر کا ہے۔"

"تو واقعی مونس سے محبت کرتا ہے۔"

"ہاں وہ ہے اس قابل کہ اس سے محبت کی جائے وہ بہت خاص لڑکی ہے اور میں اسے خاص ہی بنانا چاہتا ہوں۔"

"مگر وہ کیتی آرادہ کیا ہے؟ کیا مقام رکھتی ہے تیری زندگی میں......؟"

''میں اور تیتی اچھے دوست ہیں۔''

''بس اچھے دوست؟ مگر تیری آنکھیں..... کیا وہ اتنا جھوٹ بولنے لگی ہیں، سچ بتا، کیا واقعی میرا سعد سالک بالکل بدل گیا ہے۔''

''شاید.....'' مبہم سا جواب دیا۔

اور پہلی بار شہباز مایوس ہوا اور وہ جب بھی ڈس ہارٹ ہوتا دائمہ نور کی قبر پہ چلا جاتا اور آج بھی وہ یہی سوچ کر آیا تھا مگر وہاں پہلے سعد سالک موجود تھا۔

''آج تک تیری عادت نہیں بدلی اور مجھے کہتا ہے شاید؟'' شہباز ملک نے اگربتیاں سلگا کر اسے پکارا اور وہ خاموش بیٹھا رہا۔

''دائمہ نور وہ لڑکی تھی جس نے مجھے اس لمحے سہارا دیا جب میں بے حسی اور خودکشی میں سے کسی ایک حالت کو اپنانے والا تھا تب اس نے مجھے بتایا کہ ایک تیسری راہ بھی ہے، بنا طمع کے کسی کو چاہے جاؤ پھر دکھ بھی دائمہ نور نے مجھے جینا سکھایا۔'' سعد سالک کی آنکھ کی کور بھی گیلی ہوگئی وہ اسی لمحے میں جا پہنچا تھا۔

جب بے حسی اور خودکشی دو راستے بن کر اس سے ٹکرائے تھے۔

اور کہیں سے دائمہ نور اس کی راہ میں ذات سہیلی کی طرح آن بیٹھی تھی۔

''تو پتا نہیں بدل رہا ہے ابھی یا بدل چکا ہے، مگر جب بھی تجھے چھوتا ہوں تیرا اندر چھونے سے بچے دل بالک کی طرح تیز تیز سانس بھرنے لگتا ہے۔''

لمحہ بھر کو رکا پھر بولا ''پھر بتا نا تو کیا نیا ڈھونڈنا چاہتا ہے۔''

''میں محبت کو امتحان گاہ میں لانا چاہتا ہوں، یہ ہمیشہ ہمارا امتحان لیتی ہے ناں۔ اب میں چاہتا ہوں یہ میرے سوالوں سے عاجز آ جائے۔''

''محبت عاجز آ جائے تو بھی خالی برتن ہو جاتا ہے تو نے خالی برتن میں سکے کی کھن کھن سنی ہے ناں۔''

''بازی جمائی ہے دیکھتے ہیں، کیا ملتا ہے۔''

وہ دونوں اٹھ کر قبرستان سے باہر آ گئے۔

نمیر سالک کا قیام جو مختصر تھا طویل ہونے لگا تھا۔ وہ ہر بار دائمہ سے بدسلوکی کرتا اور پھر مزے لے لے کر اس کے قصے سنتا اور وہ ایسے ہر وقت اس سے بھی زیادہ ترنگ میں مونس کی بات چھیڑ دیتا۔

شہباز ملک کبھی تو سہہ جاتا کبھی لڑ پڑتا۔ کیوں کسی کی محبت تاراج کرنا چاہتا ہے۔ لڑکیاں کمزور ہوتی ہیں کب تک تری عنایات کو اگنور کرے گی وہ..... تجھے ترس نہیں آتا جنید پر؟''

وہ شانے اچکا کر رہ جاتا پھر یہ دو ماہ کی بعد تھی۔ اس نے خاص تیاری کی تھی۔ شہباز ملک اسے تیز نظروں سے دیکھ رہا تھا مگر وہ اس کی طرف سے بے نیاز تیاری میں لگا رہا پھر یہ دس بجے کا وقت تھا جب اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ مونس نے ایک بڑا سا بکے اور گفٹ اس کے ٹیبل پر لا پٹخا تھا۔

''آپ سمجھتے کیا ہیں خود کو۔ آپ کی دولت مجھے پگھلا دے گی۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہو جوان

خوابوں پر مرتی ہیں، زمین سے قدم اٹھاتے ہی ہوا میں معلق ہو جاتی ہیں، مجھے محبت اٹریکٹ کرتی ہے اور وہ محبت کب کا میرا دل جیت چکا ہے، آپ خوبرو ہیں دولت مند ہیں، بااختیار ہیں، سو واٹ...... مجھے یہ باتیں اٹریکٹ نہیں کرتیں۔“

وہ جتنی تیزی سے آئی تھی اتنی ہی تیزی سے دروازہ بند کر کے چلی گئی تھی۔ شہباز ملک اس کے ردعمل سے خوفزدہ تھا مگر وہ ہنسے جا رہا تھا۔ بالکل دیوانوں کی طرح اور عین اسی وقت اس کا فون بجا تھا۔

”ہیلو سعد سالک......“

”نہیں پسند آئی میری کارکردگی۔ میں نے تمہاری مونس کو بھی تمہارا نہیں رہنے دیا۔“ وہ پھر سے ہنسنے لگا۔

”سمیر بھائی! آپ بھی ناں۔ پتا نہیں کن دنیاؤں میں رہتے ہیں۔ کیا آپ کو نہیں معلوم، کیا اب تک میں آپ کی نیچر کو نہیں جانتا۔ آپ بچپن سے جو کچھ میرے ساتھ کرتے آئے، اس نے ایک وقت تھا مجھے بے حسی اور خودکشی میں سے کسی ایک کو چن لینے کی منزل پر لا کھڑا کیا تھا۔ مجھے ان دنوں ساری دنیا سے شکایت تھی مجھے اللہ سے بھی شکایت تھی کہ وہ ہر بار ہی آپ کا ساتھ دیتا ہے، مگر پھر میری زندگی میں دائمہ نور آئی۔ محبت کا سمبل۔ میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں، بے حسی کی چادر سے سر نکالا اور پھر اس کی باتوں کو غور سے سنا۔ وہ کہتی تھی جب انسان کے پاس ہارنے کو کچھ نہ ہو تو وہ یا تو مایوس ہو جاتا ہے یا بے جھجک ہو کر آخری بازی لگاتا ہے۔

”کیا تم ہار مان سکتے ہو جب کہ اللہ ہے۔ وہ کہتی تھی، سب کچھ بدلا جا سکتا ہے۔ اگر اللہ ہے، اور بے شک اللہ ہے......“

تب میں نے زندگی کو سوچا اور آپ کی وجہ سے مجھ میں زندگی جینے کی جتنی خواہش مر گئی تھی اتنا ہی حوصلہ پیدا ہو گیا میں نے بندھے طریقوں پر نہیں، اپنے انداز پر جیا۔ آپ نے مجھے ناکام کرنا چاہا اور اس اللہ نے مجھے دوسری راہوں میں اتنا آگے کر دیا کہ اب پوری فیملی میں، میں نمایاں ہوں۔ سب سے زیادہ کامیاب۔ آپ سے بھی زیادہ۔ آپ نے ایک دائمہ نور کو چھینا تھا مگر قسمت نے محبت کو دونوں ہاتھ سے میرا کر دیا اگر وہ کسی اور نازک موڑ پر مجھے چھوڑ جاتی تو...... میں تو آدھی دھوپ اور آدھی شام میں آگے کا سفر کرنے کا سوچ بھی نہیں پاتا لیکن پوری دھوپ میں جل کر میری زندگی کی شام بہت گلابی ہے میری زندگی میں گیتی آرا جیسی پیاری لڑکی ہے۔ شہباز ملک ہے، دائمہ نور کی یاد ہے۔ آپ کامیاب ہیں مگر کیا کبھی آپ بغیر نیند کی گولی کے سوئے؟ نہیں سوئے ہوں گے مگر میں آج بھی اپنی نیند سوتا ہوں۔ اپنی نیند جاگتا ہوں رہا مونس کا معاملہ تو وہ تو صرف میرا ایک تجربہ تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ واقعی اس فانی دنیا میں محبت کے لیے کوئی جی جان سے لڑ سکتا ہے۔ اس کے لیے تاج و تخت ٹھکرا سکتا ہے یا نہیں اور محبت نے مجھے دکھا دیا کہ جن دلوں کو واقعی محبت چھو لے، وہ واقعی تاج و تخت کو ٹھکرا سکتے ہیں، رہا تو آپ ہیں سمیر بھائی! آپ کی لندن نژاد بیوی آپ کو ایک پل بھی سکون سے نہیں رہنے دیتی اور دائمہ کے دل میں مجھے جلانے تڑپانے کے لیے آپ نے خود محبت کا بیج بویا ہے۔ آپ کو محبت نے ٹھوکر لگائی ہے سمیر بھائی! بہت زور سے ٹھکرایا ہے، وہ دل ہیں آپ کے پاس اور آپ کسی ایک دل میں بھی نہیں ہیں۔

مجھے آپ سے ہمدردی نہیں ہے۔ مگر دائمہ سے ہے۔ اللہ اسے صبر کا اجر دے گا مگر آپ نے سوچا ہے۔ عمر بھر کی کمائی کے بعد آپ کو کیا ملے گا کون ہے جو آپ کو گرتے ہوئے سنبھالے گا۔ آپ نے خود غرضی اور حسد میں ہر دل کو

میرے خلاف کیا اور اب سب دل میرے لیے دھڑکتے ہیں۔ آپ ناکام ہو گئے ہیں بھائی اور میں ناکام دکھائی دیتا ہوں مگر بہت کامیاب ہوں۔"

وہ فون رکھ چکا تھا۔ سمیر دوسری طرف خاموش تھا اور شہباز ملک تھا، اس کی آنکھیں بول رہی تھیں۔

"میں نے کل اسے پرپوز کیا تھا۔ دولت کا رنگ دکھایا تھا مگر وہ خاص لڑکی...... تم نے دیکھا اس کے کردار کے جمال کو، ایسے خوبصورت لوگ ہی تو محبت کی مان بڑھاتے ہیں، شاہ! تم کہتے تھے ناں تم کیا کرنا چاہتے ہو...... تو میں بس یہ موقع لینا چاہتا تھا، میں چاہتا تھا کوئی میری طرح محبت ہی سے محبت کو چاہے، تا کہ میرے دل کو قرار آئے کہ محبت میں سرپھرے ہر دور میں ہوتے ہیں۔

"کیتی آرا ہو...... محبت کے لیے ہر دور میں کچھ لوگ ہوتے ہیں، تب ہی تو محبت اب بھی ازکٹ فل ہے۔"

بہت دھیرے سے چلتی ہوئی کیتی آرا ساتھ آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ جنید اور مونس بھی تھے وہ مونس کا دل صاف کر چکی تھی۔ مونس کی ہنسی میں شرمندگی تھی اور اس نے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر محبت کو بہت دیر تک ساتھ ساتھ جینے کی دعا دی تھی، پھر تینوں مل کر یہ خوشی سیلیبریٹ کرنے ساحل سمندر پر آ گئے تھے، وہ دونوں مستقبل کے پلان بنا رہے تھے اور شہباز ملک سمندر کی لہروں سے کھیلتا آگے بڑھ گیا تھا، اس کے قدموں کے نشان بن رہے تھے مٹ رہے تھے۔ لہریں پاؤں بھگو رہی تھیں جب اس کے موبائل پر بیپ ہوئی تھی اس نے مسیج پڑھنا شروع کیا۔

جلتے دیے کے سامنے
جھونکا ہوا کا دیکھ کر
تم کیوں اداس ہو گئے
موسم خزاں کا دیکھ کر
تم دکھوں کے سوز کا
موسموں کے روگ کا
درد مت سہا کرو
اداس مت ہوا کرو
یہ درد ہیں حیات کے
کچھ رنگ کائنات کے
کچھ دکھوں کی تیز بارشیں
کچھ پھول ہیں نشاط کے
تم پھول بس چھوا کرو
اداس مت ہوا کرو

شہباز ملک نے مڑ کر دیکھا اور وہ الٹے قدموں چلتا ہوا لہروں سے کھیلتا ہوا اس تک آ گیا

"یہ نظم کیتی کی طرف سے ہے۔"

''اچھا جو تجھے نہ جانتا ہو، اسے بتانا۔'' اس نے مسکرا کے دیکھا تو سعد سالک نے اسے کندھے سے تھام لیا۔

''ہم دونوں سوچ رہے تھے، تیرے لیے کیسی لڑکی ڈھونڈیں۔ بہت محبت والی یا بہت زیادہ محبت والی۔''

''محبت......'' اس کی آنکھوں میں وائمہ نور عکس بن کر جھلملانے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس یاد میں کھو جاتا۔ سعد سالک نے اسے تھام لیا۔

''بس طے ہو گیا۔ شہباز کے لیے ہم محبت کو سمجھنے والی لڑکی ڈھونڈیں گے چل آج خوب مزے کریں گے۔ آج تیرے اسپائسی زنگر بھی کھائیں گے ہم دونوں۔'' شہباز ملک ہنسنے لگا مگر یہ ہنسی پھیکی تھی۔

''تجھے لگتا ہے میں وائمہ کو بھول سکتا ہوں؟''

''نہیں مگر محبت اپنی جگہ خود بناتی ہے جو آئے گی۔ وہ تجھے خود دریافت کرے گی اور پانے والے، ڈھونڈنے والے اپنی منزل کے پہلے قدم کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں اور تو بھولنے والی روح ہے بھی کہاں میری جان!'' اس نے امید و بیم میں دیکھا اور عینی آرا گنگنانے لگی۔

یہ درد ہیں حیات کے
کچھ رنگ کائنات کے
کچھ دکھوں کی تیز بارشیں
کچھ پھول ہیں نشاط کے
تم پھول بس چھوا کرو
اداس مت ہوا کرو

''تجھے پتا ہے بارشوں کے بعد آسمان کتنا خوبصورت اور نکھر جاتا ہے۔'' سعد سالک نے پوچھا اور شہباز ملک زندگی کو مسکرا کر جواب دینے بیٹھ گیا اور زندگی ہنستی مسکراتی ان تینوں کے بیچ ساتھی بن کر بیٹھ گئی۔ دکھوں کے بادل چھٹ گئے تھے اور محبت کی شفق چہروں اور زندگی کے چہرے پر گلال بن کر بکھرے جا رہی تھی اور محبت کی یہی خوبی ہے کبھی خسارہ نہیں دیتی جہاں خسارہ لگے وہاں بھی کچھ نہ کچھ یہ دے ہی جاتی ہے بس بات نظر کی ہے۔

* * *